بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قرآن فہمی کے قرآنی قوانین

(جنہیں پیش نظر رکھ کر آپ خود تفسیر قرآن کر سکتے ہیں)

مرتبہ۔ خواجہ ازہر عباس

مثال

سن اشاعت ۲۰۰۳ء

محمد سلیم اختر نے

زاہد بشیر پرنٹنگ پریس لاہور سے

چھپوا کر مثال پبلشنگ ۲۲-اے حبیب بینک بلڈنگ

چوک اردو بازار لاہور سے شائع کی

قیمت: ۱۲۰ روپے

ڈسٹری بیوٹر: **دوست ایسوسی ایٹس**

الکریم مارکیٹ اردو بازار لاہور فون: ۷۱۲۲۹۸۱

فہرست مشمولات

پیش رس (خواجہ ازہر عباس) ۵
پیش لفظ ۱۰
قرآن حق ہے ۱۰
حق کی تعریف ۱۰
تفاسیر کے ڈھیر ۱۱
تفسیر کے طالب علم کی زندگی ختم ہو جائے گی تفسیریں ختم نہیں ہوں گی ۱۲
تفسیری اختلافات ۱۲
قرآن کریم کی تفسیر اور خود قرآن کریم کے ساتھ؟ ۱۳
تفقہ فی القرآن کا قرآنی طریقہ ۱۵
رسول اکرمؐ کا طرز تدریس اور طریقہ تفقہ فی القرآن بھی تصریف آیات ہی تھا ۱۵
آنحضورؐ کا فریضہ تبیین قرآن ۱۶
قرآن کریم کے ساتھ کوئی غیر اللہ کتاب ہرگز ہرگز واجب الاتباع نہیں ۱۸
قرآن فہمی کے قرآنی اصول وقواعد کی اتباع لازم ہے ۱۹
حقیقت حال ۲۱
کیا حضرت عمرؓ قرآن کی تفسیر رسول مقبول سے بہتر جانتے تھے؟ ۲۱

قرآن فہمی کے قرآنی اصول ۲۵

۱۔ قرآن کی زبان عربی مبین ہے ۲۵
قرآن کریم زمانہ جہالت کے لٹریچر کا محتاج نہیں ۲۶
قرآن کریم کے سات قرأتوں میں نازل ہونے کا تصور قابل قبول نہیں ۲۶
۲۔ قرآنی الفاظ کی حاکمیت ہمیشہ قائم رکھی جائے گی ۲۸
۳۔ قرآن کریم اہل عرب کی روزمرہ کی بول چال کے عین مطابق ہے ۲۹

۴۔الفاظ کا استعمال باندازِ مجاز ۲۹
۵۔تشبیہات' حرف تشبیہ مذکور اور محذوف کے ساتھ ۳۰
۶۔استعارات کا استعمال ۳۱
۷۔قرآن حکیم اللہ کا قول اور کائنات اس کا فعل۔ہے اللہ کے قول وفعل میں تضاد
وتخالف ہرگز نہیں ۳۲
۸۔قرآن ایک مفصل کتاب ہے' مجمل نہیں ۳۳
۹۔قرآن کریم خود مبین ہے ۳۴
۱۰۔قرآن کریم کافی ہے ۴۰
۱۱۔قرآن کریم کا مفسر خود اللہ تعالیٰ ہے ۴۰
۱۲۔قرآن کریم میں تضاد وتخالف ہرگز نہیں ہے ۴۰
۱۳۔قرآن کریم میں آیات محکمات بھی ہیں اور متشابہات بھی۔لیکن اصل کتاب محکمات ہیں ۴۱
۱/۱۳۔ ہدایت وگمراہی انسان خود اختیار کرتا ہے' یا اللہ ہی ہدایت دیتا اور وہی گمراہ کرتا ہے؟ ۴۲
۲/۱۳۔آیات محکمات ومتشابہات کا تقابل ۴۴
۳/۱۳۔متشابہات کی ایک اہم مثال ۴۵
۴/۱۳۔محکمات ومتشابہات کی تعریف ۴۶
۵/۱۳۔الفاظ کے حقیقی اور مجازی معنوں کی پہچان کا واحد ذریعہ مشاہدات عالم ہیں ۴۸
۶/۱۳۔نگاہ بازگشت۔آیات محکمات ومتشابہات ایک نظر میں ۵۰
۷/۱۳۔خدا تعالیٰ نے متشابہات نازل ہی کیوں فرمائی ہیں؟ ۵۱
۸/۱۳۔متشابہات کو محکمات کر دیا گیا ہے۔ ۵۱
۹/۱۳۔سارا قرآن کریم باہم ملتا جلتا یعنی متشابہ ہے ۵۲
۱۰/۱۳۔''متشابہا''،''مثانی'' کی تعریف ''سبعا من المثانی'' کے الفاظ میں ۵۳
۱۴۔پورا قرآن کریم سات دہرائے ہوئے عنوانات ہیں ۵۴
۱/۱۴۔قرآن کریم کا سات نکاتی منشور ۵۴

۱۴/۲۔تحفظ ناموس رسالت ۵۶
۱۴/۳۔خدا تعالیٰ نے جن چیزوں کے وصل کا حکم دیا ہے ان میں فصل کرنا موجب فساد ہے۔ ۵۹
۱۴/۴۔تصویر کا دوسرا رخ ۵۹
۱۵۔قرآن کریم کی نہ تو کوئی آیت ہی منسوخ ہے نہ ہی کسی آیت کا کوئی حصہ ۶۰
۱۶۔قرآن کریم کی حفاظت خود خدا تعالیٰ کے ذمہ ہے ۶۱
۱۷۔اللہ تعالیٰ کی سنت یعنی اس کے کائناتی قوانین ہرگز نہیں بدلتے۔ ۶۲
۱۸۔ قرآن کریم ایک باربط کتاب ہے۔ بے ربط و پراگندہ ہرگز نہیں ۶۳
۱۹۔قرآنی محذوفات۔ ۶۴
۲۰۔ ذومعنی الفاظ کا مفہوم ان کے متعدد معنوں میں سے وہ لیا جائے گا جو ربط کلام اور عربی لغت و قواعد کے مطابق بھی ہو نیز کسی قرآنی اصول کے خلاف بھی نہ جاتا ہو ۶۵
۲۱۔کلام مقصود اور غیر مقصود میں تمیز کرنا۔ کلام غیر مقصود بطور رخال تام آتا ہے ۶۸
۲۲۔انقسام مفہوم مطابق قرآنی کلیہ جات و عالمی مشاہدات ۶۹
۲۲/۱۔تحفظ ناموس رسالت ۶۹
۲۳۔تشریح الفاظ و آیات بذریعہ تقابل ضدین ۷۱
۲۴۔ جملہ ہائے اعتراضات ۷۲
۲۵۔قرآن کریم اپنی لغت آپ پیش کرتا ہے ۷۳
۲۵/۱۔صبر ۷۵
۲۵/۲۔شکر ۷۵
۲۵/۳۔توکل ۷۶
۲۵/۴۔دین ۷۶
۲۵/۵۔سحر ۷۷
۲۵/۶۔اذن ۷۸
۲۵/۷۔الامر ۷۹

۸/۲۵۔قرآن کریم میں بعض جگہ لفظ اللہ سے مراد اللہ کا قانون ہے ۷۹
۲۶۔اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول ۸۳
۱/۲۶۔حکم صرف اللہ تعالیٰ کا ہے ۸۳
۲/۲۶۔اللہ کے رسول اپنی نہیں بلکہ خالص اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرواتے تھے ۸۳
۳/۲۶۔اصل مطاع اللہ تعالیٰ ہے ۸۴
۴/۲۶۔اکلوتی اطاعت ۸۶
۵/۲۶۔مرکزی اتھارٹی ۸۶
۶/۲۶۔اولی الامر منکم کون ہیں ۸۷

۲۷۔ناسخ ومنسوخ ۹۱

۱/۲۷۔قرآن کریم کے جملہ احکام وقت کے تقاضوں کا ساتھ دیتے ہیں ۹۱
۲/۲۷۔تنسیخ آیات کے متعلق قرآن کریم کا اپنا فیصلہ ۹۳

۲۸۔شان نزول ۹۷

۱/۲۸۔قرآن کریم عالمگیر ضابطہ حیات ہے ۹۷
۲/۲۸۔شان نزولوں کے باہمی اختلافات ۹۷
۳/۲۸۔حاشیہ تفسیر ثنائی ۹۸
۴/۲۸۔حضرت ماریہؓ کا روایتی قصہ ۹۹
۵/۲۸۔شہد کا روایتی قصہ ۱۰۰
۶/۲۸۔آیہ تحریم کا صحیح مفہوم ۱۰۱
۷/۲۸۔شان نزول کا نظریہ خود شان باری کے بھی خلاف ہے ۱۰۲

۲۹۔حروف مقطعات ۱۰۵

۱/۲۹۔کیا حروف مقطعات کا مفہوم معاذ اللہ رسول اکرم بھی نہیں جانتے تھے؟ ۱۰۵
۲/۲۹۔حروف مقطعات کیا ہیں؟ ۱۰۵

۲۹/۳۔روایات اور قرآنی تصور کا الگ الگ خاکہ ۱۰۶
۲۹/۴۔س کا مفہوم ۱۰۷
۲۹/۵۔حروف مقطعات کا قاعدہ کلیہ ۱۰۷
۳۰۔حروف مقطعات کے الگ الگ مفاہیم ۱۱۱
۳۰/۱۔الم کا مفہوم ۱۱۲
ا۔الف سے امین مراد ہے ۱۱۲
ب۔لام سے لین القلب ۱۱۳
ج۔ میم سے مرسل مراد ہے ۱۱۳
د۔ اور میم ثانی سے مراد ہے محمد (حمد در حمد کیا ہوا) ۱۱۴
۳۰/۲۔المص کا مفہوم ۱۱۴
۳۰/۳۔الر کا مفہوم ۱۱۵
۳۰/۴۔المر کا مفہوم ۱۱۶
۳۰/۵۔ یس کا مفہوم ۱۱۶
۳۰/۶۔ ص کا مفہوم ۱۱۶
۳۰/۷۔ ق کا مفہوم ۱۱۶
۳۰/۸۔ ن کا مفہوم ۱۱۶
۳۰/۹۔ طه کا مفہوم ۱۱۶
۳۰/۱۰۔ طس کا مفہوم ۱۱۷
۳۰/۱۱۔ طسم کا مفہوم ۱۱۷
۳۰/۱۲۔ حم کا مفہوم ۱۱۷
۳۰/۱۳۔حم عسق کا مفہوم ۱۱۸
۳۰/۱۴۔ کھیعص کا مفہوم ۱۱۸
۳۱۔حروف کی بحث ۱۱۹

۱/۳۱۔ واؤ کے مختلف استعمالات۔ الفاظ کا عطف الفاظ پر، جملے کا عطف جملے پر ہوتا ہے	۱۱۹
۱۔ واؤ بمعنی اور۔ خبر کا عطف خبر پر، امر کا عطف امر پر، اور مثال کا عطف مثال پر ہوتا ہے	۱۲۰
۲۔ واؤ بمعنی لیکن	۱۲۱
۳۔ واؤ بمعنی کیونکہ	۱۲۱
۴۔ واؤ برائے اظہار حقیقت	۱۲۱
۵۔ واؤ بمعنی بلکہ	۱۲۱
۶۔ واؤ بمعنی جبکہ	۱۲۱
۷۔ واؤ تفسیر، بمعنی یعنی	۱۲۲
۸۔ واؤ بمعنی اس لیے	۱۲۲
۹۔ واؤ بمعنی حالانکہ	۱۲۲
۱۰۔ واؤ برائے فا، بمعنی تو، پھر، پس	۱۲۲
۱۱۔ واؤ برائے اظہار صفت	۱۲۳
۱۲۔ واؤ بمعنی بذریعہ	۱۲۳
۱۳۔ واؤ برائے او بمعنی یا	۱۲۳
۱۴۔ واؤ استیناف	۱۲۴
۱۵۔ واؤ برائے معیت	۱۲۴
۱۶۔ واؤ برائے قسم	۱۲۵
۲/۳۱۔ او کے مختلف استعمالات	۱۲۶
مثال کا عطف مثال ہی پر ہوتا ہے	۱۲۶
۱۔ او بمعنی یا	۱۲۹
۲۔ او بمعنی بلکہ	۱۲۹
۳۔ او بمعنی حتیٰ کہ	۱۲۹
۴۔ او برائے انقسام مفہوم	۱۳۰

۵۔ او برائے نفی تام ۱۳۰
۶۔ او برائے شک واشتباہ ۱۳۰
۷۔ او بمعنی واوِ تفسیر ۱۳۰

۳/ ۱۳۱۔ ب کے مختلف استعمالات ۱۳۱

۱۔ با برائے تعدیہ۔ لازم کو متعدی بنانے کے لیے ۱۳۱
۲۔ با اظہار سبب کے لیے ۱۳۱
۳۔ با بمعنی "کے ساتھ" ۱۳۱
۴۔ با بمعنی "کے پاس" ۱۳۱
۵۔ با بمعنی "کے عوض" ۱۳۱
۶۔ با بمعنی "کے متعلق" ۱۳۱
۷۔ با بمعنی سے ۱۳۱
۸۔ با بمعنی "کے وقت" ۱۳۱
۹۔ با بمعنی "کے مقام پر" ۱۳۱
۱۰۔ با بمعنی پر، اوپر ۱۳۱
۱۱۔ با بمعنی کا ۱۳۱
۱۲۔ با بمعنی کو ۱۳۲
۱۳۔ با بمعنی "کے بارے میں" ۱۳۲
۱۴۔ با بمعنی "کے ذریعہ" ۱۳۲
۱۵۔ با زائدہ ۱۳۲
۱۶۔ با برائے قسم ۱۳۲

۴/ ۱۳۱۔ ف کے مختلف استعمالات ۱۳۲

۱۔ فا بمعنی پھر ۱۳۲

۲۔ فا برائے توضیح بمعنی سو ۱۳۲
۳۔ فا بمعنی تو ۱۳۳
۴۔ فا بمعنی ورنہ ۱۳۳
۵۔ فا بمعنی اس طرح ۱۳۳
۶۔ فا بمعنی لیکن ۱۳۳
۷۔ فا برائے اظہار حقیقت ۱۳۳
۸۔ فا زائدہ ۱۳۴

۳۱/۵۔ س کے استعمالات ۱۳۴

۱۔ س برائے مستقبل قریب ۱۳۴
۲۔ س برائے تاکید ۱۳۴
۳۱/۶۔ فی کے مختلف استعمالات ۱۳۵
۱۔ فی بمعنی میں ۱۳۵
۲۔ فی برائے اظہار سبب ۱۳۵
۳۔ فی بمعنی کے مقابلہ پر ۱۳۶
۴۔ فی بمعنی کے لیے ۱۳۶
۵۔ فی بمعنی کے ذریعہ ۱۳۶

۳۱/۷۔ من کے مختلف استعمالات ۱۳۶

۱۔ من ابتدائیہ بمعنی سے ۱۳۶
۲۔ من بیانیہ برائے استغراق ۱۳۶
۳۔ من بعضیہ ۱۳۶
۴۔ من بمعنی "کی طرف سے" ۱۳۶
۵۔ من بمعنی "کی وجہ سے" ۱۳۶

۶۔ من بمعنی "کی بجائے" ۱۳۶
۷۔ من بمعنی میں سے ۱۳۶
۸۔ من بمعنی "کے ساتھ" ۱۳۶
۹۔ من بمعنی "کے مقابلہ پر" ۱۳۶
۱۰۔ من بمعنی "کے ہاں" ۱۳۶
۱۱۔ من بمعنی "کے" ۱۳۶
۱۲۔ من برائے تمیز ۱۳۶
۱۳۔ من بمعنی "کے بدلے" ۱۳۶
۱۴۔ من بمعنی "کوئی بھی" ۱۳۶
۱۵۔ من زائدہ اور مما بمعنی اس لیے کہ ۱۳۸

۳۱/۸۔ عن کے مختلف استعمالات ۱۳۸

۱۔عن بمعنی سے ۱۳۸
۲۔عن بمعنی پر ۱۳۸
۳۔عن بمعنی کا۔کے۔کی ۱۳۸
۴۔عن برائے الٹے معنی ۱۳۸
۵۔عن بمعنی "کے بعد" ۱۳۸
۶۔عن بمعنی "میں آ کر" ۱۳۸
۷۔عن بمعنی "کے مطابق" ۱۳۸

۳۱/۹۔ علی کے مختلف استعمالات ۱۳۹

۱۔علی بمعنی پر ۱۳۹
۲۔علی بمعنی سے ۱۳۹
۳۔علی بمعنی میں ۱۳۹

۴۔علیٰ بمعنی "کے مطابق" ۱۳۹
۵۔علیٰ بمعنی "کے باوجود" ۱۳۹
۶۔علیٰ بمعنی "کے متعلق" ۱۳۹
۷۔علیٰ بمعنی تک ۱۳۹
۸۔علیٰ بمعنی "کے سامنے" ۱۳۹
۹۔علیٰ بمعنی "کے ذریعہ" ۱۴۰
۱۰۔علیٰ بمعنی فرض ہے ۱۴۰
۱۱۔علیٰ بمعنی "کے پاس" ۱۴۰
۱۲۔علیٰ بمعنی "کے مقابلہ پر" ۱۴۰

۱۰/ ۳۱۔ الیٰ کے مختلف استعمالات ۱۴۰

۱۔الیٰ بمعنی تک (برائے زمان ومکان) ۱۴۰
۲۔الیٰ بمعنی سمیت ۱۴۰
۳۔الیٰ بمعنی کے ساتھ ۱۴۰
۴۔الیٰ بمعنی کو ۱۴۰
۵۔الیٰ بمعنی میں ۱۴۰
۶۔الیٰ زائدہ ۱۴۰
۷۔الیٰ بمعنی "کے نزدیک" ۱۴۰
۸۔الیٰ بمعنی "کے متعلق" ۱۴۱
۹۔الیٰ بمعنی "کے لیے" ۱۴۱
۱۰۔الیٰ بمعنی "کی طرف" ۱۴۱

۱۱/ ۳۱۔ کلا کے مختلف استعمالات ۱۴۱

۱۔کلا بمعنی بات یوں نہیں ۱۴۱

۲۔کلا بمعنی ہرگز نہیں ۱۴۱
۳۔کلا بمعنی وہ ایسا ہرگز نہ کر سکیں گے ۱۴۱
۴۔کلا بمعنی حقیقت یہ ہے ۱۴۱
۵۔کلا بمعنی ضرور ضرور ۱۴۲

۱۲/۳۱۔ بل کے مختلف استعمالات ۱۴۲

۱۔بل برائے تردیدہ انکار کلام ماسبق ۱۴۲
۲۔برائے تائید وتوثیق کلام ماسبق ۱۴۲
۳۔بل برائے وضاحت واضافہ ۱۴۳
۴۔بل برائے تائید کلام مابعد بلا تردید کلام ماسبق ۱۴۳
۱۳/۳۱۔ من دون کے استعمالات ۱۴۳

۱۴/۳۱۔ الا کے مختلف استعمالات ۱۴۴

۱۔الا بمعنی سوائے ۱۴۴
۲۔الا بمعنی ہاں البتہ ۱۴۴
۳۔الا عاطفہ بمعنی اور ۱۴۴
۴۔الا برائے استغراق ۱۴۴
۵۔الا بمعنی ان لا اگر نہیں ۱۴۴
۶۔الا برائے تاکید وتائید ۱۴۴

۱۵/۳۱۔ ان کے مختلف استعمالات ۱۴۵

۱۶/۳۱۔ انی کے مختلف استعمالات ۱۴۶

۱۔انی بمعنی کس طرح ۱۴۶
۲۔انی بمعنی کہاں سے ۱۴۶

۳۔انی بمعنی کدھر سے	۱۴۶
۴۔انی بمعنی جب	۱۴۶
۱۷/۳۱۔ استفہام اقراری وانکاری	۱۴۶
۱۸/۳۱۔ ان کے مختلف استعمالات	**۱۴۷**
۱۔ان شرطیہ	۱۴۷
۲۔ان نافیہ باوروالا	۱۴۷
۳۔ان نافیہ بلاوروالا	۱۴۷
۴۔ان تاکیدیہ بمعنی بے شک صلہ لام کے ساتھ	۱۴۷
۵۔ان تاکیدیہ بلا صلہ لام	۱۴۷
۱۹/۳۱۔ ام کے مختلف استعمالات	**۱۴۸**
۱۔ام بمعنی یا	۱۴۸
۲۔ام بمعنی نیز	۱۴۸
۳۔ام زائدہ	۱۴۸
۲۰/۳۱۔ اما کے مختلف استعمالات	**۱۴۸**
۱۔ اما بمعنی جو جس	۱۴۸
۲۔ اما بمعنی یا	۱۴۸
۲۱/۳۱۔ اما کے استعمالات	**۱۴۸**
۱۔اما بمعنی یا	۱۴۹
۲۔اما بمعنی خواہ	۱۴۹
۳۔اما بمعنی اگر	۱۴۹
۲۲/۳۱۔ بعد کے استعمالات	**۱۴۹**

۱۔ بعد بمعنی کے بعد ۱۴۹
۲۔ بعد بمعنی سوا ۱۴۹
۳۔ بعد بمعنی اس کے باوجود ۱۴۹

۳۱/۲۳۔ ذالک کے قرآنی استعمالات ۱۵۰

۳۲۔ قواعد کی بحث ۱۵۱

۳۲/۱۔ افعال ثلاثی مجرد کا خاصہ وجدان ۱۵۱
۳۲/۲۔ گیارہ صورتوں میں فعل ماضی مضارع کے معنوں میں آتا ہے ۱۵۵
۱۔ عطف ماضی بر مضارع ۱۵۵
۲۔ ابتداء کلام میں ۱۵۵
۳۔ اسم موصول کے بعد آئے ۱۵۵
۴۔ ندا کے بعد آئے ۱۵۵
۵۔ لفظ حیث کے بعد آئے ۱۵۶
۶۔ لفظ کلما کے بعد آئے ۱۵۶
۷ تا ۱۰۔ شرط جزا اور ہر دو پر عطف ۱۵۶
۱۱۔ جملہ دعائیہ ۱۵۶
۳۲/۳۔ فعل مضارع ماضی کے معنوں میں ۱۵۶
۳۲/۴۔ خدا تعالیٰ قید زماں و مکاں سے منزہ ہے ۱۵۷
۳۲/۵۔ کلمات حصر ۱۵۸
۱۔ حصر بذریعہ نفی اثبات ۱۵۸
۲۔ حصر بذریعہ انما و انما ۱۵۸
۳۔ حصر بذریعہ ضمیر مقدم ۱۵۸
۴۔ حصر بذریعہ جار مجرور مقدم ۱۵۹

۳۲/۶۔ تنوین عہدی ذکری، تنوین عوض مضاف اور عوض مضاف الیہ 159
۳۲/۷۔ بسم اللہ شریف بھی قرآن کی آیت ہے 160
بسم اللہ شریف بظاہر جملہ ناقص ہے تام نہیں 160

۳۳۔ جمع القرآن 162

۳۳/۱۔ جمع القرآن تفاسیر کے آئینے میں 163
۳۳/۲۔ قراءت کے اختلافات، تفاسیر کی رو سے 163
۳۳/۳۔ اعراب کا اختلاف 163
۳۳/۴۔ قرآن کریم، زمانہ رسالت میں باریک جھلی کے کاغذوں پر کتابی صورت میں سطروار لکھا گیا تھا 164
۳۳/۵۔ قرآن کریم کو آنحضور سلام علیہ نے اپنے دست مبارک سے لکھا تھا 164
۳۳/۶۔ قرآن کریم کا نسخہ امام 165
۳۳/۷۔ قرآن کریم کے متعدد نسخے، نسخہ امام سے صبح شام نقل ہوا کرتے تھے 165
۳۳/۸۔ آنحضور سلام علیہ خود بھی حافظ قرآن تھے اور آپ نے متعدد مزید حافظ بنائے بھی تھے 167
۳۳/۹۔ ترتیب قرآن کریم 167
۳۳/۱۰۔ حفظ و ترتیب کا چولی دامن کا ساتھ ہے 167
۳۳/۱۱۔ قرآن کریم کی ابتداء کہاں سے ہوئی؟ 169
۳۳/۱۲۔ قرآن پوری نوع انسانی کے لیے ہدایت نامہ ہے 171
۳۳/۱۳۔ آنحضرت سلام علیہ ہدایت کے متلاشی تھے قرآن کریم معاشرہ کے دکھوں کا مداوا ہے 174
حاصل کلام 179

وحی کی خصوصیات 181

(ازخواجہ ازہر عباس: فاضل درس نظامی)
وحی ساری متلو ہے ۱۸۱
وحی صرف جلی ہے ۱۸۲
وحی سابقہ وحی کی مصدق ہوتی ہے ۱۸۳
وحی ہمیشہ غالب رہتی ہے ۱۸۴
وحی کی مثل نہیں بن سکتی ۱۸۷
وحی قطعی ہوتی ہے ظنی نہیں ہوسکتی ۱۸۷
وحی بمعہ اپنے الفاظ کے منزل من اللہ ہوتی ہے ۱۸۸
وحی میں تضاد نہیں ہوسکتا ۱۸۹
وحی کے کسی بھی حصہ کو مسترد نہیں کیا جاسکتا ۱۹۰
وحی کا تعلق عالم امر سے' اقوال رسولؐ کا تعلق عالم خلق سے ہے ۱۹۱
وحی خداوندی کی اقسام ۱۹۲
سورہ شوریٰ آیت نمبر ۵۲ کا مفہوم ۱۹۵
حضورؐ کو صرف قرآن تعلیم کیا گیا تھا ۱۹۵
سورہ النجم کی ابتدائی آیات کا صحیح مفہوم ۲۰۰
صرف قرآن ہی کے وحی ہونے کے قرآنی دلائل ۲۰۱
دلیل نمبر ۱ ۲۰۱
دلیل نمبر ۲ ۲۰۲
دلیل نمبر ۳ ۲۰۲
(حصہ نزول)
دلیل نمبر ۴ ۲۰۳
دلیل نمبر ۵ ۲۰۳
دلیل نمبر ۶ ۲۰۴

دلیل نمبر ۷ ۲۰۴
دلیل نمبر ۸ ۲۰۵
دلیل نمبر ۹ ۲۰۵
دلیل نمبر ۱۰ ۲۰۶

وحی صرف قرآن میں ہے ۲۰۸

وحی صرف قرآن میں ہے ۲۰۹
وحی صرف قرآن میں ہونے کے دس دلائل ۲۰۹
دلیل نمبر ۱ ۲۰۹
دلیل نمبر ۲ ۲۱۰
دلیل نمبر ۳ ۲۱۰
دلیل نمبر ۴ ۲۱۰
دلیل نمبر ۵ ۲۱۲
(وحی صرف متلو ہے)
دلیل نمبر ۶ ۲۱۲
(امت صرف قرآن کی وارث ہے------)
دلیل نمبر ۷ ۲۱۳
(مایوحی اور قرآن ایک ہی چیز ہے)
دلیل نمبر ۸ ۲۱۴
(کتاب اور ماانزل ایک ہی چیز ہے)
دلیل نمبر ۹ ۲۱۴
(نزل علیٰ محمد قرآن ہے)
دلیل نمبر ۱۰ ۲۱۴
(معارضہ مما نزلنا کا کیا گیا ہے صرف قرآن کا نہیں)

وحی صرف قرآن میں ہونے کی عقلی دلیل ۲۱۵
وحی خارج از قرآن کا اقرار بھی اور انکار بھی ۲۱۶
حضور کا ہر قول وحی نہیں تھا ۲۱۷
سورہ النجم کی ابتدائی آیات کا صحیح مفہوم ۲۱۹
وحی صرف قرآن میں ہونے پر دوسرا اعتراض ۲۱۹
اطاعت رسولؐ کا صحیح طریقہ ۲۲۰
''اللہ اور رسول'' کی اصطلاح سے مراد مرکز ملت ہے ۲۲۲
لفظ حکمت کا صحیح مفہوم ۲۲۴
جزئیات کے تعین کا طریقہ ۲۲۶

گزارش:

ترجمہ وتفسیر زیر نظر کا تعارف (پیش لفظ) انتہائی عام فہم الفاظ میں پیش کیا گیا ہے حتیٰ کہ عربی قواعد کی مشکل اصطلاحوں کی بجائے آسان ترین اصطلاحیں استعمال کی گئی ہیں۔ تا کہ کم علم حضرات بھی قرآن کریم کی اپنی پیش کردہ قواعد کی روشنی میں قرآنی مفہوم کو بآسانی سمجھ سکیں۔

یہ قرآن کریم پر پڑے ہوئے روایات کے دبیز پردوں کو چاک کرنے کی مخلصانہ کوشش ہے لیکن بتقاضاء بشریت سہو ونسیان کے لیے حضور خداوندی میں دست بدعا ہیں

ربنا لا تؤاخذ نآ ان نسینا او اخطانا ج. ۲/۲۸۶

یہ کوشش حرف آخر نہیں بلکہ ہمیشہ کے لیے دعوت فکر وتدبر ہے۔ (۴۷/۲۴)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش رس

قرآن کریم کا اصل الاصول اور اساس محکم یہ ہے کہ حکم صرف اللہ تعالیٰ کا واجب الاتباع ہے' اور اس کے علاوہ کسی کو اس کے بندوں پر حکم چلانے کا اختیار نہیں ہے- ان الحکم الاللہ ۶/۵۷' اور ولا یشرک فی حکمہ احدًا ۱۸/۲۶ اسی اصول کو مزید مستحکم کرنے اور اس کی عملی تعبیر/صورت واضح کرتے ہوئے فرمایا کہ اتبعوا ما انزل الیکم الخ- اللہ تعالیٰ کی خالص اطاعت صرف اس کے نازل کردہ کلام یعنی قرآن کریم کی پیروی سے ہی ہوسکتی ہے- اور اس لیے یہ ضروری ہے کہ قرآن کریم کی تفسیر کرنے میں بھی خارج از قرآن ماخذ سے اجتناب کیا جائے کیونکہ اگر قران کریم کی تفسیر میں خارج از قرآن نظریات اور احکامات کی آمیزش کی گئی تو اللہ تعالیٰ کی اطاعت خالص نہیں رہے گی بلکہ ان لوگوں کی اطاعت بھی شامل ہو جائے گی جن کے نظریات' تصورات' احکامات اس تفسیر میں درآمد کیے جائیں گے- صرف چند امثلہ پر اکتفاء کیا جاتا ہے- قرآن کریم نے زانی کی سزا سو کوڑے مقرر کی ہے' لیکن روایات کی بنا پر اب تفاسیر میں زانی کی سزا سنگسار ہے- قرآن کریم کے مطابق ارتداد کوئی جرم نہیں ہے لیکن موجودہ تفاسیر میں مرتد کی سزا قتل ہے' غلام' لونڈی' نکاح نابالغان' ملکیت زمین' پیشوائیت' ملوکیت' قرآن کریم کے برخلاف' ان سب کا جواز موجودہ تفاسیر کی بنا پر ہے- اس لیے ان احکامات اور نظریات کا اتباع کرنے سے' ان حضرات کا اتباع ہوتا ہے جنہوں نے خلاف قرآن نظریات تفاسیر میں شامل کیے- ان کے اتباع سے خالص اللہ تعالیٰ کی اطاعت باقی نہیں رہتی- قرآن کریم چونکہ اپنی کسی بھی بات میں کسی دوسری چیز کا محتاج نہیں ہے اس لیے قرآن فہمی کا بنیادی اصول یہ ہے کہ قرآن کی بیان کی ہوئی جس چیز کی تفصیل مطلوب ہو' وہ قرآن سے ہی تلاش کی جائے- کیونکہ کتاب احکمت آیاتہ الخ یہ مکمل کتاب ہے جس کی آیات محکم بنائی گئی ہیں اور پھر حکیم وخبیر خدا کی

طرف سے ان کی تفصیل کی گئی ہے- نیز فرمایا ان علینا بیانہ ۱۹/۷۵ -

قرآن کریم نے خود قرآن فہمی کے لیے دو اصول لازمی قرار دیئے ہیں کہ انہیں کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا- ایک تو محاورہ عرب' کیونکہ قرآن کریم اسی طرز تکلم میں نازل ہوا ہے جس میں عرب خود کلام کرتے تھے- انہ لحق مثل ما انکم تنطقون ۵۱/۲۳ (ترجمہ) بلاشبہ یہ قرآن حق ہے اور اس کا انداز بیان بالکل وہی ہے جس طرح تم آپس میں روزمرہ گفتگو کرتے ہو- نیز فرمایا کہ لسان عربی مبین- دوسرا اصول یہ ہے کہ قرآن فہمی کے لیے تصریف آیات لازمی اور لابدی چیز ہے فرمایا انظر کیف نصرف الآیت لعلھم یفقھون ۶/۶۵ ترجمہ آپ دیکھیے تو سہی ہم کس طرح دلائل مختلف پہلوؤں سے بیان کرتے ہیں' شاید وہ سمجھ جائیں' نیز قرآن کریم کے مطابق حضور کا طریقہ قرآن فہمی کا یہی تھا- وکذلک نصرف آلایت و لیقولوا درست ولنبینہ لقوم یعلمون ۶/۱۰۵ مفہوم' اے رسول ہم اس طرح اپنی آیتوں کو پھیر پھیر کر لاتے ہیں (تاکہ آپ تصریف آیات کے ساتھ درس دیا کریں) اور تاکہ لوگ کہہ اٹھیں کہ آپ نے خوب سمجھا دیا ہے (اور تصریف آیات کی دوسری غرض یہ ہے' تاکہ ہم عقلمندوں کے لیے اپنی آیات کی خود تبیین کردیں-

لیکن حیرت و استعجاب کی بات یہ ہے کہ ہم مسلمانوں میں چودہ سو سال سے قرآن فہمی کے لیے جو اصول منضبط کیے گئے ہیں' اور جس طرح قرآن کریم کی تفاسیر تحریر کی گئی ہیں' ان میں یہ دونوں اصول بالکل نظر انداز کر دیئے گئے ہیں- ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا ان بنیادی اصولوں کو مفسرین کرام نے درخور اعتناء ہی نہیں سمجھا اور آیات کی تفسیر میں سارا زور شان نزول اور متعلقہ روایات پر دیا گیا ہے- حالانکہ شان نزول کی وجہ سے متعلقہ آیت کی عالمگیریت' ابدیت' اور عمومیت بالکل جاتی رہتی ہے اور آیت کریمہ کسی نہ کسی فرد یا کسی نہ کسی وقتی واقعہ سے مخصوص ہو جاتی ہے- پھر ایک ایک آیت کے کئی کئی شان نزول ہونے سے مفہوم میں شک و شبہ کا اضافہ ہونا ضروری ہے- یہی روایات کی صورت ہے' چونکہ روایات باعتبار سند خود ظنی ہوتی ہیں اس لیے قرآن کی آیات جیسی یقینی چیز کا دارومدار ان پر نہیں رکھا جا سکتا-

لیکن افسوس صد افسوس کہ گذشتہ چودہ سال سے تفسیر نویسی کا یہی ایک طریقہ چلا آ رہا ہے-

اس کی ابتداء تفسیر طبری سے ہوتی ہے اور آج تک ساری تفاسیر اسی کے تتبع میں' اسی انداز سے تصنیف کی گئی ہیں- صرف مختلف فرقوں نے' مختلف شان نزول اور مختلف روایات اس مقصد کے لیے استعمال کی ہیں- لیکن انداز ان سب کا وہی ایک رہا- یہاں تک کہ گذشتہ صدی میں چند بیدار مغز نامور محققین علماء کرام نے اس غیر قرآنی انداز کو ترک کر کے' قرآن کریم کے تجویز کردہ اصولوں' یعنی محاورہ عرب اور تصریف آیات کو پیش نظر رکھ کر' تفاسیر لکھنی شروع کیں' ان تفاسیر میں آیات کو تصریف آیات ہی سے حل کیا گیا ہے اور خارج از قرآن کسی بھی ماخذ کو قرآن فہمی میں رکاوٹ نہیں بننے دیا-

جن بیدار مغز علما نے' عام روش سے ہٹ کر تفسیر القرآن بالقرآن کا طریقہ اختیار کیا ان میں اولیت کا شرف مولوی محمد عبداللہ صاحب چکڑالوی مرحوم المتوفی ۱۹۱۸ء کے لیے مخصوص ہے- ان کو تین بار زہر دیا گیا جس کے اثر سے وہ مفلوج ہو گئے تھے- وہ جامع مسجد سریانوالہ بازار لاہور کے خطیب تھے اور شیخ محمد چٹو' سوداگر چرم ان کے مالی معاون تھے- ان کی تفسیر' تفسیر القرآن بہ آیات الفرقان' ایک ایک پارہ کی بڑے سائز میں طبع ہوئی جو کافی مرصہ میں مکمل ہوئی- ان کے ہم عصر مولوی خواجہ احمد الدین امرتسری تھے- جن کی تفسیر بیان للناس مقبول تفسیر ہے- خواجہ صاحب اپنے وقت کے مشہور عالم' اور کئی کتابوں کے مصنف تھے- مدرستہ البنات امرتسر میں عربی کے استاد تھے- ان کے علاوہ مولوی محمد فاضل و محمد عالم دو بھائی چکوال کے اور مولوی محمد عبدالخالق صاحب' نے بلاغ القرآن ۱۹۲۳ء سے ۱۹۲۵ء تک جاری کیا جس میں تفسیر بھی ہوتی تھی' ان ہی کے ہم عصر مولوی محمد رمضان صاحب اور ان کے صاحبزادے مولوی محمد اسماعیل صاحب تھے- ان کی تحریرات اب موجود نہیں لیکن ان صاحبان نے درس بھی دیئے اور جگہ جگہ لوگوں سے مناظرے کر کے اس فکر کو آگے بڑھایا- مولوی ماسٹر محمد علی مرحوم' رسول نگری عاش سعیدا و مات مغفور نے ۱۹۶۰ء سے اپنی وفات ۱۹۸۴ء تک بلاغ القرآن جاری رکھا اور اس میں تفسیر القرآن کا سلسلہ شروع کیا جو سورہ رعد تک اختتام پذیر ہوا- ان سب علماء کے علاوہ نامور مفکر قرآن' علامہ غلام احمد صاحب پرویز نے اسی طرح کی تفسیر کا سلسلہ جاری رکھا- انہوں نے محاورہ عرب کے تحت نئی لغات القرآن تصنیف کی اور تصریف الآیات کے لیے تبویب القران شائع کی- انہوں نے اس

نظریہ کواس زور اور قوت سے پھیلایا کہ اب یہ نظریہ پاکستان کی حدود سے باہر نکل کر تمام دنیا میں لوگوں کو متاثر کر گیا ہے اللہ تعالیٰ ان سب عشاق قرآن کو جزائے خیر دے۔

قرآن کریم کا دعویٰ ہے کہ وحی صرف قرآن میں ہے۔ اور خارج از قرآن وحی کا تصور نہ صرف باطل ہے بلکہ بے بنیاد اور خلاف قرآن ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ہم مسلمانوں میں یہ نظریہ در آیا ہے کہ قرآن کے علاوہ روایات بھی وحی (خفی) ہیں اور اسی عقیدہ کی بناء پر قرآن کریم کی تفسیر روایات کی روشنی میں ہونے لگی۔ لیکن اگر یہ عقیدہ تسلیم نہ کیا جائے تو وہ روایات جو وحی خفی پر مبنی ہیں وہ تو از خود ساقط ہو جاتی ہیں۔ لیکن تفاسیر میں ایسی روایات کے انبار لگے ہوئے ہیں۔ ماضی کے متعلق ساری روایات مثلاً حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی کی چوڑائی' اور اس میں جانوروں کی اقسام' آدمؑ کے قد کی تفصیل' جنت میں پیالوں' آبخوروں کی تعداد کا شمار دوزخ کے بیان میں سانپوں اور بچھوؤں کی تفاصیل' اسی طرح آئندہ سے متعلق روایات اور ان پر مبنی ساری تفاسیر بالکل بے بنیاد ہیں۔ تفاسیر کا بیشتر حصہ تو وحی خفی کے عقیدہ کے بطلان سے خود بخود بیکار ہو جاتا ہے۔ چونکہ سابقہ تمام تفاسیر کا انحصار وحی خفی پر ہے اور وحی خفی کا نظریہ خود قرآن کریم کے خلاف ہے تو ان تمام تفاسیر کی کیا اہمیت باقی رہ جاتی ہے؟ فلہذا قرآن فہمی کا واحد ذریعہ تفسیر القرآن بالقرآن ہی درست اور قرآن کے اصولوں کے مطابق رہ جاتا ہے۔ جس کے ماتحت تحریر کردہ تفسیر "تفسیر القرآن بالقرآن" کا مقدمہ آپ کے پیش نظر ہے۔ قارئین کرام سے درخواست ہے کہ اس "مقدمہ" کو تعصبات سے بالکل خالی الذہن ہو کر' اور بغیر کسی سابقہ رجحان کے بغور ملاحظہ فرمائیں۔ انشاء اللہ اس کے ذریعے آپ کے لیے نہ صرف قرآن فہمی آسان ہو گی۔ بلکہ آپ پر قرآن کریم کی تعلیم خود بخود منکشف ہوتی جائے گی اور قرآن کریم کی آیات دو اور دو چار کی طرح واضح اور روشن ہوتی جائیں گی۔

اس مقدمہ میں 'وحی صرف قرآن میں ہے اور وحی خفی کا نظریہ قرآن کے خلاف ہے' کا بار بار تذکرہ آیا ہے' اس لیے مناسب سمجھا گیا کہ مقدمہ کے آخر میں اس نظریہ کی تائید میں تحریر کردہ دو مضامین بھی شامل کر دیئے جائیں تاکہ وحی خفی کے نظریہ کا موثر طریقہ پر بطلان ہو سکے' یہ مضامین مقدمہ کا حصہ نہیں ہیں۔ بلکہ قرآن کریم کے ایک طالب علم کے تحریر کردہ ہیں جو افادۂ عالم کے لیے

بلکہ آپ پر قرآن کریم کی تعلیم خود بخود منکشف ہوتی جائے گی اور قرآن کریم کی آیات دو اور دو چار کی طرح واضح اور روشن ہوتی جائیں گی۔

جن حضرات نے اس شہ پارہ کو طبع کرنے میں مدد فرمائی' ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

۱۔ جناب محترم سید شاہد علی صاحب میرٹھی۔ لندن (M.A. Political Science)

۲۔ جناب راجہ محمد طاہر خان صاحب' لندن

یہ دونوں حضرات عرصہ دراز سے لندن میں مقیم ہونے کے باوجود قرآن کریم کے شیدائی ہیں اور ہر وقت قرآنی فکر کو عام کرنے میں سرگرداں ہیں اور ان کے خلوص اور ایثار کی وجہ سے لندن کے مسلمانوں میں یہ نظریہ قبول عام حاصل کر رہا ہے۔

محترمہ ثریا کوثر قیصرانی نے فہرست کی تیاری اور اس تحریر کو باقاعدہ کتاب بنانے میں جو محنت کی ہے اس کے لیے ممنون احسان ہیں۔ پروردگار ان کی صلاحیتوں میں مزید نکھار پیدا کرے۔

آخر میں محمد سلیم اختر صاحب کا شکریہ ادا کرنا ضروری ہے کہ جن کی مساعی جمیلہ سے یہ ''مقدمہ'' طبع ہوا۔ انہوں نے اس کی پروف ریڈنگ کی اور اپنی کوششوں سے طبع کرایا۔ وہ عنداللہ مثاب و ماجور ہوں گے۔

اس امر کی وضاحت از بس ضروری ہے کہ اس تالیف کے ابتدائی ۱۸۰ صفحات ''تفسیر القرآن بالقرآن'' کے مقدمہ پر مشتمل ہیں جو ادارہ بلاغ القرآن' ۱۰۱۔ این' سمن آباد لاہور کی شائع کردہ ہے۔ آئندہ صفحات میں جہاں کہیں ''زیر نظر ترجمہ و تفسیر'' کے الفاظ نظر آئیں تو اس سے مذکورہ بالا تفسیر ہی مراد ہے۔

وھھنا تم منا الکلام

علی مصطفنا الوف سلام

جاروب کش ایوان قرآنی

خواجہ ازہر عباس

فاضل درس نظامی

ایم-اے-عربی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

قرآن حق ہے

انا نحن نزلنا علیک القرآن تنزیلاo (۷٦: ۲۳)

اے رسول! ﷺ بے شک ہم نے قرآن کو آپ پر اس طرح ٹھیک ٹھیک نازل فرمایا ہے۔ جو نازل کرنے کا حق ہے۔

ویر الذین اوتو العلم الذی انزل الیک من ربک هو الحق و یهدی الی صراط العزیز الحمیدo (٦: ۳۴)

اور اے رسول! جو کچھ آپ کی طرف نازل کیا گیا ہے اسے وہ لوگ جنھیں علم دیا گیا ہے دیکھتے ہیں کہ وہ حق ہے اور وہ غالب تعریف کیے ہوئے (اللہ) کے راستے کی رہنمائی کرتا ہے نیز اسی چیز کی تائید بشہادت خداوندی موجود ہے:

فورب السماء والارض انه لحق (۵۱: ۲۳)

آسمانوں اور زمین کے پروردگار کی شہادت ہے کہ بلاشبہ قرآن حق ہے۔

حق کی تعریف۔

سطور بالا میں آپ قرآن حکیم کی داخلی شہادت کی روشنی میں ملاحظہ فرما چکے ہیں کہ آنحضور سلام علیہ پر قرآن نازل ہوا جو سرتا پا حق ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے حق کی تعریف کیا ہے؟

مخفف ہے سلامٌ علیہ کا یعنی اس پر سلام ہو۔ قرآن کریم نے انبیاء پر سلام کہنے کے لیے **سلمٌ علی المرسلین** (۳۷/۱۸۱) **سلمٌ علی نوح** (۳۷/۷۹) **سلمٌ علی ابراهیم** (۳۷/۱۰۹) **سلمٌ علی موسیٰ و هرون** (۳۷/۱۲۰) اور **سلمٌ علی ال یاسین** (۳۷/۱۳۰) کے الفاظ عطا فرمائے ہیں حضرت یحییٰ کے تذکرہ میں آپ پر سلام ان الفاظ میں کہا گیا ہے: **وسلمٌ علیه یوم ولد ویوم یموت و یوم یبعث حیاo** (۱۹/۱۵) **فلہذا** اس ترجمہ و تفسیر میں انبیاء علیہم کے اسماء مبارکہ پر لکھا گیا ہے۔

عربی زبان میں ہر اس چیز کو جو اس طرح بشکل مشہود موجود ہو کہ اس کے وجود سے دوست دشمن اور موافق ومخالف کسی کو مجال انکار نہ ہو اسے حق کہا جاتا ہے۔ مثلاً جب شکاری کا تیر ٹھیک نشانے پر بیٹھے اور شکار مجروح حالت میں سامنے پڑا ہو تو عربوں کے ہاں کہتے ہیں **رمی فاحق الرمیة**۔ نیز اونٹنی کا حمل جب اس طرح نمایاں ہو جائے کہ کوئی انکار نہ کر سکے تو کہتے ہیں **عند حق لقاحها**۔

اسی طرح چونکہ ارض وسماوات' اور ان میں موجود ہر چیز کا وجود ایک ناقابل انکار حقیقت ہے اس لیے یہ پوری کائنات حق ہے۔ چنانچہ ارشاد باری ہے:

خلق السموت والارض بالحق (۳ : ۶۴)

اسی طرح ہر وقوعہ کو اس کی حقیقی جزئیات سمیت حق کہا جاتا ہے۔ اور وہ الفاظ جن سے اس وقوعہ کا ٹھیک ٹھیک اور صحیح صحیح اظہار ہوتا ہو وہ بھی حق کہلاتے ہیں۔ قرآن کریم چونکہ وقوعہ کائنات کی ٹھیک ٹھیک خبر دیتا ہے' چونکہ اس کے الفاظ اس کی صحیح صحیح ترجمانی کرتے ہیں۔ اس لیے یہ بھی حق ہے چنانچہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے کائنات کے متعلق ارشاد فرمایا ہے: **خلق السموت والارض بالحق** اسی طرح قرآن کریم کے متعلق بھی ارشاد ہوا ہے: **نزل علیک الکتب بالحق** (۳:۳) اے رسولؐ! اللہ نے آپ پر ناقابل انکار حقائق سے معمور ایک مقدس کتاب نازل فرمائی ہے۔

تفاسیر کے ڈھیر۔

اسی حق کی تفسیر القرآن بآیتِ الفرقان کی خدمت کے لیے آج ہم میدان عمل میں اتر رہے ہیں لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس سے پہلے کوئی تفسیر موجود نہیں کہ اس کام کے لیے زر کثیر کا بوجھ بھی اٹھایا جائے اور وقت بھی خرچ کیا جائے؟ اس سوال کا جواب جگر تھام کر سننا پڑے گا۔ گزارش ہے کہ اس سے پیشتر متقدمین ومتاخرین کی تفسیروں کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔ اور ایک ایک تفسیر کئی کئی جلدوں پر مشتمل ہے۔ مثلاً:

تفسیر ابن جریر طبریؒ ۳۰ جلدوں کی ہے اور تفسیر امام غزالیؒ ۲۰ جلدوں کی

تفسیر امام ابن جوزیؒ ۴۰ جلدوں پر مشتمل ہے اور تفسیر ابن النقیب ۵۰ جلدوں پر
تفسیر الافودی ۱۲۰ جلدوں کی ہے اور تفسیر حدائق ذات البهجہ ۵۰۰ جلدوں کی

تفسیر مدارک التنزیل کی ۷ جلدیں ہیں' اور معالم التنزیل اور تفسیر کبیر کی آٹھ آٹھ۔ روح المعانی کی نو جلدیں ہیں۔ اور تفسیر مریسی کی ۲۴۔ کتاب الجامع فی التفسیر کی ۳۰ جلدیں ہیں اور کتاب التحریر والتحبیر کی ۵۰ سے بھی زائد۔

تفسیر کے طالب علم کی زندگی ختم ہو جائے گی تفسیریں ختم نہیں ہوں گی۔

اس کے علاوہ بغوی' بیضاوی' کشاف' سخاوی' بلقیسی' بقائی' فراہی' شوکانی' مہائمی' ابن تیمیہ' ماوردی' ابن منذر' ابن حیان' ابن فورک اور ابن ابی طالب مکی وغیرہ جیسی سینکڑوں تفاسیر پانچ پانچ اور سات سات جلدوں پر مشتمل اس عظیم ذخیرے کی صورت میں موجود ہیں کہ ان سب کا مطالعہ کرنا اور ان کے مندرجات کو محض سرسری نگاہ سے دیکھنا بھی انتہائی مشکل ہے۔ اگر کوئی شخص متقدمین و متاخرین کی تفاسیر سے استفادہ حاصل کرنے کا ارادہ کر بیٹھے جن میں کئی کئی سو صفحات پر مشتمل پانچ سو جلدوں کی تفسیر بھی موجود ہے' تو اسکی زندگی ختم ہو جائے گی تفسیریں ختم نہیں ہوں گی۔ یہ تو ہیں ابھی متقدمین کی تفسیریں۔ متاخرین میں سے شاہ عبدالقادر' شاہ اشرف علی' شاہ عبد العزیز' شاہ محمود الحسنؒ ابوالکلام آزادؒ ڈپٹی نذیر احمدؒ مولوی فیروز الدینؒ مولوی احمد علی لاہوریؒ اور مولوی ثناء اللہ صاحبؒ امرتسری کی تفاسیر کے علاوہ' تفسیر نعیمی' عزیزی' تفہیم القرآن' اور جامع التفاسیر جیسی سینکڑوں تفسیروں کے الگ ڈھیر لگے پڑے ہیں۔

تفسیری اختلافات۔

ان لاکھوں بلکہ کروڑوں صفحات پر پھیلی ہوئی ہزاروں تفسیروں کا انداز بیان واحد ہے۔ تفسیر ابن جریر کو چونکہ ام التفاسیر مانا گیا ہے۔ اس لیے سب تفسیریں قریب قریب اسی تفسیر کا پرتو ہیں اور چونکہ تفسیر ابن جریر کا ماخذ کتب روایات ہے۔ اور روایات کو چونکہ احادیث رسول سلام علیہ مانا گیا ہے۔ اس لیے یہ ہزاروں کی تعداد کو پہنچنے والی تفسیریں' اگرچہ متفقہ طور پر یہ فیصلہ نہیں دے سکتیں کہ ۲:۱۰۲ میں مذکور افراد ہاروت و ماروت شیطان تھے یا فرشتے' لیکن پھر بھی ان سب کو رسولی تفسیریں

ہی مانا جاتا ہے۔ حالانکہ قرآن کریم کی شہادت سے جو آگے آ رہی ہے' یہ ثابت ہوتا ہے کہ رسول مقبول سلام علیہ کا تفسیری انداز صرف اور صرف تفسیر القرآن بالقرآن تھا۔

برادران اسلام! اس دعوے کی دلیل تو قرآنی آیات کریمات کی روشنی میں آگے چل کر اپنے مقام پر پیش کی جائے گی۔ پہلے آپ اس اعتراض کا جواب ملاحظہ فرمائیں جو تفسیر القرآن بالقرآن کے عنوان پر بالفاظ ذیل پیدا ہوسکتا ہے کہ:

قرآن کریم کی تفسیر' اور خود قرآن کریم کے ساتھ؟

نیز کیا خود رسول مقبولؑ بھی قرآنی تفسیر کے لیے قرآن کریم ہی کے محتاج تھے؟ کیا آنحضورؑ اپنی رائے کے ساتھ تفسیر نہیں فرمایا کرتے تھے؟

برادران عزیز! ان حالات میں کہ جہاں قرآن کریم کو مجمل' غیر مفصل اور کتب روایات کا محتاج مانا جاتا ہو۔ یہ سوال ایک اچھنبے کی صورت میں ابھر کر سامنے آتا ہے کہ کیا قرآن اپنی تفسیر آپ کرسکتا ہے؟ اس سوال کے جواب کے لیے سطور ذیل پر بانداز تعمق غور فرمائیں:

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ کسی کتاب کی تفسیر وہ شخص کرسکتا ہے جو علمی لحاظ سے یا تو صاحب کتاب سے افضل حیثیت کا حامل ہو اور یا کم از کم اسی علمی سطح پر فائز ہو' جو خود صاحب کتاب کی ہے لیکن قرآن کریم چونکہ کتاب ہے اللہ تعالیٰ کی اور کوئی فرد و بشر' علم کی رو سے نہ اس سے افضل ہوسکتا ہے نہ اس کی علمی سطح کا۔ فلھذا اس چیز کا سوال تک پیدا نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب کا مفسر کوئی بشر ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اعلان فرما دیا ہے کہ اپنی کتاب کے مفسر بھی ہم خود ہیں:

ولا یا تونک بمثل الا جئنک بالحق و احسن تفسیرا ٥

(۲۵: ۳۳)

(مفہوم) صاحب قرآن! لوگ آپ کے پاس قرآن کی مثل نہیں لائیں گے۔ مگر ہم ہی ہیں جو آپ کے پاس حق (قرآن) اور اس کی احسن تفسیر لاتے ہیں۔ فلھذا آگے بڑھنے سے پہلے اس مسلمہ کو ذہن میں محفوظ کر لیجیے گا کہ قرآن کتاب ہے اللہ تعالیٰ کی' نہ کوئی فرد و بشر علم کے لحاظ سے

اللہ سے افضل ہے نہ برابر۔ اس لیے اس کی کتاب کا مفسر کوئی بشر نہیں ہو سکتا۔ وہ اپنی کتاب کا مفسر بھی خود آپ ہے۔ جیسے کہ اس نے قرآن کریم پر تدبیر و تفکر کرنے والوں کے لیے بتکرار کثیر اعلان کر دیا ہے کہ اپنی آیتوں کی تفسیر و تفصیل بھی ہم خود ہی کرتے ہیں:

کذالک نفصل الایت لقوم یتفکرون ○ (۲۴: ۱۰) اسی طرح تفکر کرنے والوں کے لیے اپنی آیتوں کی تفصیل ہم خود کرتے ہیں۔

قد فصلنا الایت لقوم یفقھون ○ (۹۸ : ۶) بے شک ہم نے تفقہ کرنے والوں کے لیے اپنی آیتوں کی خود تفصیل کر دی ہے۔ اور ساتھ ہی قرآن کریم پر تدبر کرنا فرض قرار دے کر عدم تفکر کے لیے سخت تنبیہ فرمائی ہے۔

افلا یتدبرون القران ام علی قلوب اقفالھا (۲۴ : ۴۷)
پس لوگ قرآن میں تدبیر کیوں نہیں کرتے؟ کیا ان کے ذہنوں پر اس کی طرف سے تالے پڑے ہوئے ہیں؟ (یعنی لوگوں کو چاہیے کہ ذہنوں پر تقلید کے تالے نہ ڈالیں بلکہ قرآن میں تدبر کیا کریں' نیز فرمایا:

کتب انزلنہ الیک مبرک لیدبروا ایتہ ولیتذکر اولوا الالباب ○ (۳۸ : ۲۹)

مفہوم: اے رسولؐ! آپ کی طرف ایک مبارک کتاب نازل کی گئی ہے۔ جس کی ایک غرض نزول یہ ہے کہ لوگ اس کی آیتوں پر تدبر کیا کریں۔ اور عقل والے اس سے نصیحت حاصل کرتے رہیں۔

غور فرمایئے گا! آیات بالا سے بالصراحت ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کریم پر تدبر و تفکر نہ کرنا منشاء الٰہی کے خلاف ہے۔ نیز تدبر فی القرآن کو قیامت تک کے لیے جاری رکھا گیا ہے جس پر افلا یتدبرون القران (۴۷:۲۴+۴:۸۲) اور لیدبروا (۳۸:۲۹) کے خداوندی الفاظ قیامت تک کے لیے قرآن کریم میں بطور شاہد موجود رہیں گے۔ لہٰذا ذہن کو کسی سابقہ دور کے تدبر و تفکر کے تالوں کے ساتھ مقفل کر لینا' قرآن کریم کی لامحدود وسعتوں کو محدود کرنے کے مصداق ہے۔

تفقہ فی القرآن کا قرآنی طریقہ۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن کریم پر تدبر و تفقہ کا طریقہ کیا ہے؟ کیا آیات قرآنیہ کی تفصیل و تفسیر کے لیے ان غیر قران کتابوں کی طرف رجوع کیا جائے گا جو ایک ایک آیت کے کئی کئی شان نزول اور کئی کئی تفسیریں پیش کرتی ہیں؟

اس سلسلے میں آپ ۳۳: ۲۵ کا اعلان خداوندی اوپر ملاحظہ فرما چکے ہیں کہ قرآن کریم کی تفصیل و تفسیر خود اللہ تعالیٰ نے کر دی ہے۔ لہذا تفسیر زیر نظر میں خدا تعالیٰ کی اپنی فرمائی ہوئی تفسیر کو چھوڑ کر' جو خود قرآن کریم میں موجود ہے کسی غیر قرآن تفسیر کی طرف رخ نہیں کیا گیا۔ اور اس سوال کا جواب کہ آیات قرآنیہ کی تفصیل و تشریح کا طریقہ کیا ہے؟ یہ بھی قرآن کریم کی اپنی ہی زبان میں ملاحظہ فرمائیں کہ اس کتاب مقدس کے نازل کرنے والے نے اہل عالم کے لیے اپنی کتاب کا طریقہ تفقہ اور تدبر بھی خود واضح کر رکھا ہے:

(الف) انظر کیف نصرف الایت لعلھم یفقھون ٥ (٦٥ : ٦)
(مفہوم) صاحب قرآن! غور فرمایئے گا ہم کس طرح اپنی آیتوں کو پھیر پھیر کر لاتے ہیں۔ تاکہ لوگ ان میں تفقہ کریں۔ نیز فرمایا:

(ب) انظر کیف نصرف الایت ثم ھم یصدفون ٥ (٤٦ : ٦)
(مفہوم) صاحب قرآن غور فرمایئے گا ہم کس طرح اپنی آیتوں کو پھیر پھیر کر لاتے ہیں پھر لوگ ہیں کہ تصریف آیات سے اعراض کرتے ہیں۔

رسول اکرمؐ کا طرز تدریس اور طریقہ تفقہ فی القرآن بھی تصریف آیات ہی تھا۔

آیات بالا کی شق الف میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ:

قرآن کریم کا اسلوب بیان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی پاکیزہ کتاب کی آیتوں کو اس طرح پھیر پھیر کر بیان کیا ہے کہ اس سے تفقہ کے دروازے کھلتے اور تدبر فی القرآن کی شمعیں روشن ہوتی ہیں۔ اور تصریف آیات کا اسلوب اختیار کرنے کا مقصد عظیم یہ بتایا گیا ہے کہ لوگ تدبر فی القرآن

کے لیے تصریف آیات ہی کا اندازاختیار کریں۔یعنی ہر آیت کے مفہوم و معانی کی تصدیق دوسری آیات کریمات ہی کے ساتھ کیا کریں۔(٦:٦٥) نیز شق ب میں آپ نے دیکھ لیا ہے کہ: تفقہ فی القرآن کے لیے تصریف آیات کے قرآنی اسلوب کو چھوڑ کر کوئی اور طریقہ تفقہ اختیار کرنے کو قرآن کریم سے فرار قرار دیا گیا ہے۔(٦:٤٦) پس تصریحات بالا سے بصورت حق الیقین ثابت ہوا کہ خود قرآنی ہدایات کے مطابق قرآن کریم کی تفسیر و تبیین کا واحد طریقہ تصریف آیات ہے۔اب اس سلسلے کا آخری اور اہم ترین سوال یہ ہے کہ خود حامل قرآن رسول عربی سلام علیہ کا طرز تدریس اور طریقہ تفقہ فی القرآن کیا تھا؟ کیا آپ بھی تصریف آیات ہی کے ساتھ درس قرآن دیا کرتے تھے یا آپ کا طریقہ تفقہ تفسیر بالرائے کا حامل تھا؟ اس سوال کا جواب اللہ تعالٰی نے خود آنحضور کی طرف ایک مخصوص خطاب فرماتے ہوئے باندازِ ذیل دے رکھا ہے:

وکذالک نصرف الایت ولیقولوا درست و لنبینہ لقوم یعلمون٥

(٦:١٠٥)

(مفہوم) اور اے رسول !ہم اسی طرح اپنی آیتوں کو پھیر پھیر کر لاتے ہیں (تاکہ آپ تصریف آیات کے ساتھ درس دیا کریں) اور تاکہ لوگ کہہ اٹھیں کہ آپ نے خوب سمجھا دیا ہے۔ اور (تصریف آیات کی دوسری غرض یہ ہے) تاکہ ہم عقلمندوں کے لیے اپنی آیتوں کی خود تبیین کر دیں۔فلھذا بدرجہ اتم ثابت ہوا کہ رسول اکرم اس قرآنی حکم کے مطابق تصریف آیات ہی کے ساتھ درس قرآن دیا کرتے تھے۔یعنی آپ کا طریقہ تفقہ بھی تصریف آیات ہی تھا۔

آنحضور کا فریضہ تبیین قرآن۔

قرآن کہتا ہے کہ تبیین قرآن آنحضور سلام علیہ پر فرض کی گئی تھی چنانچہ سورۂ نحل میں خود آنحضور کو مخاطب کر کے ارشاد ہوا ہے: **وانزلنا الیک الذکر لتبین للناس مانزل الیھم** (١٦:٤٤) اور اے رسول! ہم نے آپ کی طرف اپنا نصیحت نامہ اس لیے نازل فرمایا ہے کہ جو ضابطہ حیات، نوع انسانی کی طرف نازل کیا گیا ہے۔آپ اسے لوگوں پر نہایت وضاحت و صراحت کے ساتھ بیان کر دیں۔اس آیہ جلیلہ سے بعض لوگ قرآن سے الگ رسولی

تفسیر کا وجود ثابت کرتے اور کتب روایات کو رسولی تفسیر ٹھہراتے ہیں حالانکہ اگر اس نظریے کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو آنحضور آیت مجیدہ ۱۶:۴۴ کے عامل ثابت نہیں ہوتے۔ کیونکہ کتب روایات میں قرآن کریم کی بائے بسم اللہ سے سین والناس کی تفسیر ہے ہی نہیں۔ جیسے کہ بخاری شریف کے اگرچہ قرآن کے تیس پاروں کے مقابلے پر پورے تیس پارے ہیں۔ لیکن کوئی پارہ کسی پارے کی تفسیر وتبیین پر مشتمل نہیں۔ حالانکہ مذکورہ نظریہ کے مطابق چاہیے یہ تھا کہ بالترتیب ہر پارہ ہر پارہ کی تفسیر وتبیین ہوتا۔ واضح رہے کہ ۱۶:۴۴ کے مطابق تبیین قرآن چونکہ آپ کا فریضہ قرار دیا گیا ہے۔ اس لیے آپ کے مناصب جلیلہ میں سے ایک منصب یہ بھی ہے کہ آپ قرآن کریم کو صرف پڑھ کر ہی نہ سنائیں۔ بلکہ اس کی تشریح وتبیین بھی فرمایا کریں حضور کے اس منصب عظیمہ کی وضاحت ۶:۱۰۵ کی روشنی میں اوپر گزر چکی ہے کہ آپ تصریف آیات کے ساتھ درس قرآن دیا کرتے تھے یعنی آیات قرآنیہ کی تفسیر وتصریح آیات قرآنیہ ہی کے ساتھ کر کے ۱۶:۴۴ اور ۶:۱۰۵ ہر دو آیات کریمات کے احکام سے سبکدوش ہو جاتے۔ اور چونکہ آپ کی فرمائی ہوئی تفسیر' تصریف آیات کی صورت میں قیامت تک کے لیے خود قرآن کریم میں موجود ہے۔ اس لیے آپ نے امت کو رسولی تفسیر کے نام سے کوئی الگ کتاب بھی نہیں دی تھی اور فریضہ تبیین سے عہدہ برا بھی ہو چکے تھے۔

اس کے برعکس جن کتابوں کو رسولی تفسیر بتایا جاتا ہے ان کی حالت یہ ہے کہ کسی آیت مجیدہ میں جو امر تفسیر طلب ہوتا ہے۔ اس کی طرف رخ تک نہیں کیا جاتا جیسے کہ علم ادم الاسماء (۲:۳۱) میں تفسیر طلب یہ امر ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو کونسے نام سکھائے گئے تھے لیکن بخاری شریف میں اس کی تفسیر یہ لکھی ہے کہ: قیامت کو لوگ حضرت آدم علیہ السلام کے پاس شفاعت کے لیے جائیں گے لیکن وہ کہیں گے کہ مجھے اپنا گناہ یاد آ رہا ہے۔ تم نوح علیہ السلام کے پاس جاؤ۔ (ملخص بخاری شریف مطبوعہ قرآن محل کراچی جلد دوم کتاب التفسیر صفحہ ۱۰۷) اب بتایئے کیا اس نام نہاد رسولی تفسیر نے بتایا ہے کہ وہ اسماء کیا تھے' جو آدم کو سکھلائے گئے تھے؟

حالانکہ آیت بالا ۱۶:۴۴ میں قرآن کی تبیین آنحضور کا فریضہ قرار دیا گیا ہے۔ اور ۶:۱۰۵ میں قرآنی اسلوب تصریف آیات کی غرض یہ بتائی گئی ہے کہ آپ متنازعہ مسائل اور متنازعہ الفاظ کی

تشریح، تصریف آیات کے ساتھ فرمایا کریں لیکن نام نہاد رسولی تفسیر آنحضور کو اس فرض سے غافل قرار دیتی ہے اور نتیجہ یہ ہے کہ کتب روایات کو رسولی تفسیر ٹھہرانے والا ایک گروہ کہتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے اپنے ہی اسماء گرامی ہیں۔ جو حضرت آدم علیہ السلام کو سکھائے گئے تھے اور دوسرا یہ کہتا ہے کہ انھیں بارہ اماموں کے نام سکھائے گئے تھے، حالانکہ تصریف آیات کی رو سے حقیقت دونوں کے برخلاف ہے۔ (وضاحت اپنے مقام پر آگے آئے گی)۔ یاد رہے کہ خود آنحضور سمیت قیامت تک کے لوگوں کے لیے آیات قرآنیہ کے طریقۂ تبیین کی وضاحت ۶/۶۵ میں اور آنحضور کے طرز تدریس کی صراحت ۶/۱۰۵ میں موجود ہے جہاں ہر مفکر قرآن کے لیے تفسیر بالرائے کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیا گیا ہے۔ فلھذا تفسیر القرآن میں انسانی رائے کو ہرگز ہرگز دخل نہیں۔ قرآن کی تفسیر تصریف آیات کی مدد سے خود قرآن کریم کے ساتھ کرنا ہی منشاء الٰہی ہے۔ جیسے کہ اسی سوۂ نحل کی آیت مجیدہ ۱۶/۴۴ وانزلنا الیک الذکر لتبین للناس سے آگے ۱۶/۸۹ میں خدائے عزوجل نے آنحضرت کو مخاطب کر کے اسی امر کی تصدیق فرمائی ہے کہ آپ پر جو کتاب نازل فرمائی گئی ہے۔ وہ ہر مسئلے کی وضاحت خود کرتی ہے۔ کسی انسانی تفسیر کی محتاج ہرگز نہیں:

ونزلنا الیک الکتب تبیانا لکل شیء ۱۶/۸۹

(مفہوم) اور اے رسول! ہم نے آپ پر اپنی کتاب نازل فرمائی ہے، جو خود ہی ہر مسئلہ کی تشریح و تبیین کرنے والی ہے۔

قرآن کریم کے ساتھ کوئی غیر اللہ کتاب ہرگز ہرگز واجب الاتباع نہیں۔

دیکھا آپ نے! کہ باری تعالیٰ نے آیت بالا میں اپنی کتاب کی اکملیت اور اس کے اپنی تفسیر آپ ہونے کی تصدیق کس وضاحت کے ساتھ کر دی ہے فلھذا بالصراحت ثابت ہوا کہ خود رسول اکرم بھی تصریف آیات کے خداوندی حکم ۶/۶۵ اور ۶/۱۰۵ کے مطابق اپنے درسوں میں اس کتاب کی تفسیر خود اسی کے ساتھ ہی فرمایا کرتے تھے، جو خود تبیانا لکل شی ہے۔ اور چونکہ یہ کتاب خود مکمل، مفصل اور مفسر ہے۔ اور کسی بھی انداز سے کسی غیر اللہ کتاب کی محتاج نہیں

اسی لیے خدائے علیم وخبیر نے پوری امت مسلمہ کے لیے قرآن حکیم کے سوا کسی اور کتاب کو واجب الاتباع ٹھہرایا ہی نہیں بلکہ غیر اللہ کتابوں کے خیر خواہوں کی اتباع سے مطلقاً روک دیا ہے:

اتبعوا ما انزل الیکم من ربکم ولا تتبعوا من دونہ اولیاء ۷/۳

(مفہوم) ایمان والو! تمہاری طرف تمہارے رب کی طرف سے جو (کتاب) نازل کی گئی ہے اس کی اتباع کرو۔ اور اس کے سوا غیر اللہ کتابوں کے خیر خواہوں کی اتباع ہرگز نہ کرنا۔

دیکھیے گا! اس آیت مجیدہ پر غور کرنے سے یہ چیز نکھر کر عیاں ہو رہی ہے کہ جب قرآن کریم کے سوا کوئی اور کتاب واجب الاتباع ہے ہی نہیں تو ظاہر ہے کہ قرآن کریم نوع انسانی کی جملہ ضروریات کے لیے کافی ہے۔ اگر یہ تفسیری ضروریات کی رو سے ناکافی ہوتا تو "ولا تتبعوا من دونہ اولیاء" کے بعد استثنیٰ کے طور پر "الا اولیاء کتب التفاسیر" یا "الا اولیاء کتب الروایات" آنا چاہیے تھا۔ لیکن جیسے کہ متعدد آیات کریمات میں اعلان کیا جاچکا ہے کہ یہ کتاب اپنی تفسیری اور تشریحی ضروریات تک کے لحاظ سے کسی غیر اللہ کتاب کی محتاج نہیں تو ثابت ہوا کہ ۳۳/۲۵ کے خداوندی اعلان کی رو سے کہ قرآن اور اس کی احسن تفسیر ہم خود لاتے ہیں۔ قرآنی تفسیر کے لیے تفسیر القرآن بالقرآن کا انداز ہی منشاء الٰہی کے عین مطابق ہے۔ اور ۱۰۵/۶ کی خداوندی خبر کی روشنی میں کہ آنحضور تصریف آیات ہی کے ساتھ درس قرآن دیا کرتے تھے۔ تصریف آیات کا انداز ہی عین رسولی ہے۔ بالفاظ دیگر آنحضور کی قرآنی تفسیر خود قرآن کریم کے اندر موجود ہے یعنی ہر متنازعہ آیت مجیدہ کا مفہوم قرآن کریم کی دوسری آیات کریمات کو بطور شاہد لا کر اخذ کرنا ہی سنت رسول ہے۔ یعنی کسی بھی آیت کی تفسیر و تشریح کے لیے غیر اللہ کتابوں کا رخ کرنا نہ منشاء الٰہی ہے نہ سنت رسول۔

قرآن فہمی کے قرآنی اصول وقواعد کی اتباع لازم ہے –

گزشتہ صفحات میں بتایا جاچکا ہے کہ سابقہ تراجم وتفاسیر ایک دوسری سے بھی مختلف ہیں اور خود اپنے اپنے دامن میں بھی شکی اختلافات کے ذخائر سمیٹے ہوئے ہیں جس سے حق وصداقت

کے متلاشی افراد سر پکڑ کر بیٹھ جاتے ہیں کہ ایک طرف تو یہ کہا جاتا ہے کہ:

روایات کی مدد سے کی گئی یہ موجودہ تفسیریں ثنائی' موضح القرآن' عزیزی اور نعیمی وغیرہ سب رسولی تفسیریں ہیں۔ اور دوسری طرف ان رسولی تفسیروں میں اس قدر تضاد و تخالف ہے کہ تفسیر ثنائی ہاروت ماروت کو شیطان کہتی ہے لیکن موضح القرآن انہیں فرشتے بتاتی ہے ۲/۱۰۲ و لی اللہی تفسیر جس ضمیر کا مرجع سورج ٹھہراتی ہے تفسیر ثنائی اسے گھوڑوں کی طرف لے جاتی ہے۔ "حتـــــی تـوارت بـالـحجـاب ۳۲/۳۸" اور تفسیر ثنائی' جن الفاظ سے خدا تعالیٰ کی محبت مراد لیتی ہے' موضح القرآن انہی سے اللہ کے ذکر سے غفلت قرار دیتی ہے۔ "انی احببت حب الخیر عن ذکـــر ربـــی" ۳۸/۳۲۔ حتی کہ ان تفاسیر و تراجم میں حروف کے مقامی معنوں تک میں باہمی اختلاف موجود ہے۔ "وما انـزل عـلی الملکین ببابل ھاروت و ماروت ۲/۱۰۲" کے مـا کو تفسیر ثنائی نافیہ ٹھہرا کر یہ تاثر دیتی ہے کہ بابل شہر کے ہاروت ماروت دو شیطان تھے۔ ان پر کچھ نازل نہیں ہوا تھا۔ اور اشرفی' نعیمی' عزیزی وغیرہ تفسیروں نے اس ما کو موصولہ گردان کر یہ مشہور کر رکھا ہے کہ ہاروت ماروت دو فرشتے تھے اور ان پر خدا تعالیٰ کی طرف سے جادو نازل ہوا تھا۔ العیاذ باللہ!

یہ تو ہوا ان مختلف تراجم و تفاسیر کا ایک دوسری کے ساتھ شدت تضاد و تخالف کا عالم جن میں سے ہر ایک کو صرف اس لیے رسولی تفسیر کہا جاتا ہے کہ یہ سب کتب روایات کی مرہون منت ہیں۔ لیکن جب ان میں سے ایک ایک پر الگ الگ غور کیا جائے' تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب کی سب بشکمی اختلافات سے بھی معمور ہیں۔ کہیں لکھتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ گمراہوں کو سخت سزا دینے والا ہے' و الـلـه شـديد العقاب ۰ ۳/۱۱ اور کہیں یہ تاثر دیتی ہیں کہ خود اللہ ہی گمراہ کرتا ہے۔ اور جسے وہ گمراہ کر دے اسے کوئی راہ دکھلانے والا نہیں ومـن یـضـلـل الله فماله من هاد ۰ ۳۹/۳۶ تو اس طرح ان تفاسیر و تراجم سے یہ تصور جنم لیتا ہے کہ معاذ اللہ استغفر اللہ' اللہ تعالیٰ خود ہی گمراہ کرتا ہے اور خود ہی شدید سزا کی وعید سناتا ہے۔

اسی طرح سابقہ تراجم میں کہیں یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ ہر شخص کا حصہ وہی ہے جتنی کہ وہ خود کوشش کرتا ہے۔ وان لیـس لـلانسان الا ماسعی ۰ ۵۳/۳۹ اور کہیں یہ کہ اللہ تعالیٰ جس کا

چاہتا ہے رزق فراخ کردیتا ہے۔ اور جس کا چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے۔ یبسط الرزق لمن یشاء ویقدر ۵ ۴۲/۱۲

ایک طرف یہ تفاسیر و تراجم یہ نظریہ پیش کرتے ہیں کہ اللہ پورے عالمین کی ربوبیت کرنے والا ہے الحمد للہ رب العلمین ۵ ۱/۱ – اور ہر ذی جان کا رزق اللہ کے ذمہ ہے' وما من دآبۃ فی الارض الا علی اللہ رزقھا ۶/۱۱۔ اور دوسری طرف مشاہدات عالم میں اس مفہوم کی عملاً تکذیب پائی جاتی ہے کیونکہ ایک ایک قحط میں لاکھوں انسان اور کروڑوں مویشی علماء کرام کی نگاہوں کے سامنے بھوک سے تڑپ تڑپ کر مرتے پائے جاتے ہیں۔

حقیقت حال۔

تو اس طرح جو شخص قرآن حکیم کی ان تفاسیر و تراجم سے استفادہ کی کوشش کرتا ہے الناّ بحر استعجاب میں غرق ہو کر رہ جاتا ہے کہ کیا یہ مختلف و متضاد مفاہیم اسی مقدس کتاب کے ہیں جس کی داخلی شہادت یہ ہے کہ اس میں تضاد و تخالف کا گزر تک نہیں۔ گزر تک کیوں نہیں؟۔ اس لیے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ ہے۔

ولو کان من عند غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلافا کثیرا ۵ ۸۲/۴–

''اگر یہ قرآن غیر اللہ کی طرف سے ہوتا تو لوگ اس میں کثیر اختلاف موجود پاتے۔''

حقیقت یہ ہے کہ قرآنی دعوؤں کی پامالی کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کو سمجھنے کے جو اصول خود بیان فرمائے ہیں۔ ان سے مطلقاً اعراض کرتے ہوئے' قرآن حکیم کی تفسیر ان کتابوں کو ٹھہرالیا گیا ہے جن کے متعلق مشہور تو یہ ہے کہ یہ قرآن کریم کی رسولی اور پیغمبرانہ تفسیر ہیں لیکن ان کتابوں کا اپنا اعلان یہ ہے کہ ان کے مندرجات' عن فلاں عن فلاں کی روایت سے آنحضور کی طرف منسوب ہیں۔

کیا حضرت عمرؓ قرآن کی تفسیر رسول مقبول سے بہتر جانتے تھے؟

افسوس ہے کہ ذخیرہ روایات کو اگر قرآن کی رسولی تفسیر مانا جائے تو صاحب قرآن سلام علیہ کو قرآن فہمی کے ان اصول وقواعد سے معاذ اللہ بے خبر ماننا پڑتا ہے' جو خود اللہ تعالیٰ نے اپنی

کتاب کے اندر محفوظ کر رکھے ہیں۔ یہ اصول وقواعد تو بالترتیب عنقریب پیش کیے جائیں گے۔ پہلے آپ آنحضور کی طرف منسوب کردہ تفسیر کا نمونہ ملاحظہ فرمائیں۔ جو بخاری شریف کے الفاظ میں یہ تاثر دیتا ہے کہ آنحضور سلام علیہ کے مقابلے پر حضرت عمرؓ قرآن کی بہتر تفسیر جانتے تھے۔ اور اللہ تعالیٰ آنحضور کی تفسیر کی بجائے حضرت عمرؓ کی تفسیر کی تائید فرماتا تھا۔ چنانچہ آیت ذیل پر پہلے خود غور کریں۔ اور پھر بخاری شریف میں درج اس کی رسولی اور فاروقی تفاسیر کا تقابل ملاحظہ فرمائیں:

استغفر لهم او لا تستغفر لهم ط ان تستغفر لهم سبعين مرة فلن يغفر الله لهم ط ٥ ٩/٨٠

(مفہوم) اے رسول! ان (منافقین) کے لیے آپ مغفرت طلب کریں یا نہ کریں (ہمارے لیے برابر ہے) اگر آپ ان کے لیے ستر بار بھی مغفرت طلب کریں گے۔ تو پھر بھی اللہ تعالیٰ انہیں معاف نہیں کرے گا۔

آیت مجیدہ کے الفاظ سے ایک معمولی عقل کا آدمی بھی سمجھ سکتا ہے کہ آنحضور کو منافقین کے لیے طلب مغفرت سے منع کر دیا گیا ہے کیونکہ جس عمل کا کرنا اور نہ کرنا برابر ہو اللہ کے رسول سے اس عمل بے کار کا ارتکاب ہرگز ممکن نہیں۔ خصوصا ایسی صورت میں جبکہ آپ پر واضح کر دیا گیا ہو کہ اس کا کرنا اور نہ کرنا مساوی ہے۔ لیکن بخاری شریف کی ایک روایت یہ تاثر دیتی ہے کہ آنحضور نے اپنے ذہن میں اس آیت کی یہ تفسیر محفوظ فرما رکھی تھی کہ آپ کو اختیار دے دیا گیا ہے کہ چاہیں تو منافقوں کے لیے طلب مغفرت فرمائیں اور چاہیں تو نہ فرمائیں۔ لیکن حضرت عمرؓ نے اس آیت سے یہ مفہوم اخذ فرمایا کہ آنحضور کو منافقین کے لیے طلب مغفرت سے مطلقا روک دیا گیا ہے۔ مگر اب دیکھنا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کس کی تفسیر کو صحیح قرار دیا۔ اور کس کی تفسیر کو غلط ٹھہرایا۔ اس کے لیے بخاری شریف کے باب الجنائز میں درج ابن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت میں روایات کے بتائے ہوئے رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی کی دعائے میت (نماز جنازہ) کا واقعہ ملاحظہ فرمائیں۔ طوالت کے خوف سے روایت کے متن کی بجائے علماء روایات کا خودنوشت ترجمہ پیش خدمت ہے۔

''مسدد'یحیٰ بن سعید'عبیداللہ'نافع ابن عمرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ عبداللہ بن ابی (منافق) جب مرا تو اس کا بیٹا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔اور عرض کیا یارسول اللہ ہمیں اپنا کرتہ عنایت کیجئے کہ ہم اس میں اس کا کفن بنائیں۔اور آپ اس پر (جنازے کی) نماز پڑھیں۔اور اس کے لیے دعائے مغفرت کریں۔ نبی صلعم نے اس کو اپنا کرتہ عنایت کیا۔اور فرمایا کہ مجھے خبر دینا تو میں نماز پڑھا دوں گا۔جب آپ نے اس پر نماز پڑھنے کا ارادہ کیا تو عمرؓ نے آپ کو کھینچا اور کہا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو منافقین پر نماز پڑھنے سے منع کیا ہے۔(۹/۸۰) آپ نے فرمایا مجھے دونوں باتوں کا اختیار دیا گیا ہے (یعنی اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ) تم ان کے لیے دعائے مغفرت کرو یا نہ کرو۔اگر تم ان کے لیے ستر بار بھی دعائے مغفرت کرو گے تو بھی اللہ تعالیٰ انہیں نہیں بخشے گا۔چنانچہ آپ نے اس پر نماز پڑھی تو یہ آیت اتری (ولا تصل علی احد منهم مات ابدا (۹/۸۴) اور ان میں سے کسی پر کبھی بھی نماز نہ پڑھنا جب کہ مر جائیں۔(مترجم بخاری شریف مطبوعہ قرآن محل کراچی جلد اول صفحہ ۴۸۵)

دیکھا آپ نے!

یہ ہے بخاری شریف کی پیش کردہ رسولی تفسیر کا نمونہ کہ آیت مجیدہ ''استغفر لهم او لا تستغفر لهم کے انداز بلاغت سے حضرت عمرؓ تو سمجھ جائیں کہ آنحضور کو منافقین کے لیے دعائے مغفرت کرنے یا نہ کرنے کا اختیار نہیں دیا گیا۔بلکہ ان کے لیے دعاء مغفرت کرنے سے مطلقاً منع کر دیا گیا ہے لیکن خود صاحب قرآن'قرآنی انداز فصاحت و بلاغت سے الٹا مفہوم اخذ فرمائیں کہ ''''استغفر لهم او لا تستغفر لهم'' کے الفاظ میں آپ کو منافقوں کے لیے طلب مغفرت کرنے یا نہ کرنے کے دونوں اختیار عطا فرمائے گئے ہیں۔اور اس الٹ مفہوم کی بنا پر حضرت عمرؓ کے منع کرنے' بلکہ مصلے پر سے کھینچنے کے باوجود ۹/۸۰ کی مخالفت کا ارتکاب کر بیٹھیں۔اور اس پر اللہ تعالیٰ حضرت عمرؓ کے فہم قرآن کی تصدیق'اور معاذ اللہ معاذ اللہ ثم معاذ اللہ معاذ اللہ آپ کے فہم قرآن کی تکذیب کرتے ہوئے'اس امر کی وضاحت کے لیے کہ آپ ۹/۸۰

کا مفہوم نہیں سمجھ پائے یہ آیت نازل کرے:

ولا تصل علیٰ احد منھم مات ابدا ۸۴/۹.

اور منافقوں میں سے کوئی مر جائے تو اس پر کبھی بھی صلوٰۃ (دعاء میت) نہ فرمانا۔ اور اس کی قبر پر بھی کبھی کھڑے نہ ہونا۔ **ولا تقم علیٰ قبرہ ط ۸۴/۹**

المختصر: ابتدا میں واضح کیا جا چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قیامت تک کی نوع انسانی کے لیے ضابطہ حیات کے طور پر جو آخری کتاب قرآن حکیم، رسول عربی علیہ السلام کے ذریعہ نازل فرمائی ہے اس کی تفصیل و تفسیر خود اس کے اندر ہی موجود و محفوظ کر دی گئی ہے کتب روایات اس کی نہ تفسیر ہیں نہ تفصیل۔ اور مروجہ تراجم و تفاسیر میں باہمی اختلاف، اور ہر ایک کے اندر شکمی تضاد کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فہمید قرآن کے جو اصول و قواعد خود واضح کیے ہیں ان پر توجہ دینے کی بجائے روایات کے اس ذخیرے کو قرآن کریم کی رسولی تفسیر تسلیم کر لیا گیا ہے جس سے امت میں فرقہ بندی نے راہ پائی ہے اور وہ ہر فرقہ کے لیے رسولی تفسیر کے نام سے اس کی ضرورت کا مواد مہیا کرتا ہے۔ اگر فہمید قرآن کے قرآنی اصول و قواعد نگاہوں سے اوجھل نہ ہوتے۔ اور قرآن کریم کی تفسیر کے لیے تفسیر القرآن بالقرآن کے انداز پر عمل کیا جاتا۔ تو نہ امت میں فرقوں کا وجود پیدا ہوتا۔ اور نہ ایک ایک آیت کے متعدد مختلف اور متضاد معنی لیے جاتے۔

ایک اہم نوٹ:

ذیل میں قرآن فہمی کے قرآنی اصول و قواعد قرآنی دلائل و براہین کے ساتھ بالترتیب نمبر وار بیان کئے جا رہے ہیں۔ اور قارئین تفسیر القرآن بالقرآن پر واضح کیا جاتا ہے کہ اس ترجمہ اور تفسیر میں تفسیر بالرائے کو ہرگز ہرگز راہ نہیں دی گئی، ہر مقام پر فہمید قرآن کے قرآنی اصول و قواعد کی حدود و قیود کی پوری پوری پابندی کی گئی ہے۔

حسبنا اللہ و نعم الوکیل ○ ۳/۱۷۳ نعم المولیٰ و نعم النصیر ○ ۸/۴۰

اب ملاحظہ فرمائیں خود قرآن کریم کے آئینے میں قرآن فہمی کے قرآنی اصول و قواعد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قرآن فہمی کے قرآنی اصول وقواعد

ا۔ قرآن کی زبان عربی مبین ہے۔

ارشاد باری ہے:

انا جعلنه قرءٰنا عربیا لعلکم تعقلون ۝ ۴۳/۳

(مفہوم) بے شک ہم نے اس (اپنی نازل کردہ کتاب) کا پڑھنا عربی (شستہ) زبان میں ٹھہرایا ہے تاکہ تم سمجھ سکو۔

نیز فرمایا:

وانہ لتنزیل رب العلمین ۝ نزل بہ الروح الامین ۝ علی قلبک لتکون من المنذرین ۝ بلسان عربی مبین ۝ ۱۹۲ تا ۲۶/۱۹۵

اور بے شک قرآن کریم کا نازل کیا جانا' واضح اور شستہ عربی زبان میں رب العلمین کی طرف سے ہے۔ روح الامین اسے لے کر آپ کے قلب اطہر پر نازل ہوا۔ تاکہ آپ انبیاء کی اس مقدس جماعت میں سے ہو جائیں' جو نوع انسانی کو ان کے فرائض منصبی سے آگاہ کرنے والی تھی۔

فلہٰذا قرآن فہمی کا پہلا اصول یہ ہے کہ عربی زبان کے اصول وقواعد' اس کے سہ حرفی مادوں' اور عربی کریمہ کو ہرگز ہرگز نظر انداز نہ کیا جائے۔ اس ترجمہ اور تفسیر میں ان امور کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔

قرآن کریم زمانہ جہالت کے لٹریچر کا محتاج نہیں۔

آیات بالا کے ان الفاظ سے کہ قرآن ایسی واضح عربی میں نازل ہوا ہے جو خود مبین ہے یہ امر نکھر کر عیاں ہو رہا ہے کہ قرآن کی عربی میں نہ کوئی ابہام ہے نہ لسانی پیچیدگی ہے۔ ایسی زبان مرکزی شہروں کی ہوتی ہے۔ جہاں علم و ادب کے چرچے رہتے ہیں۔ دیہاتی اور بدوانہ زبان کو لسان عربی مبین ہرگز ہرگز نہیں کہا جا سکتا۔ قرآن کریم نازل ہوا تھا ام القری مکہ معظمہ کی مرکزی بستی میں۔ لہذا شہری (مرکزی) زبان ہی عربی مبین' شستہ اور واضح کہلا سکتی ہے۔ اس کے برعکس بدوانہ زبان کی حالت آج کے ترقی پذیر دور میں بھی یہ ہے کہ ہر دیہاتی زبان میں شستگی کی بجائے اکھڑ پن پایا جاتا ہے اور تبیین کی بجائے ابہام ہوتا ہے۔ فلہذا یہ نظریہ قرآن کریم کی میزان پر پورا نہیں اترتا کہ فہم قرآن زمانہ جہالت کے بدوانہ لٹریچر اور اشعار کا محتاج ہے۔

قرآن کریم کے سات قرءتوں میں نازل ہونے کا تصور قابل قبول نہیں۔

کتاب خداوندی کی ایک ہی زبان ہے عربی مبین ۱۹۵/۲۶' جو اپنی صفت مبین کے مطابق سو فیصدی فصیح و بلیغ اور ہر قسم کی لسانی پیچیدگیوں سے مبرا اور منزہ ہے فلہذا روایات کا دیا ہوا یہ تصور بھی قابل قبول نہیں کہ قرآن کریم عربوں کے سات قبیلوں کی الگ الگ سات زبانوں' یعنی سات قرءتوں میں نازل ہوا تھا۔ اور ان قرءتوں میں معاذ اللہ معاذ اللہ اس قدر لفظی اور معنوی اختلافات موجود تھے کہ ایک قرءت والے دوسری قرءت کو سننے کی تاب بھی نہیں لا سکتے تھے جیسے کہ بخاری شریف کتاب التوحید باب قال اللہ تعالی فاقرءوا ما تیسر من القران ۲۰/۳۷ کی رسولی تفسیر' حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے حضرت ہشامؓ کو سورہ فرقان کی تلاوت ایسے الفاظ میں کرتے ہوئے سنا کہ نماز ہی میں ان پر حملہ کرنے کو تیار ہو گئے۔ روایت کے اصل الفاظ یہ ہیں:

یحیٰ بن بکیر لیث' عقیل' ابن شہاب' عروہ' مسور بن مخرمہ' عبدالرحمن بن عبدالقاری' دونوں حضرت عمر بن [illegible] سے روایت کرتے ہیں کہ ان کو بیان کرتے ہوئے سنا کہ میں نے ہشام بن حکیم کو آنحضرت کی زندگی میں سورۂ فرقان پڑھتے ہوئے سنا تو دیکھا کہ وہ بہت سے ایسے

حروف کے ساتھ پڑھ رہے تھے جو رسول اللہ نے مجھے نہیں پڑھائے تھے۔ قریب تھا کہ میں نماز ہی میں ان پر حملہ کر دوں لیکن میں نے صبر کیا یہاں تک کہ انہوں نے سلام پھیرا تو میں نے چادر ان کے گلے میں ڈال دی اور کہا تجھے یہ سورت کس نے پڑھائی ہے انہوں نے کہا رسول اللہ سلام علیہ نے پڑھائی ہے میں نے کہا جس طرح تم پڑھتے ہو مجھے تو اس طرح نہیں پڑھایا ہے چنانچہ میں ان کو کھینچتا ہوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے گیا۔ اور عرض کیا کہ میں نے ان کو سورۃ فرقان ان طریقوں پر پڑھتے ہوئے سنا ہے۔ جو آپ نے مجھے نہیں پڑھائے- آپ نے فرمایا کہ اسے چھوڑ دو۔ پھر فرمایا کہ اے ہشام پڑھو جس طرح میں نے ان کو پڑھتے ہوئے سنا تھا۔ انہوں نے اسی طرح پڑھا۔ نبی کریم سلام علیہ نے فرمایا کہ قرآن اسی طرح نازل کیا گیا ہے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے عمرؓ تم پڑھو۔ چنانچہ جس طرح آپ نے مجھے پڑھایا تھا اسی طرح میں نے پڑھا۔ آپ نے فرمایا کہ قرآن اسی طرح نازل کیا گیا ہے یہ قرآن سات طریقوں پر اترا ہے جو تم سے آسانی سے ہو سکے پڑھو۔ (بخاری شریف مطبوعہ قرآن محل کراچی جلد سوم صفحہ ۹۲۳)

برادران عزیز! کرۂ ارض کے گرد گھوم جایئے۔ آپ دیکھیں گے کہ ہر زبان میں شہری اور دیہاتی کا فرق موجود ہے ہر تیس چالیس میل کے بعد زبان کے صرف لب ولہجہ اور طرز بیان ہی میں فرق نہیں آتا بلکہ الفاظ وحروف بھی مختلف ہو جاتے ہیں لیکن کسی زبان میں الفاظ وحروف کا لاکھ اختلاف موجود ہو مگر اس زبان والوں کی تعزیرات وقوانین اس اکلوتی مرکزی زبان ہی میں ہوتے ہیں جس کے گرد اس زبان کا علم وادب گردش کرتا ہے یہی حال عربی زبان کا ہے اس میں بھی مدنی اور بدوی یعنی شہری اور دیہاتی کا فرق موجود ہے وہاں بھی ہر تیس چالیس میل کے بعد لب ولہجہ اور الفاظ وحروف تک کا تغیر پایا جاتا ہے چنانچہ آیات بالا ۲/۴۳ اور ۱۹۲ تا ۲۶/۱۹۵ میں اسی چیز کی خبر دی گئی ہے کہ عربی زبان اگر چہ سنت اللہ کے مطابق مختلف زبانوں میں بٹی ہوئی ہے لیکن ہم نے اپنے قانون کی کتاب عربی مبین' شستہ اور واضح مرکزی زبان میں نازل فرمائی ہے۔ فلہٰذا مندرجہ بالا روایت کا مقصد عیاں ہے کہ اگر اسے حدیث رسول مانا جائے تو قرآن کریم پایۂ اعتبار سے گر جاتا ہے کہ یہ سات قسم کے مختلف ومتضاد الفاظ میں نازل ہوا تھا جو الفاظ تم خود چاہو اختیار کر لو۔

حالانکہ **جعلنہ قرءٰ نا عربیا**۳/۴۳ اور **لتنزیل رب العلمین...... بلسان عربی مبین**○ ۱۹۲۔۱۹۵/۲۶ کی قرآنی شہادت کے مطابق ثابت و بین ہے کہ قرآن کے الفاظ نزولی ہیں خود اختیاری نہیں۔اور ایک ہی زبان عربی مبین میں نازل ہوئے ہیں۔تو پھر یہ نظریہ کس طرح صحیح تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ قرآن سات قسم کے مختلف الفاظ میں نازل ہوا تھا۔یعنی روح الامین قرآنی آیات کریمات کو سات قسم کے الگ الگ الفاظ میں آنحضور کے پاس لاتے تھے۔اور حضور ایک ہی آیت حضرت ہشامؓ کو کسی اور الفاظ میں پڑھاتے تھے اور حضرت عمرؓ کو کسی اور الفاظ میں۔العیاذ باللہ!

۲۔ الفاظ کی حاکمیت ہمیشہ ہمیشہ قائم رکھی جائے گی۔

جیسا کہ اوپر ثابت کیا جا چکا ہے کہ ۲/۴۳ اور ۱۹۲۔۱۹۵/ ۲۶ کے مطابق قرآن کا نزول عربی زبان میں ہوا تھا۔اور ظاہر ہے کہ زبان مشتمل ہوتی ہے الفاظ پر۔اور قرآن کے الفاظ خود اختیاری نہیں بلکہ نزولی ہیں۔نیز ظاہر ہے کہ معانی اور مفہوم الفاظ ہی کے ہوتے ہیں۔اور وہ خود الفاظ ہی کے اندر موجود و محفوظ ہوتے ہیں۔فلہٰذا:

قرآن فہمی کا دوسرا اصول یہ ہے کہ ہر مقام پر خداوند حکیم و حاکم کے نازل کردہ الفاظ کی حاکمیت قائم رکھی جائے۔بحمد اللہ کہ اس ترجمہ و تفسیر میں کسی ایک لفظ کے ترجمہ اور مفہوم سے پہلو تہی نہیں کی گئی۔سوائے ان حروف جارہ کے جو عربی ادب میں قواعد عرب کے مطابق زائد لائے جاتے ہیں۔مثلاً:

لست علیھم بمصیطر○ ۲۲/۸۸ میں **بمصیطر** کی ب' قاعدۂ عرب کے مطابق زائد ہے اس کا صحیح مفہوم یہ نہیں ہے کہ: اے رسول آپ لوگوں کے لیے کسی داروغہ کے ساتھ نہیں؟ بلکہ صحیح مفہوم یہ ہے کہ: آپ لوگوں کے لیے کوئی داروغہ نہیں ہیں۔نیز قرآن کی زبان میں جو ضمائر کا تکرار ہے ان کا ترجمہ بلا تکرار کیا گیا ہے۔مثلاً **انا نحن نزلنا علیک القران** ۲۳/۷٦ میں ضمیر جمع متکلم کا سہ گانہ تکرار تاکیدی ہے۔اس کا ترجمہ اس طرح نہیں کیا گیا کہ: قرآن کو بے شک ہم نے ہم نے ہم نے نازل کیا ہے۔بلکہ غرض تکرار کو نمایاں کرتے ہوئے ترجمہ لکھا گیا

ہے: بلاشبہ قرآن کو ہم ہی نے نازل کیا ہے۔

نیز الفاظ کی حاکمیت کو قائم رکھتے ہوئے اس ترجمہ اور تفسیر میں کسی لفظ کا وہ مفہوم بھی ہرگز نہیں لیا گیا جو الفاظ کی حدود و قیود سے بے نیاز ہو کر لفظی حدود کو توڑ کر رکھ دے۔ مثلاً سابقہ تراجم میں ۱۱/۴ کے الفاظ "فوق اثنتین" کا معنی لیا گیا ہے دو یا دو سے زائد لڑکیاں۔

۳۔ قرآن کریم اہل عرب کی روزمرہ کی بول چال کے عین مطابق ہے۔

ارشاد باری ہے:

فورب السماء والارض انه لحق مثل ماانکم تنطقونo ۲۳/۵۱

(مفہوم) آسمان اور زمین (بلندی اور پستی) کے پروردگار کی شہادت ہے کہ بلاشبہ قرآن حق ہے۔ اس کا انداز کلام اس طرح کا ہے جس طرح تم آپس میں گفتگو کرتے ہو۔ فلہٰذا اس آیت مجیدہ سے ثابت ہوتا ہے کہ جس طرح روزمرہ کی عام بول چال حقیقت و مجاز اور استعارات و تشبیہات ہر چیز کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہوتی ہے۔ اسی طرح قرآن حکیم میں حقیقت و مجاز اور استعارہ و تشبیہ سب کچھ موجود ہے۔

پس قرآن فہمی کا تیسرا اصول یہ ہے کہ قرآن کریم کو روزمرہ کی بول چال کے عین مطابق تسلیم کیا جائے۔ (اس اصول کی تشریح چوتھے پانچویں اور چھٹے اصول میں ملاحظہ فرمائیں)

۴۔ الفاظ کا استعمال باندازِ مجاز۔

فہم قرآن کے سلسلے میں عموماً حقیقت و مجاز کے عدم امتیاز کی بدولت ٹھوکر کھائی گئی ہے حالانکہ معارضہ مشاہدات اس کی بہترین کسوٹی ہے جیسے کہ بنی اسرائیل کے متعلق آیا ہے:

واشربوا فی قلوبھم العجل ۲/۹۳۔

(لفظی ترجمہ) ان کے قلوب میں بچھڑا پلا دیا گیا۔

اب ظاہر ہے کہ اگر ان الفاظ کو حقیقت پر محمول کیا جائے تو تجربہ اور مشاہدہ معارض ہے کیونکہ

حقیقت یہ نہیں ہے کہ بچھڑے کو گھول کر یا اس کی یخنی بنا کر اور بنی اسرائیل کے قلوب کا اپریشن کر کے اس میں یخنی انڈھیل دی گئی تھی۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ سامری نے عقیدے کے طور پر بچھڑے کی معبودیت بنی اسرائیل کے ذہنوں میں جاگزیں کر دی تھی پس ثابت ہوا کہ:

قرآن کریم میں الفاظ کا استعمال حقیقت کے علاوہ باندازِ مجاز بھی موجود ہے

فلہذا قرآن فہمی کا چوتھا اصول یہ ہے کہ جہاں الفاظ کے حقیقی معنی مشاہدات سے معارض ہوں وہاں دیکھ لیا جائے کہ کیا یہ الفاظ باندازِ مجاز تو استعمال نہیں ہوئے؟ تا کہ قرآن کریم کے اصل مفہوم سے ہٹ کر کسی چیستانی مفہوم کی لق و دق وادیوں میں ٹھوکریں نہ کھانی پڑیں۔

۵۔ تشبیہات حرف تشبیہ مذکور اور محذوف کے ساتھ۔

عربی زبان میں کاف حرف تشبیہ ہے جو مشبہ کے ساتھ آ کر کسی ایک صفت میں مشبہ بہ کے ساتھ اس کی مشابہت کا اظہار کرتا ہے۔ جیسے کہ سورہ مدثر میں منکرین ضابطہ خداوندی کے متعلق ارشاد ہوا ہے:

فمالهم عن التذكرة معرضين ٥ كانهم حمر مستنفرة ٥ فرت من قسورة ٥ ۴۹ تا ۷۴/۵۱ (مفہوم) انہیں کیا ہو گیا ہے کہ یہ قرآن سے جو ایک نصیحت نامہ ہے اس طرح اعراض کرتے ہیں گویا کہ وہ بدکے ہوئے گدھے ہیں جو شیر سے بھاگتے ہیں۔ دیکھئے یہاں قرآن کو تشبیہاً شیر اور منکرین قرآن کو گدھے کہا گیا ہے۔ نہ وہ فی الحقیقت چار ٹانگوں اور لمبے کانوں والے گدھے تھے اور نہ قرآن کریم چنگھاڑنے اور پھاڑ کھانے والا شیر ہے۔ چونکہ گدھا شیر سے بدکتا ہے اور منکرین ضابطہ خداوندی قرآن کریم سے بکدتے ہیں اس لیے اس مشابہت کی بنا پر کاف حرف تشبیہ لا کر انہیں گدھے اور قرآن کو شیر کہا گیا ہے۔ لیکن یاد رہے کہ بعض مقامات پر قرآن کریم میں حرف تشبیہ محذوف و مقدر رکھا جاتا ہے جیسے کہ منافقوں کے متعلق ارشاد ہوا ہے:

صم بكم عمى فهم لا يرجعون ٥ ١٨ / ٢ اس کا لفظی ترجمہ یہ ہے۔ کہ وہ گونگے ہیں، بہرے ہیں، اندھے ہیں۔ حالانکہ فی الحقیقت نہ وہ گونگے ہوتے ہیں نہ بہرے نہ اندھے۔ چونکہ

وہ گونگوں بہروں اور اندھوں کی طرح حقائق سے بے خبر رہتے ہیں اس لیے اس مشابہت کی بنا پر انہیں گونگے بہرے اور اندھے کہا گیا ہے اور اس کی وضاحت آیت ذیل میں کردی گئی ہے:

لھم قلوب لا یفقھون بھا ولھم اعین لا یبصرون بھا ولھم اذان لا یسمعون بھا ۷/۱۷۹

(مفہوم) ان کے پاس قلوب ہیں مگر ان کے ساتھ تفقہ نہیں کرتے۔ان کے پاس آنکھیں ہیں ان سے دیکھتے نہیں۔ان کے پاس کان ہیں ان سے سنتے نہیں اس آیت مجیدہ نے اس امر کی تفسیر وتشریح کردی ہے کہ ۲/۱۸ میں جنہیں گونگے بہرے اور اندھے کہا گیا ہے وہ فی الحققت گونگے بہرے اور اندھے نہیں' انہیں گونگوں بہروں اور اندھوں کے ساتھ مشابہت کی بنا پر کاف تشبیہ محذوف رکھ کر کہا گیا ہے کہ وہ گونگوں جیسے ہیں' بہروں جیسے ہیں اور اندھوں جیسے ہیں پس قرآن فہمی کا پانچواں اصول یہ ہے کہ:

قرآن حکیم میں تشبیہات کا انداز حرف تشبیہ مذکور کے ساتھ بھی ہے اور محذوف کے ساتھ بھی۔

۶۔ استعارات کا استعمال۔

روزمرہ کی بول چال میں جہاں حقیقت' مجاز اور تشبیہات کا استعمال کیا جاتا ہے وہاں الفاظ استعارات کے طور پر بھی بولے جاتے ہیں۔سورۂ دہر میں جنتی معاشرہ کے نوخیز بچوں کے لیے یہ الفاظ آئے ہیں: **اذا رایتھم حسبتھم لؤلوء منثورا ۷۶/۱۹**

(مفہوم) اے مخاطب جب تو ان (مسرور' خوش باش اور تابندہ چہروں والے) بچوں کو چلتا پھرتا دیکھے تو گمان کرے کہ یہ درخشندہ اور تابناک جواہرات بکھرے ہوئے ہیں۔یعنی ان کے چہرے ناہموار معاشرہ کے بچوں جیسے مضمحل اور اداس و پریشان نہیں ہوں گے۔دیکھئے گا! یہاں لؤلؤا منثورا سے تازگی شگفتگی اور درخشندگی مستعار لی گئی ہے ورنہ ان الفاظ کے حقیقی معنوں کے مطابق ان بچوں کے متعلق یہ نہیں کہا گیا کہ وہ فی الحقیقت جواہرات یعنی پتھر کے بنے ہوئے ہوں گے۔ پس قرآن فہمی کا چھٹا اصول یہ ہے کہ:

قرآن حکیم میں حقیقت مجاز اور تشبیہات کے ساتھ ساتھ استعارات بھی موجود ہیں ۔

فلہٰذا اللہ تعالیٰ کے خود واضح کردہ اصول کے مطابق کہ قرآن کریم روزمرہ کی بول چال کے عین مطابق ہے ۲۳/۵۱ اس ترجمہ وتفسیر میں ہر اس مقام پر جہاں الفاظ کے حقیقی معنی مراد لینے میں مشاہدات معارض ہیں' وہاں مجازی تشبیہی یا استعاراتی معنی لیے گئے ہیں۔ اور کسی بھی مقام پر کسی چیستانی تصور کو قریب تک پھٹکنے نہیں دیا گیا۔ جو مشاہدات وتجربات کے خلاف ہو۔

۷۔ قرآن حکیم اللہ کا قول اور کائنات اس کا فعل ہے اللہ کے قول و فعل میں تضاد وتخالف ہرگز نہیں۔

یہ ایک عالمگیر مسلمہ ہے کہ خود انسانوں میں بھی معقول انسان کی پہچان یہ ہے کہ اس کے قول اور فعل میں تضاد وتخالف نہیں ہوتا تو اس طرح خداوند عالم' صاحب شرف ومجد کے متعلق تو اس امر کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا کہ اس کا کوئی قول اس کے کسی فعل کے خلاف ہو۔ قرآن کریم میں اس امر کی وضاحت بانداز ذیل کی گئی ہے:

خلق السموات و الارض بالحق ۶۴/۳ ۔

اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو بالحق پیدا فرمایا ہے۔

نزل علیک الکتب بالحق ۳/۳ ۔

اے رسول! اللہ نے آپ پر اپنی کتاب بالحق نازل فرمائی ہے۔

دیکھیے گا! ان آیات کریمات میں بالصراحت بتا دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فعل کائنات بھی بالحق ہے اور اس کا قول قرآن بھی بالحق ہے اب چونکہ حق' حق کا مخالف ہرگز ہرگز نہیں ہوتا پس ثابت ہوا کہ قرآن اور کائنات یعنی اللہ تعالیٰ کا قول وفعل باہم موافق ہیں مخالف نہیں بالفاظ دیگر قرآن کریم کی کوئی آیت' کتاب کائنات کی کسی آیت کے خلاف ہرگز نہیں اور اسی طرح کتاب کائنات کی کوئی آیت قرآن کریم کی کسی آیت کی مخالف نہیں۔

مثلاً ارشاد باری ہے: الم تر ان اللہ انزل من السماء ماء ج فاخرجنا بہ ثمرات

مختلفا الوانہا ۲۷/۳۵

اے مخاطب کیا تو نے غور نے نہیں کیا' یعنی تجھے غور کرنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ آسمان سے پانی نازل کرتا ہے پھر ہم اس کے ساتھ مختلف رنگوں کے میوہ جات پیدا کرتے ہیں۔ یہ ہے اللہ تعالیٰ کا قول جو نزل علیک الکتب بالحق ۳/۳ کی قرآنی شہادت کے مطابق حق ہے۔ اور آسمان سے عملی طور پر پانی برسانا اور اس کے ساتھ انواع واقسام کے میوہ جات پیدا کرنا۔ جو اس کائنات میں بشکل مشہور موجود ہے۔ خلق السموت والارض بالحق ۳/۶۴ کے مطابق حق ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے۔ اور یہ اس کا فعل ہے۔ اور یہ باہم موافق ہیں ایک دوسرے کے مخالف نہیں۔

پس قرآن فہمی کا ساتواں اصول یہ ہے کہ اس کی کوئی آیت کتاب کائنات کے مخالف ہرگز نہیں۔

فلہٰذا اس ترجمہ وتفسیر میں قرآن کریم کی کسی بھی آیت کا مفہوم کتاب کائنات کی کسی آیت کے خلاف نہیں لیا گیا۔ اور قرآن کریم کے جن الفاظ کے حقیقی معنی کتاب کائنات کے مخالف جاتے ہوں۔ اصول نمبر ۳ کے مطابق ان کے وہ مجازی' تشبیہاتی یا استعاراتی معنی لیے گئے ہیں۔ جو کتاب کائنات کے عین موافق ہیں پس قرآن فہمی کے اصول زیر نظر کے مطابق قرآن کریم میں کسی چیستانی تصور کو داخل نہیں ہونے دیا گیا جس سے قرآن وکائنات میں تضاد پایا جائے۔

۸۔ قرآن ایک مفصل کتاب ہے مجمل نہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اسی ذات اقدس واطہر کی زبان فیض ترجمان سے جس کے قلب اطہر پر قرآن کریم نازل ہوا تھا۔ (۲/۹۷) اس امر کا اعلان کروا دیا ہے کہ یہ کتاب مجید مفصل ہے مجمل ہرگز نہیں۔

افغیر اللہ ابتغی حکما وھو الذی انزل الیکم الکتاب مفصلا ۶/۱۱۴

(مفہوم) (صاحب قرآن! کہہ دیجئے گا کہ لوگو!) کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور حاکم تلاش کروں۔ حالانکہ اس نے اپنا حکم نامہ تمہاری طرف ایک مفصل کتاب کی صورت میں نازل کر دیا ہے۔ نیز اس امر کا اعلان بھی صراحتاً کر دیا گیا ہے کہ اس کتاب مقدس کی تفصیل وتشریح بھی خود ہم نے کر دی ہے:

قد فصلنا الایت لقوم یفقھون ٥ ٦/٩٨ بے شک ہم نے تفقہ کرنے والوں کے لیے اپنی آیتوں کی تفصیل خود کر دی ہے اپنی کتاب کی خود تفصیل کرنے کے ضمن میں یہ مسلمہ آپ دیباچہ کے شروع میں ملاحظہ فرما چکے ہیں کہ کسی کتاب کی تفسیر و تفصیل وہ شخص کر سکتا ہے جو علم کے لحاظ سے یا تو صاحب کتاب سے افضل ہو اور یا کم از کم صاحب کتاب کی علمی سطح کا مالک ہو لیکن قرآن حکیم چونکہ کتاب ہے اللہ تعالیٰ کی اور دنیا کے کسی فرد و بشر کا علم کی رو سے اللہ تعالیٰ سے افضل ہونا تو درکنار اس کی علمی سطح تک پہنچنا بھی ناممکن ہے اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کی تفصیل خود کر دی ہے فلہذا اپنے داخلی شواہد کے مطابق قرآن کریم مجمل نہیں مفصل ہے اور خود اللہ تعالیٰ کا تفصیل کردہ ہے۔ اس لیے زیر نظر ترجمہ و تفسیر کی عمارت اس قرآنی مسلمہ کی بنیادوں پر قائم ہے کہ قرآن کریم مفصل ہے مجمل ہرگز نہیں۔ فلہذا قرآن فہمی کا آٹھواں اصول یہ ہے کہ:

قرآن حکیم اپنی تفصیل کے لیے کسی غیر اللہ کتاب کا محتاج نہیں۔

(نوٹ) اسی چیز کی تفصیل نویں، دسویں اور گیارہویں اصول میں بھی ملاحظہ فرمائیں۔

۹۔ قرآن کریم خود مبین ہے۔

دعویٰ خداوندی ہے کہ:

قرآن کریم ہر چیز (ہر مسئلہ) کی تبیین و تشریح خود کرتا ہے دیکھیے! خود صاحب قرآن سلام علیہ کو مخاطب کر کے اعلان کیا گیا ہے:

ونزلنا علیک الکتب تبیاناً لکل شیء و ھدی و رحمة و بشری للمسلمین ٥ ١٦/٨٩ اور اے رسول! ہم نے آپ پر اپنی کتاب نازل فرمائی ہے جو ہر مسئلے کی خود وضاحت کرنے والی ہے اور فرمانبرداروں کے لیے ہدایت، رحمت اور بشارت ہے۔

اب یہاں پہنچ کر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن حکیم کو اس کے اپنے دعویٰ تبیانا لکل شی کے خلاف روایات کا محتاج قرار دینا اور آیات قرآنی کی تبیین و تشریح کے لیے پہلے تو متوفی بزرگوں کے متضاد و متخالف بیانات کے ڈھیر جمع کرنا، کہ بیضاویؒ نے یہ کہا ہے اور بغویؒ نے یہ لکھا ہے۔ رازیؒ نے یہ فرمایا ہے اور ابن کثیرؒ کی یہ رائے ہے۔ اور اس کے بعد کسی ایک کی رائے کی تائید

کرنا کس حد تک صحیح ہوسکتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ عرصہ دراز سے حالت یہ ہے کہ کوئی مترجم و مفسر ہاروت و ماروت کو شیطان قرار دے رہا ہے اور کوئی فرشتے بتاتا ہے۔

اس کے جواب میں مودبانہ التماس کی جاتی ہے کہ آیت مجیدہ ۸۹/۱۶ کی مخالفت کر کے غیر اللہ کتابوں کو قرآن کریم کی تفسیر و تشریح قرار دینے میں سہارا لیا جاتا ہے اس نظریے کا کہ رسول کریم قران کریم کے مفسر و مبین ہیں۔ حالانکہ ابتدائے مضمون ہی میں واضح کیا جا چکا ہے۔ چونکہ دنیا کا کوئی فرد و بشر اللہ تعالیٰ کے غیر محدود علم کی برابری کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ اس لیے اس کی کتاب کا کوئی شخص مفسر و مبین نہیں ہوسکتا اپنی کتاب کا مفسر و مفصل وہ آپ ہے لیکن حضور رسالت مآب کو کتاب مجید کا مفسر قرار دینے والے اپنے اس اصول پر بھی قائم نہیں رہتے اور رسول مقبول کے ذریعہ تبیانا لکل شی کا قرآنی حصار توڑ کر پھر اس میں بغویؒ بیضاویؒ ابن اثیرؒ اور ابن کثیرؒ وغیرہم کو داخل تو کر لیا جاتا ہے لیکن افسوس ہے کہ ایک ایک آیت کی متعدد اور مختلف و متضاد تفسیریں پیش کر کے تفسیر قرآن کے خواب کو پریشان سے پریشان تر کر کے رکھ دیا گیا ہے۔

لیکن حقیقت یہی ہے کہ ۸۹/۱۶ کے داخلی دعوے کے مطابق قرآن کریم سو فیصدی نہیں بلکہ کئی سو فیصدی تبیانا لکل شی ہے۔ کیونکہ اگر اسے اس کے اس دعویٰ کے خلاف تبیانا لکل شی نہ مانا جائے تو نہ یہ ہدایت ثابت ہوتا ہے نہ رحمت و بشارت ٹھہرتا ہے۔ کیونکہ ۸۹/۱۶ میں معطوف معطوف علیہ کی صورت میں کہا گیا ہے کہ قرآن کریم تبیانا لکل شی وھدی و رحمۃ و بشری للمسلمین ہے۔ اہل قواعد سے یہ امر مخفی نہیں کہ معطوف معطوف علیہ کے حکم میں ہوتا ہے۔ تو اس طرح جب قرآن کریم سو فیصدی ہدایت رحمت اور بشارت ہے تو سو فیصدی تبیانا لکل شی کیوں نہیں؟ کاش کہ عربی قواعد ہی کا پاس کرتے ہوئے کتاب خداوندی کو اسی طرح لامحتاج الی الغیر تسلیم کیا جائے جس طرح خود صاحب کتاب اللہ تعالیٰ کو لامحتاج الی الغیر تسلیم کیا جاتا ہے۔

ایک ضمنی سوال کا جواب۔

کہا جاتا ہے کہ سینکڑوں مسائل ایسے ہیں جن کا جواب دینے سے قرآن قاصر ہے یعنی یہ نہیں بتاتا کہ کس طرح کھاؤ کس طرح پیو کس طرح اٹھو کس طرح بیٹھو لباس کونسا پہنو حجامت کس وضع

کی بناؤ۔ نماز کس طرح پڑھو۔ کتنے وقت پڑھو اور اس میں کیا پڑھو۔ الگ الگ وقتوں کی کتنی کتنی رکعتیں ادا کرو۔ زکوٰۃ کا نصاب کیا ہے اور مقدار کیا؟ حج کس طرح ادا ہوگا؟ میت کو غسل کس طرح دیا جائے گا؟ جنازہ کس طرح ہوگا؟ بچہ پیدا ہو تو اس کے کان میں اذان کہنے کی خبر قرآن میں نہیں ہے۔ قرآن نکاح باندھنے کا طریقہ نہیں بتاتا۔ طریقہ طلاق کی وضاحت نہیں کرتا وغیرہ۔

اس قسم کے سوالات کرنے میں وہی ذہن کارفرما ہوتا ہے جو قرآن کریم کو ناکافی' نامکمل اور مجمل و گونگا ماننے کے ساتھ ساتھ دائرۂ اسلام کو اس قدر محدود اور سمٹا سکڑا ہوا تسلیم کرتا ہے جو جغرافیائی تقاضوں کا خیال بھی نہ رکھے اور انسان کی انفرادی پسند اور شخصی آزادی تک کو بھی سلب کر لے۔ یعنی اتنی شدید پابندیاں عائد کر دے کہ کھاؤ تو یوں' پیو تو یوں' اٹھو تو اس طرح' بیٹھو تو اس طرح' لیٹو تو اس پہلو۔ سوو تو اس کروٹ' بیت الخلاء میں داخل ہو تو یہ پڑھو۔ باہر آؤ تو یہ دہراؤ۔ یاد رہے! قرآن کریم چونکہ **ھدی للعلمین** ہے۔ رسول مقبول چونکہ دنیا بھر کے رسول ہیں اور اسلام چونکہ عالمگیر دین ہے اس لیے نہ اس میں بے جا پابندیوں کی قید ہے' نہ تو ہماتی جکڑ بندیوں کا گزر۔ اس میں صاف صاف کہہ دیا گیا ہے کہ واجب الاتباع صرف ماانزل اللہ یعنی قرآن کریم ہے۔ (۷/۳) اور اسی کی تائید ۲۸/۸۵ میں کی گئی ہے: **ان الذی فرض علیک القران لرادک الی معاد** اے رسول! وہ ذات مقدس جس نے آپ پر قرآن فرض کیا ہے وہ آپ کو وعدہ گاہ (قیامت) کی طرف لے جانے والا ہے۔ بالفاظ دیگر **ما انزل اللہ** یعنی قرآن کریم ہی آنحضور اور امت مسلمہ پر فرض کیا گیا ہے اور قیامت کو بازپرس بھی قرآن کریم ہی کے متعلق ہو گی۔ جیسے کہ سورۂ فرقان میں خبر دی گئی ہے کہ قیامت کی وعدہ گاہ میں قرآن کریم ہی کو پس پشت پھینک دینے کا جرم' امت پر عائد ہوگا۔ اور رسول مقبول فرمائیں گے:

یرب ان قومی اتخذوا ھذا القران مھجورا ۲۵/۳۰ اے میرے پروردگار میری اس قوم نے قرآن کو اس طرح پکڑا ہوا تھا جیسے چھوڑا ہوا ہوتا ہے۔ قرآن کے سوا جن کتابوں کو اس کے ساتھ شریک کر کے واجب الاتباع گردانا جاتا ہے یعنی کتب روایات' نہ قرآن بھر میں ان کی اتباع کا حکم دیا گیا ہے اور نہ قیامت کی بازپرس میں ان کا ذکر ہے۔ فلہٰذا ثابت ہوا کہ قیامت کی بازپرس کا مکمل حل قرآن مجید میں موجود ہے یہی فرض ہے۔ یہی واجب الاتباع ہے

جو مسائل اس میں دے دیئے گئے ہیں وہی فرض ہیں۔ خواہ وہ مسائل صلوٰۃ سے متعلق ہو یا زکوٰۃ سے۔ ان کا تعلق اوقات الصلوٰۃ کے ساتھ ہو یا رکعات واذکار صلوٰۃ کے ساتھ۔ وہ مسائل حج ہوں یا مسائل نکاح وطلاق۔ زندوں کے مسئلے ہوں یا مردوں کے۔ جو کچھ قرآن کریم میں دے دیا گیا ہے وہ کچھ فرض ہے اور جن مسائل کی وضاحت نہیں کی گئی ظاہر ہے کہ وہ خداوند علیم وخبیر سے بھول کر نہیں رہ گئے۔ بلکہ انہیں ہر ملک کے موسمی اور جغرافیائی تقاضوں اور ہر فرد کی شخصی آزادی اور انفرادی پسند پر چھوڑ دیئے گئے ہیں۔ ورنہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے متعلق تو پوری ذمہ داری کے ساتھ اعلان کر رکھا ہے کہ وہ ہر مسئلہ اور ہر مسئلے کے ہر گوشے کو پوری طرح کھول کھول کر بیان کرنے والی کتاب ہے۔

ونزلنا علیک الکتب تبیانا لکل شی ۸۹/۱۶۔اے رسول! ہم نے آپ پر ہر مسئلہ کو کھول کھول کر بیان کرنے والی کتاب نازل فرمائی ہے۔

وکل شی فصلنه تفصیلا ہ ۱۲/۱۷۔اور ہم نے ہر مسئلے کو کھول کھول کر بیان کر دیا ہے۔ اور ساتھ ہی حکم دے دیا گیا ہے کہ جو مسائل اور مسائل کے جو نسے گوشے بیان نہیں کئے گئے ان کے متعلق کرید نہ کرنا۔

یایها الذین امنوا لا تسئلوا عن اشیاء ان تبدلکم تسوکم ۱۰۱/۵۔ایمان والو! ان مسائل کے متعلق سوال نہ کرنا (جو زمان ومکان کے تقاضوں اور اقوام وافراد کی انفرادی آزادی پر چھوڑ دیئے گئے ہیں) اگر سب بتا دیئے جائیں (تو تمہاری شخصی آزادی چھن جائے اور) تمہارے لیے تنگی اور دشواری کا موجب ہو جائے۔ بالفاظ دیگر ۸۹/۱۶ اور ۱۲/۱۷ میں اعلان کر دیا گیا ہے کہ ہم نے اپنی کتاب میں انسانی ضروریات کے تمام مسائل پوری طرح کھول کھول کر بیان کر دیئے ہیں۔ اور ۱۰۱/۵ میں منع کر دیا گیا ہے کہ قرآنی وضاحت وصراحت سے زائد سوال نہ کرنا جن مسائل کی فردعات سے درگزر کیا گیا ہے وہ مکان و زمان کے تقاضوں اور تمہاری انفرادی آزادی کے پیش نظر خود معاف فرمایا ہے۔ قرآن میں کوئی کمی کجی نہیں رکھی گئی۔

صلوٰۃ، زکوٰۃ، حج، پیدائش وموت، نکاح وطلاق اور جملہ معاشرتی مسائل کی اصولی حدود وقیود متعین کر دی گئی ہیں۔ اور ان غیر متبدل حدود کے دائرے میں مکان و زمان کی ضرورتوں کے

مطابق نوعِ انسانی کو انفرادی آزادی عطا کردی ہے نیز جس حد تک کسی مسئلے کی فروعی شقوں کو پابند کرنا ضروری تھا۔ اس حد تک اصول کے ساتھ ساتھ فروعات کی وضاحت وصراحت بھی کردی گئی ہے اور باقی گوشے آزاد چھوڑ دیے گئے ہیں مثلاً یہ حکم تو دیا ہے: یبنی ادم قد انزلنا علیکم لباسا یواری سواتکم و ریشاء ۲۶/ ۷۔ اے نوعِ آدم! بے شک ہم نے تم پر لباس (کا حکم) نازل کیا ہے کہ وہ تمہاری برہنگی کو ڈھانپے اور خوبصورت بھی ہو۔ لیکن اس حکم کی عالمگیریت کو قائم رکھتے ہوئے یہ پابندی نہیں لگائی گئی کہ صرف تہہ بند اور لمبا کرتہ ہی پہنا جائے۔ کوٹ پینٹ اور قمیص شلوار یا چست پاجامہ اور شیروانی استعمال نہ کی جائے اسی طرح حجامت کے متعلق محلقین رءو سکم و مقصرین ۲۷/ ۴۸۔ جن میں سر اور ڈاڑھی کے سب بال شامل ہیں[1]۔ منڈانے یا کتروانے کی اجازت تو موجود ہے لیکن یہ پابندی نہیں کہ ضرور ہی منڈائے جائیں یا ضرور ہی کتروائے جائیں۔ کٹوائے جائیں تو کتنی لمبائی تک اور کس ملک کی وضع قطع کے مطابق کٹوائے جائیں۔ بلکہ پورے کرۂ ارض کے قیامت تک کے تقاضوں کا ساتھ دینے کے لیے ان گوشوں کو آزاد چھوڑ دیا گیا ہے۔

کھانے پینے کے متعلق کلوا و اشربوا ولا تسرفوا ۳۱/ ۷۔ کھاؤ پیو مگر اسراف نہ

---

[1] قرآنی لغت کے مطابق راس سے پورا سر بھی مراد لیا جاتا ہے۔ صرف بالائی سطح نہیں۔ (۱۷:۵۱) میں ہے فسینغضون الیک رءوسھم و یقولون متی ھو ط اے رسول! وہ آپ سے مخاطب ہو کر سروں کو مٹکائیں گے اور کہیں گے (جس قیامت کی آپ خبر دیتے ہیں بتائیے گا کہ) وہ ہوگی کب؟ چونکہ صرف سر کی بالائی سطح ہلائی اور مٹکائی نہیں جا سکتی بلکہ سارا سر حرکت کرتا ہے اس لیے ڈاڑھی سمیت سارے سر کے بالوں کو حسب منشا منڈانے یا کٹوانے کی اجازت ہے نیز ۴/ ۱۹ میں حضرت زکریا علیہ السلام کا قول درج ہے واشتعل الراس شیبا میرا سر شعلہ مار چکا ہے یعنی میرے سر اس کے بال سفید ہو چکے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ صرف سر کی بالائی سطح کے بال ہی سفید نہیں ہو چکے تھے بلکہ ڈاڑھی بھی سفید ہو چکی تھی۔۔۔۔۔۔ لہٰذا ۴۱/ ۱۹ میں بھی ڈاڑھی سمیت پورے سر کو راس کہا گیا ہے ۶/ ۵ وضو کے ضمن میں سر بمعنی سر کی بالائی سطح بھی آیا ہے: وامسحوا برءوسکم۔ لیکن ۵۱/ ۱۷ اور ۴/ ۱۹ میں راس بمعنی ٹھوڑی سمیت سارا سر ہے صرف بالائی سطح نہیں۔ اس سلسلے کی مزید وضاحت آیت ۵۱/ ۵ کی تفسیر میں بتفسیر القرآن بالقرآن کے ماتحت اپنے مقام پر آگے آرہی ہے۔

کرنا۔اور کلوا مما رزقکم الله حللا طیبا ۵/۸۸- کے الفاظ میں حلال پر موافق مزاج کی اجازت دے دی گئی ہے۔جس سے صاف ظاہر ہے کہ ہر حلال چیز کے کھانے پر مجبور نہیں کیا گیا۔

کوئی چیز حلال ہونے کے ساتھ ساتھ' اگر صحت اور مزاج کے موافق نہ ہو تو نہ کھائے اسی طرح انفرادی مزاج اور پسند کو برقرار رکھتے ہوئے حکم دیا گیا ہے کہ جی چاہے تو ایک برتن میں مل کر کھاؤ۔ نہ چاہے تو الگ الگ برتنوں میں کھا سکتے ہو۔ لیس علیکم جناح ان تاکلوا جمیعا او اشتاتا ۲۴/۶۱۔

اقامت صلوٰۃ اور ایتاء زکوٰۃ کو ہر مقام پر متصل لا کر اسے اس طرح مرکزی نقطہ کی حیثیت دے دی گئی ہے کہ قرآن کریم کی پوری تعلیم اس کے گرد طواف کرتی ہوئی پائی جاتی ہے۔ الفاظ صلوٰۃ وزکوٰۃ' اور ان کی مکمل تشریح اپنے مقام پر آگے آرہی ہے یہاں صرف یہ بتایا جاتا ہے کہ قرآن کریم کے متعلق یہ کہنا کہ اس میں صلوٰۃ وزکوٰۃ کی وضاحت موجود نہیں گویا یہ تصور دینا ہے کہ جس مقصد کے لیے قرآن کریم نازل ہوا تھا۔ اس نے خود اس کی حقیقت کو بھی بے نقاب نہیں کیا۔

نکاح وطلاق اور دفن کفن وغیرہ الفاظ کا مفہوم خود ان الفاظ کے اندر موجود ہے۔ وضاحت اپنے مقام پر آگے آرہی ہے۔ باقی رہا تو مولود کے کان میں اذان کہنے کا مسئلہ تو جب قرآن کریم یہ کہتا ہے: والله اخرجکم من بطون امھتکم لا تعلمون شیا ۱۶/۷۸۔ اور اللہ تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے پیدا کرتا ہے اس وقت تم کچھ نہیں جانتے۔ تو ایسے وقت پر جب بچہ جانتا ہی نہیں کہ اسے کیا کہا جا رہا ہے بول و براز تک کے شعور سے عاری ہے۔ اٹھ کر بیٹھ نہیں سکتا۔ مسجد جا نہیں سکتا' اس کے ایک کان میں یہ کہنا حی علی الصلوۃ آ نماز کی طرف۔ اور دوسرے میں کہنا: قد قامت الصلوۃ جلدی کر جماعت کھڑی ہو گئی ہے۔ قرآن کریم جیسی عقل دوست کتاب سے جو لعلکم تعقلون اور افلا تعقلون کے جملوں سے معمور ہے' ایسے عقل دشمن احکام کی امید رکھنا' اس کے مقام تک سے بے خبری کی دلیل ہے۔

پس قرآن فہمی کا نواں اصول یہ ہے کہ قرآن کریم خود مبین ہے۔ ہر مسئلے کی خود وضاحت کرتا ہے اور تبیین وتشریح کے لیے کسی غیر اللہ کتاب کا محتاج نہیں۔

۱۰۔ قرآن کریم کافی ہے۔

ارشاد باری ہے:

اولم یکفھم انا انزلنا علیک الکتب یتلی علیھم ان فی ذالک لرحمۃ و ذکری لقوم یؤمنون ۵ ۵۱/۲۹ ۔صاحب قرآن! کیا معترضین کے لیے یہ کافی نہیں کہ ہم نے آپ پر اپنی کتاب نازل فرمائی ہے۔ جو ان پر پڑھی جاتی ہے بلاشبہ ماننے والوں کے لیے اس میں رحمت بھی ہے اور نصیحت بھی ہے۔

پس قرآن فہمی کا دسواں اصول یہ ہے کہ قرآن خود کافی ہے کسی غیر اللہ کتاب کا محتاج نہیں فلہذا زیرِ نظر ترجمہ اور تفسیر میں اس امر کی پوری کوشش کی گئی ہے کہ کسی بھی مقام پر کفایت قرآن کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے۔

۱۱۔ قرآن کریم کا مفسر خود اللہ تعالیٰ ہے۔

اس ضمن میں نفی اثبات کے حصر کے ساتھ مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کی تفسیر خود کر دی ہے۔ (یہ شق پیچھے گزر چکی ہے لیکن قرآن فہمی کے قرآنی اصول کی فہرست میں چونکہ اس کا ایک خاص مقام ہے۔ اس لیے دوبارہ یاد دلائی جا رہی ہے معاف فرمائیے گا) دیکھئے ارشاد باری ہے:

ولا یاتونک بمثل الا جئنک بالحق و احسن تفسیرا ۵ ۲۵/۳۳

پس قرآن فہمی کا گیارھواں اصول یہ ہے کہ قرآن اپنا مفسر آپ ہے فلہذا تفسیر زیرِ نظر میں قرآن کی تفسیر قرآن کریم ہی کے ساتھ کی گئی ہے۔ اور اسی اساس پر اس تفسیر دلپذیر کا نام اسم بامسمی تجویز کیا گیا ہے۔ تفسیر القرآن بالقرآن۔

۱۲۔ قرآن کریم میں تضاد و تخالف ہرگز نہیں ہے۔

کتاب مجید فرقانِ حمید کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ایک اضافی زوردار دعویٰ یہ بھی ہے کہ اس کتاب کے خداوندی کتاب ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس کی آیات کریمات میں باہمی تضاد و تخالف ہرگز ہرگز موجود نہیں۔ بالفاظ دیگر اس میں تضاد و تخالف ماننا' اسے کتاب خداوندی ماننے کے انکار کے

مترادف ہے۔ دیکھئے ارشاد باری ہے:۔

○ افلا یتدبرون القران ط ولو کان من عند غیر الله لوجدو افیه اختلافا کثیرا ○ ۴/۸۲

(مفہوم) لوگ قرآن میں تدبر کیوں نہیں کرتے۔ (یعنی انہیں اس میں غور کرنا چاہیے۔ کہ اس میں اختلاف ہرگز نہیں ہے' کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے) حقیقت یہ ہے کہ اگر یہ غیر اللہ کی طرف سے ہوتا تو لوگ اس میں معمولی نہیں' بلکہ بہت زیادہ اختلاف موجود پاتے۔

پس قرآن کا بارہواں اصول یہ ہے کہ اس میں اختلاف نہیں ہے۔

فلہذا زیر نظر ترجمہ اور تفسیر میں اس قرآنی قدر کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے کہ قرآن کریم کی کوئی آیت کسی آیت سے ٹکرانے نہ پائے۔ جہاں کہیں دو آیتوں میں بظاہر تضاد وتخالف معلوم ہوتا ہے۔ وہاں اللہ تعالیٰ کی ہدایت ذیل پر عمل کرتے ہوئے باہم متصادم دو آیات کریمات میں سے متشابہ آیت کو محکم آیت کے ماتحت رکھا گیا ہے۔ جیسے کہ خداوند تعالیٰ نے خود فیصلہ دے دیا ہے:۔

۱۳- قرآنِ کریم میں آیات محکمات بھی ہیں اور متشابہات[1] بھی ہیں لیکن اصل کتاب محکمات ہیں۔

○ هو الذی انزل علیک الکتب منه ایت محکمت هن ام الکتب واخر متشبهت ط فاما الذین فی قلوبهم زیغ فیتبعون ماتشابه منه ابتغاء الفتنة وابتغاء تاویله ومایعلم تاویله الا الله والرسخون فی

---

[1] لفظ متشابہات' متشابہ کی جمع ہے۔ جسکا معنی ۶/۱۴۱ میں قرآن کریم نے خود بتایا ہے ملتا جلتا اور مثل وماننذ جیسے کہ ارشاد ہوا ہے:۔ اللہ تعالیٰ پیدا کرتا ہے کھجوریں' مختلف ذائقوں کے اجناس زیتون اور انار متشابها وغیر متشابها ط ۶/۱۴۱ یعنی ایک دوسرے سے ملتے جلتے اور نہ ملتے جلتے پس جس طرح اس آیت مجیدہ میں متشابہا کا معنی ہے ملتے جلتے اور مثل وماننذ۔ اسی طرح متشابہات کا معنی بھی یہ ہے کہ وہ محکمات سے عین ملتی جلتی' اور مثل وماننذ ہیں مختلف ومتضاد ہرگز نہیں۔ اور انکی تاویل خود اللہ تعالیٰ نے محکمات میں کر دی ہے' جنکی وہ متشابہ یعنی مثل وماننذ ہیں۔

العلم يقولون امنا به كل من عند ربنا ٣/٦

(مفہوم) اے رسول! وہ اللہ ہی ہے جس نے آپ کی طرف اپنی کتاب نازل فرمائی ہے۔ اس میں آیات محکمات ہیں۔ وہ اصل کتاب میں اور دوسری قسم ہے متشابہات' (بظاہر مختلف لیکن حقیقت میں محکمات سے ملتی جلتی اور عین ان کی مثل دمانند ہیں) پھر جن لوگوں کے قلوب ٹیڑھے ہیں۔ وہ اس (کتاب) میں سے متشابہات کے اس (مفہوم) کی اتباع کرتے ہیں۔ جس میں محکمات کے خلاف شبہ پیدا ہوتا ہو۔ ایسے لوگوں کی غرض اس میں فتنہ کی تلاش اور من مانی تاویل ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اس (کتاب) کی تاویل اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اور جو لوگ قرآنی علم کے پکے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم اس قرآن پر ایمان لائے ہیں۔ محکمات ومتشابہات سب اللہ کی طرف سے ہیں۔ وہ متشابہات کو محکمات کی مثل دمانند مانتے ہیں۔ متضاد ومخالف نہیں مانتے)

دیکھیے اس آیت سے ثابت ہے کہ متشابہات کی اتباع ٹیڑھے قلوب کی نشانی ہے۔ پس ثابت ہوا کہ اگر کہیں قرآن کریم کی دو آیات کریمات کے مفہوم ومعانی میں بظاہر تضاد وتخالف پایا جائے۔ تو اس کے دور کرنے کا طریقہ یہ بتایا گیا ہے کہ پہلے یہ معلوم کیا جائے کہ ان میں سے کونسی محکم اور کونسی متشابہ ہے۔ تاکہ متشابہ آیت مجیدہ کو محکم آیت کریمہ کے ماتحت رکھ کر محکم کے مطابق مفہوم اخذ کیا جائے۔ یعنی متشابہات کی مثل دمانند مانا جائے' مخالف نہیں۔ اس سلسلے کی چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں:۔

۱/۱۳ کیا ہدایت وگمراہی' انسان خود اختیار کرتا ہے یا اللہ ہی ہدایت دیتا' اور وہی گمراہ کرتا ہے۔

ہدایت وگمراہی کے متعلق قرآنی آیات کریمات میں اچھا خاصہ ٹکراؤ پایا جاتا ہے۔ بعض آیات کے لفظی ترجمہ کی رو سے یہ مفہوم برآمد ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی ہر کسی کو ہدایت دیتا ہے اور وہی گمراہ کرتا ہے۔ اور بعض آیات کے الفاظ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ہدایت پانا یا گمراہ ہوجانا انسان کا اپنا کام ہے۔ اور اس ٹکراؤ کو قرآنی ہدایت کے مطابق دور نہ کرنے کا یہ نتیجہ ہے کہ مسلمانوں کے

ہاں صدیوں سے یہ عقیدہ چلا آ رہا ہے کہ:۔ ہدایت وگمراہی اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہے۔ جسے چاہتا ہے ہدایت عطا فرماتا ہے۔ اور جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے۔ اور جسے وہ گمراہ کر دے اسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں ہے۔ من یضلل اللہ فلاھا دی لہ ۷/۱۸۶۔ اور یہی آیت مجیدہ جمعہ کے خطبوں میں پڑھ کر سنائی جاتی ہے۔ حالانکہ بات بالکل سیدھی سی ہے۔ کہ اگر حقیقت یہی کہ اللہ ہی جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔ اور جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے۔ تو ہدایت پانیوالے کی خوبی کیا ہوئی اور گمراہ ہونیوالے کا قصور کیا ٹھہرا؟ اوراس پر جزا سزا کا کیا مطلب؟ اور خود گمراہ کردہ کو جہنم داخل کرنا کہاں کا انصاف ہے؟ اور کیا یہ تنگ زماں نظریۂ مکافات عمل کی پوری عمارت کو منہدم نہیں کر دیتا؟ ذیل میں ہدایت وگمراہی سے متعلقہ آیات کریمات کا تقابل ملاحظہ فرمائیں۔ کہ بظاہر کس قدر تضاد وتخالف پایا جاتا ہے۔ جس کا حل ۷/۳ میں دیدیا گیا ہے:۔

۲/۱۳(ا) اللہ ہی ہدایت دیتا اور وہی گمراہ کرتا ہے۔

○ من یھدی اللہ فھو ط المھتدی ۷/۱۷۸

جسے اللہ ہدایت دے۔ وہی ہدایت پانیوالا ہے۔

○ من یضلل اللہ فلا ھادی لہ ۷/۱۸۶

جسے اللہ گمراہ کر دے اسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں ہے۔

(ب) انسان خود ہدایت پاتا اور خود گمراہ ہوتا ہے۔

○ فمن اھتدی فلنفسہ ۳۹/۴۱

جس نے خود ہدایت پائی اس کا فائدہ اسکی اپنی جان کیلئے ہے

○ ومن ضل فانما یضل علیھا ۳۹/۴۱

اور جو خود گمراہ ہوگیا۔ بلاشبہ اسکا وبال اپنی جان پر ہے۔

دیکھیے گا:

ان آیات کریمات میں بظاہر کتنا بڑا تضاد وتخالف موجود ہے۔ اور محکمات ومتشابہات سے متعلقہ قرآنی ہدایات کو نظر انداز کرنے ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ عوام کے علاوہ بڑے بڑے جید علماء تک

بر سر منبر کہہ دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔ اور جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے۔ اور مروجہ تراجم میں آیات مجیدہ ۷/۱۷۸ اور ۷/۱۸۶ کا معنی بالکل یہی لکھا ہے کہ جسے اللہ ہدایت دے وہی ہدایت پاتا ہے۔ اور جسے اللہ گمراہ کر دے اسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں ۔۔۔ لیکن ۳/۷ کی خداوندی خبر کے مطابق کہ اس کی مقدس کتاب میں آیات محکمات بھی ہیں۔ اور متشابہات بھی ہیں پس آیاتِ بالا میں سے یہ معلوم کرنا ضروری ٹھہرا کہ محکمات کونسی ہیں اور متشابہات کون سی ہیں تا کہ متشابہات کا مفہوم محکمات کے مطابق لیکر اس ظاہری تضاد کو ختم کیا جائے۔

اب غور فرمایئے گا۔ کہ اگر ان آیات کریمات کو محکم مانا جائے' جن کا لفظی ترجمہ یہ ہے کہ اللہ ہی ہدایت دیتا' اور اللہ ہی گمراہ کرتا ہے' تو قرآن کریم کا بتایا ہوا مکافاتِ عمل' یعنی جزا سزا کا پورا نظام درہم برہم ہو کر رہ جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کھلے بندوں ظالم و بے انصاف ٹھہرتا ہے کہ خود ہی گمراہ کرتا ہے اور خود ہی اپنی عطا کردہ گمراہی کی سزا دیتا ہے۔ نیز اسکا اپنا فرمودہ ٥ اعملوا ما شئتم ٤٠/٤١ بیکار محض ثابت ہوتا ہے' جس میں انسان کو صاحب اختیار وارادہ ٹھہرایا گیا ہے کہ جو چاہو کرو۔ اچھے عمل بجالاؤ تو خود' اور برے اعمال اختیار کرو تو خود۔ جس کا جی چاہے ایمان لائے اور جس کا جی چاہے کفر کرے:۔ فمن شاء فلیومن ومن شاء فلیکفر ۱۸/۲۹ – پس ثابت ہوا کہ آیات مجیدات (الف) متشابہات ہیں۔ اور آیات کریمات (ب) محکم ہیں' جن میں بتا دیا گیا ہے کہ انسان خود ہی ہدایت پاتا اور خود ہی گمراہ ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نہ کسی کو زبردستی ہدایت دیتا ہے اور نہ کسی کو زبردستی گمراہ کرتا ہے۔ اب آیئے تقابل کی آیات کریمات الف یعنی متشابہات کی طرف' کہ وہ کس طرح محکمات کے مثل و مانند ہونے والی ہیں۔ انکا مفہوم پہلے تو خود ان کے سیاق' اور پھر قواعد عرب کی روشنی میں ملاحظہ فرمائیں۔ یاد رہے کہ ۷/۱۷۸ من یھد اللہ فھو المھتدی کے سیاق کلام' ۷/۱۷۵ میں ارشاد ہوا ہے:۔

٥ واتل علیھم نبا لذی اتینہ آیتنا فانسلخ منھا فاتبعہ الشیطن فکان من الغوین ٥ –

اے رسول! انہیں اس شخص کی خبر سنایئے گا۔ جسے ہم نے اپنی آیتیں دیں (کہ وہ ہدایت پر

آ جائے) لیکن وہ ان (آیتوں کی حدود) سے نکل گیا۔ پس اس کے پیچھے (نفس) شیطان لگا۔ پھر وہ خود گمراہوں میں سے ہو گیا۔ دیکھئے! یہاں گمراہی کا سبب اسکا آیات اللہ کی حدود سے خود نکل جانا بتایا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تو اسے ہدایت دیدی تھی۔ اب اس سے آگے آئی ہے متشابہ آیت مجیدہ:۔ ا

○ من یهد الله فهوا لمهتدی ۱۷۸/۷- اس میں من متضمن بمعنی شرط ہے' شرط مخدوف ہے۔ اور سیاق کلام کے مطابق' تقدیر کلام اور آیت کا صحیح مفہوم یہ ہے:۔○ من یهد الله فان قام علی الهدی فهو المهتدی جسے (اپنے نازل کردہ ضابطہ کے ذریعہ) اللہ ہدایت دے' پھر اگر وہ ہدایت پر قائم رہے (یعنی ہدایت کی حدوں سے انسلاخ نہ کرے' باہر نہ نکلے) تو وہی ہدایت پانیوالا ہے۔ اب آیئے ۱۸۶/۷ کی طرف:۔

○ من یضلل الله فلا هادی له- اس میں یضلل باب افعال سے ہے' جسکا ایک خاصہ وجدان یعنی پانا ہے' نیز اس میں بھی من متضمن بمعنی شرط ہے' شرط مخدوف ہے۔ تقدیر کلام اور مفہوم یہ ہے:۔○ من یضلل الله فان قام علی الضللة فلا هادی له- جسے اللہ گمراہ پائے یعنی جو ہدایت خداوندی سے اعراض کرتا ہو۔ پھر اگر وہ گمراہی پر خود اڑا رہے۔ تو اسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں۔ نیز ۱۱۵/۴ میں آیا ہے:۔

○ نوله ماتولی ہم اسے اسی طرف پھرنے دیتے ہیں' جدھر کو وہ خود پھرتا ہے۔

۱۳/۳ متشابہات کی ایک اہم مثال۔

ہدایت و گمراہی کے ضمن میں ۲۲/۱۶ میں ارشاد ہوا ہے:۔

○ وان اللــه یهـدی مـن یـرید- قواعد عرب کی رو سے اس آیت کے یہ دونوں معنی درست ہیں:۔ ا۔ اور بیشک اللہ تعالیٰ جس کے لئے خود ارادہ کرتا ہے اسے ہدایت دیتا ہے۔

(ب) اور بے شک اللہ اسے ہدایت دیتا ہے۔ جو ہدایت پانے کا خود ارادہ کرتا ہے۔

تو اب ظاہر ہے کہ یہ آیت متشابہ ہے۔ اور ٹیڑھے ذہنوں والے لوگ اسکی رو سے ہدایت و گمراہی کو اللہ تعالیٰ کے ذمہ لگا کر' انسان کے جملہ عیوب و جرائم کا ذمہ دار خود اللہ تعالیٰ کو ٹھہرا دیتے ہیں۔ لیکن اس متشابہ آیت کے مقابلے میں' انہی الفاظ پر مشتمل محکم آیت مجیدہ ملاحظہ فرمائیں۔

○ یھدی الیہ من ینیب ۱۳/۲۲۴- واضح رہے کہ قواعد عرب کی رو سے اس آیت کا صرف اور صرف یہی ایک معنی ہے کہ:۔○ اللہ تعالیٰ صرف اس کو ہدایت دیتا ہے جو اس کی طرف خود رجوع کرتا ہے۔فلہٰذا ثابت ہوا کہ آیت مجیدہ ۱۳/۴۲ محکم ہے۔اور ۱۶/۲۲ متشابہ ہے۔یعنی اس محکم کے عین مطابق ہونیوالی۔اگرچہ قواعد عرب کی سے ان اللہ یھدی من یرید کا معنی ۱۳/۴۲ کے کے خلاف لیا جانا درست ہے کہ اللہ جس کے متعلق خود ارادہ کرتا ہے۔اسے ہدایت دیتا ہے۔لیکن ۳/۷ کی خداوندی ہدایت کے مطابق کہ اصل کتاب محکمات ہیں متشابہات نہیں۔ اس لئے اس کا معنی ۱۳/۴۲ کی محکم آیت کے ماتحت رکھ کر یہ لیا جانا ضروری ہے کہ:۔

بیشک اللہ تعالیٰ اسے ہدایت دیتا ہے جو ہدایت پانے کا خود ارادہ کرتا ہے۔فلہٰذا کسی بھی متشابہ آیت کا مفہوم کسی محکم آیت کے خلاف اخذ کرنا منشاء خداوندی ۳/۷ کے خلاف اور سو فیصد غلط ہے۔

ایک ضروری نوٹ۔

امت کے متعدد متنازع مسائل ایسے ہیں۔جن کے لئے ہر فرقہ قرآن کریم ہی سے دلیل لاتا ہے۔لیکن فریقین' جن قرآنی دلائل کیساتھ ایک ہی مسئلہ کو الگ الگ' منفی اور مثبت دونوں صورتوں میں ثابت کر دکھاتے ہیں۔اور سادہ لوح عوام دونوں طرف کے دلائل پر ششدرہ جاتے ہیں کہ قرآنی دلائل سے آنحضور سلام علیہ بشر بھی ہیں اور نور بھی ہیں۔عالم الغیب بھی ہیں۔اور پس دیوار کی چیزوں تک سے بے خبر بھی۔وفات پا چکنے کے باوجود زندہ بھی ہیں' اور مر کر مٹی بھی ہو چکے ہیں۔اگر ان مسائل سے متعلقہ الگ الگ قرآنی دلائل میں محکمات و متشابہات کی تمیز کر لی جائے۔اور فریقین قرآنی ہدایت کو پس پشت نہ ڈالتے ہوئے محکمات و متشابہات کے امتیاز کو لازم سمجھیں تو جملہ مسائل آنِ واحد میں حل ہو سکتے ہیں۔

۱۳/۴ المحکمات و متشابہات کی تعریف۔

محکمات کا لفظ مادہ ح۔ک۔م حکم سے مشتق ہے۔اس کا بنیادی معنی ہے منع کرنا' روکنا قابو میں رکھنا۔حکمۃ کہتے ہیں لگام کو جس کیساتھ گھوڑے کو روکا اور قابو میں رکھا جاتا ہے۔نیز روکنے اور

قابو میں رکھنے ہی کو حکم کہتے ہیں۔ حاکم کا کام یہ ہوتا ہے کہ معاشرہ کے ہر فرد کو اسکے فرائض منصبی کی حدود کے اندر روک رکھے۔ اور کسی فرد کو دوسرے افراد کی حدود میں تصرف نہ کرنے دے۔ ایسی چیز کو جو اپنی حدود میں محدود ہو یعنی اپنے مقام کو کبھی نہ چھوڑے اُسے محکم کہا جاتا ہے۔ فلہذا آیات محکمات کی ایک تعریف یہ ہے کہ ان کے مفہوم و معانی میں لچک ہوتی ہی نہیں۔ اور وہ کبھی بھی اپنا مقام نہیں چھوڑتیں۔ انکے ایک سے زائد معنی لئے ہی نہیں جا سکتے۔

اسی مفہوم کو اس انداز سے بھی ذہن نشین کیا جا سکتا ہے۔ کہ قرآن کریم نے آیات محکمات کو "ھُنَّ اُمُّ الْکِتٰب" بتایا ہے۔ ام کا معنی ہے ماں' جڑ' اصل' بنیاد۔ اب ظاہر ہے کہ جس طرح ہر شخص کی ماں بھی ایک' اور ہر عمارت کی بنیاد بھی صرف اور صرف ایک ہوتی ہے۔ اسی طرح آیات محکمات وہ ہیں جن کا معنی اور مفہوم صرف ایک ہے جنہیں ایسے محکم الفاظ کی لگام (حکمہ) چڑھی ہوئی ہوتی ہے۔ جن کے معانی اور مفہوم میں تاویل کی گنجائش ہی نہیں ہوتی۔ اور ظاہر ہے کہ تاویل کی گنجائش صرف اور صرف اس وقت پیدا ہوتی ہے۔ جب الفاظ حقیقت کی بجائے مجاز' تشبیہ' یا استعارہ کے طور پر لائے گئے ہوں۔ فلہذا:۔

○ محکم آیات مجیدہ وہ ہیں' جن کے الفاظ اپنے حقیقی معنوں میں آئے ہوں۔ اور وہاں مجاز' محاورہ' استعارہ اور تشبیہ کا گزر تک نہ ہو۔

○ اور متشابہ آیات وہ ہیں جن کے الفاظ حقیقی معنوں کے خلاف مجاز' محاورہ' استعارہ یا تشبیہ کے طور پر استعمال ہوئے ہوں مثلاً عربی زبان میں اکل کہتے ہیں کھانے اور شرب کہتے ہیں پینے کو۔ اب کلیہ بالا کی رو سے ظاہر ہے کہ جس آیت مجیدہ میں یہ مصادر حقیقی معنوں میں آئیں' وہ محکم ہوگی۔ اور جس میں مجازی معنوں میں استعمال ہوئے ہوں' وہ متشابہ ہوگی۔

○ مصدر "شرب" بمعنی پینا کے مجازی مفہوم کی مثال پچھلے صفحات پر" اشربوا فی قلوبھم العجل" ۲/۹۳ کے الفاظ میں گزر چکی ہے کہ بچھڑا چونکہ کوئی پینے کی چیز نہیں' فلہذا اس آیت میں اشربوا بطور مجاز استعمال ہوا ہے۔ اور یہ آیت مجیدہ متشابہ ہے محکم نہیں۔

○ مصدر "اکل" کے مجازی استعمال کی مثال آیت ذیل میں ملاحظہ فرمائیں:۔

○ ان الذین یاکلون اموال الیتمی ظلما انما یاکلون فی بطونھم نارًا ط

۴/۱۰ بیشک جو لوگ یتیموں کا مال بے جا طور پر کھاتے ہیں۔ بلاشبہ وہ اپنے پیٹوں میں آگ کھاتے ہیں۔

غور فرمایئے گا! کہ اس آیت میں یاکلون فی بطونهم نارا کے الفاظ مجازی معنوں میں آئے ہیں۔ کیونکہ آگ کھانے کی چیز نہیں۔ تو جس طرح ان متشابہ الفاظ سے اس قسم کا کوئی چیستانی مفہوم اخذ نہیں کیا جا سکتا۔ کہ یتیموں کا مال' بیجا طور پر کھانیوالوں کے لئے فی الحقیقت آگ بن جاتا ہے۔ اسی طرح اس پر ہر قسم کی چیستانی حاشیہ آرائی بھی غلط ہے کہ کسی بھی زمانے میں معجزاتی طور پر یتیموں کا مال آگ بن گیا ہو۔ یہ تو ہوئیں مصادر اکل اور شرب کے مجازی استعمال کی مثالیں' جو متشابہات کی نشانی ہیں۔ اب قرآن کریم کی ایک ہی آیت مجیدہ میں ان دونوں مصدروں کے حقیقی معنوں کا استعمال ملاحظہ فرمائیں:۔

ο کلوا واشربوا من رزق الله ولا تعثوا فی الارض مفسدین ο ۲/۶۰- اللہ کے رزق سے کھاؤ پیو۔ اور زمین میں فساد نہ کرتے پھرنا۔ دیکھئے! اس آیت مجیدہ میں اکل و شرب کے مجازی معنی لئے ہی نہیں جا سکتے۔ بلکہ یہاں حقیقی معنی لئے بغیر کوئی چارہ کار رہے ہی نہیں۔ لہذا یہ محکم آیت مجیدہ ہے۔

الحختصر! محکمات و متشابہات کی ایک قسم یہ ہے کہ جن آیات کریمات کے الفاظ حقیقی معنوں میں استعمال ہوں۔ اور ان سے مجازی معنی لینا ممکن ہی نہ ہو وہ محکمات ہیں۔ اور جن کے الفاظ مجازی معنی دیتے ہوں۔ اور ان سے حقیقی معنی اخذ کرنا ناممکن ہو وہ متشابہات ہیں۔

۵/۱۳ الفاظ کے حقیقی اور مجازی معنوں کی پہچان کا واحد ذریعہ مشاہدات عالم ہیں۔

اب رہا حقیقی اور مجازی معنوں کی پہچان کا سوال! اس کا جواب مذکورہ بالا مثالوں میں بدرجہ اتم آچکا ہے۔ جس طرح آگ کھانے کی چیز نہیں۔ یاکلون فی بطونهم نارا ط ۴/۱۰' اور سامری کا بچھڑا پینے کی چیز نہیں تھی۔ اشربوا فی قلوبهم العجل ۲/۹۳- اور یہ فیصلہ ہے مشاہدات عالم یعنی قوانین جاریہ کا۔ فلہذا اسی کلیہ کے مطابق' قرآن کریم کے ہر وہ الفاظ جن کے

حقیقی معنی کارگاہِ کائنات کے روزمرہ کے تجربات ومشاہدات کے کسی بھی گوشے کی مخالفت کرتے ہوں۔وہ آیت مجیدہ متشابہ ہے۔اوران کے الفاظ کے وہ مجازی معنی لئے جانے صحیح ہیں جو عربی لغت اور کائناتی مشاہدات وتجربات کے مطابق ہوں۔

پس قرآن کریم کی کسی آیت سے عالمی مشاہدات کے خلاف کوئی چیستانی مفہوم اخذ کرنا' ۳/۷ کے اس خداوندی اعلان کی بغاوت پر مبنی ہے منه ایت محکمت هن ام الکتب۔ لہذا زیر نظر ترجمہ اور تفسیر میں مشاہدات عالم کے ہر گوشے کی مخالفت سے پورا پورا احتراز کیا گیا ہے۔اور ہر مقام پر الفاظ کے حقیقی اور مجازی معنوں کا معیار مشاہدات عالم ہی تسلیم کیا گیا ہے۔

○ نیز قرآن مجید کا ایک اسلوبِ بیان یہ بھی ہے کہ عموماً اجمالی انداز بیان اختیار کرتا' اور تفصیلات کو محذوف رکھتا چلا جاتا ہے۔اور دوسری آیات میں اس اجمال کی تفصیل دیدیتا ہے۔ ایسی اجمالی آیات کریمات بھی متشابہات ہیں۔جن سے کائناتی قوانین کی خلاف ورزی کا تصور پیدا ہوتا' اور قرآن کریم میں چیستانیات کی گنجائش کے سوتے پھوٹتے دکھائی دیتے ہیں۔مثلاً آیت ذیل میں اجمالی انداز اختیار کیا گیا اور تفصیلات کو محذوف رکھا گیا ہے:۔

وانزل من السماء ماء ۲/۲۲ – اوراللہ تعالیٰ آسمان سے پانی برساتا ہے۔

اس آیت سے یہ مفہوم بھی لیا جاسکتا ہے کہ آسمان سے پانی بادلوں کے بغیر' یعنی اس نظام کے سوا بھی برس سکتا ہے۔کہ جب تک سورج کی گرمی سے سمندروں' دریاؤں' جھیلوں' اور جوہڑوں کا پانی بخارات بن کر اور ہوا کے کندھوں پر سوار ہو کر آسمان میں نہ پہنچے' بارش نہیں ہوگی۔اب چونکہ ۲/۲۲ میں مذکورہ نظام کی تمام کڑیاں محذوف رکھ کر صرف اجمالی طور کہہ دیا ہے۔انزل من السماء تو اس متشابہ آیت مجیدہ سے' کائناتی مشاہدات کی مخالفت کا جو شبہ پڑتا ہے اللہ تعالیٰ نے اسے ذیل کی محکم آیت مجیدہ کے ساتھ دور کر کے آیت مجیدہ ۲/۲۲ اور اس عنوان کی تمام آیات کریمات کو جو قرآن بھر میں پھیلی ہوئی ہیں۔محکم کر دیا ہے۔

والله الذی ارسل الریح فتثیر سحابا فسقنه الی بلد میت فاحیینا الارض بعد موتها۔

۳۵/۹ (مفہوم) اور اللہ ہی وہ عظیم الشان ذات ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے پھر وہ بادلوں کو جو

(سورج کی تمازت کے پیدا کردہ بخارات ہیں) اٹھاتی ہیں- پھر ہم اس (پانی) کو مردہ زمین کی طرف لے آتے ہیں- پھر ہم اس کے ساتھ مردہ زمین کو زندہ کر دیتے ہیں- (اور ہر طرف سبزہ پھوٹ نکلتا ہے)

پس ہر وہ آیت جس کا انداز بیان اجمالی ہو اور تفصیل محذوف کر دی گئی ہے وہ متشابہ ہے اور جس میں اس محذوف گوشے کی تفصیل دے دی گئی ہو وہ محکم ہے-

۴/۱۳ نگاہِ بازگشت- محکمات ومتشابہت ایک نظر میں-

۱- ہر وہ آیت مجیدہ محکم ہے جس کا گریمر اور لغت عرب کی رو سے صرف ایک معنی برآمد ہوتا ہو- اور ہر وہ آیت جس سے قواعد نعت کے مطابق ایک سے زائد معنی لئے جاسکتے ہوں- متشابہ ہے جیسے کہ صفحہ ۳۳ پر درج آیت ان اللہ یھدی من یرید ۲۲/۱۶ متشابہ ہے- اور یھدی الیہ من ینیب ۴۲/۱۳ محکم ہے-

۲- ہر وہ آیت جس میں کوئی لفظ مجاز کے طور پر استعمال ہوا ہو وہ متشابہ ہے- جس میں اپنے معنوں میں آیا ہو وہ محکم ہے- جیسے کے اشربوا فی قلوبھم العجل ۹۳/۲ اور یاکلون فی بطونھم نارا ۱۰/۴ متشابہ ہیں- اور کلوا اشربوا من رزق اللہ ولا تعثوا فی الارض مفسدین- ۶۰/۲ محکم ہے-

۳- اور اسی طرح ہر وہ آیت جس میں کوئی لفظ تشبیہ' محاورہ یا استعارے کے طور پر استعمال ہوا ہو متشابہ ہے جیسے کلما اوقدوا نارا للحرب اطفاھا اللہ ۶۴/۵ میں ''لڑائی کی آگ'' اور اسے اللہ بجھا دیتا ہے-'' کے جملے محاورۃ تشبیہا اور استعارۃ آئے ہیں حقیقت کے لئے نہیں آئے-

۴- ہر وہ آیت جس سے مشاہدات عالم کے کسی بھی گوشے کی مخالفت کا مفہوم برآمد ہوتا ہو متشابہ ہے-

۵- وہ اجمالی آیات مقدسات جن میں مسئلہ مذکور کی تفصیل محذوف ومقدر ہو وہ متشابہ ہیں- اور جن آیات میں اس اجمال کی تفصیل دی گئی ہو- وہ محکم ہیں- فلہٰذا اجمالی آیات متشابہات کو تفصیلی آیات محکمات کے ماتحت رکھنا ہوگا جیسے کہ صفحہ ۳۶ پر مذکور آیت مجیدہ ۲۲/۲ اور ۹/۳۵ محکم ہے-

۱۳/۷ خداتعالٰی نے آیات متشابہات نازل ہی کیوں فرمائی ہیں؟

محکمات و متشابہات سے متعلقہ اس آخری اور اہم سوال کا جواب آئت ذیل میں موجود ہے۔
فورب السماء والارض انه لحق مثل ما انكم تنطقون ۔۲۳/۵۱ پس آسمان وزمین کے پروردگار کی شہادت ہے کہ بلاشبہ یہ قرآن وحی ہے یعنی مشاہدات عالم کے عین مطابق ہے۔ اور اس کا انداز بیان بالکل وہی ہے جس طرح تم آپس میں روزمرہ گفتگو کرتے ہو۔فلہٰذا جس طرح روزمرہ کی گفتگو میں حقیقت اور مجاز' استعارے اور تشبیہیں' محاورے اور ضرب المثلیں سب کچھ موجود ہوتا ہے۔ اسی طرح قرآن کریم بھی اسی روزمرہ کے طرز تکلم سے لبریز و معمور ہے۔فلہٰذا ۲۳/۵۱ کی رو سے لازم آتا ہے کہ جس طرح ہم روزمرہ کی مستعملہ' اپنی متشابہات سے غلطی نہیں کھاتے حقیقت کو حقیقت' مجاز کو مجاز' تشبیہ کو تشبیہ اور استعارے کو استعارہ کہتے ہیں۔ اسی طرح قرآنی انداز حقیقت و مجاز اور تشبیہ کو بھی اپنے اپنے مقام پر رکھیں۔ افسوس ہے کہ محکم و متشابہ کی تمیز کو نظرانداز کر کے یداللہ اور وجہ اللہ کے قرآنی الفاظ سے اللہ تعالیٰ کو ہاتھ منہ والی شخصیت مانا جاتا ہے۔ اور خلق الانسان علی صورتہ تک کا تصور بھی دیا جاتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کر لیا تھا۔ یعنی اللہ تعالیٰ بھی انسان جیسا منہ اور ہاتھ پیر رکھتا ہے العیاذ باللہ۔

۱۳/۸ آیاتِ متشابہات کو محکمات کر دیا گیا ہے۔

ارشاد باری ہے:۔ **كتب احكمت ايته ثم فصلت من لدن حكيم خبير ٥** ۱۱/۱ ' یہ ایک کتاب ہے جس کی آیتیں حکیم و خبیر کی طرف سے محکم کر دی گئی ہیں۔ پھر اسی کی طرف سے ان کی پوری پوری تفصیل بھی کر دی گی ہے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو آیات کریمات ۳/۷ کی خبر کے مطابق متشابہات ہیں' خداوند حکیم و خبیر نے انہیں محکم کر دیا ہوا ہے۔ کیونکہ وہ آیتیں جو پہلے ہی محکمات ہیں ان کے محکم کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن اس پر پھر سوال پڑتا ہے کہ متشابہات کو کس طرح محکمات کر دیا گیا ہے۔ اس سوال کا جواب خود متشابہات اور محکمات کے قرآنی تقابل میں محفوظ و موجود ہے یعنی:۔

۱۔ قواعد عرب کے مطابق جہاں کسی جملے کے ایک سے زائد مفہوم درست ثابت ہوتے

ہوں۔ایسی آیات متشابہات کوایسی آیات محکمات کے ماتحت لاکر محکم کر دیا ہے' کہ قواعد کی رو سے ان کے ایک سے زائد معنی بر آمد ہی نہیں ہو سکتے۔

۲۔ جہاں کوئی جملہ' محاورہ تشبیہ یا استعارہ کے طور پر استعمال ہوا ہے اسے بھی دوسری جگہ حقیقی معنوں میں بیان کر کے تشبیہ واستعارہ کو حقیقت کی لگام (حکم) دے کر محکم کر دیا ہے۔

۳۔ جہاں کوئی جملہ محاورہ' تشبیہ یا استعارہ کے طور پر استعمال ہوا ہے اسے دوسری جگہ حقیقی معنوں میں بیان کر کے تشبیہ واستعارہ کو حقیقت کی لگام (حکمہ) دے کر محکم کر دیا ہے۔

۴۔ جو متشابہ آیت متشابہات عالم کے کسی گوشے کی مخالفت کرتی ہے اس پر اپنی کائنات کو حاکم ٹھہرا کر محکم کر دیا جاتا ہے۔

۵۔اور جس آیت میں اجمال ہے' اس اجمال کو دوسری آیت یا آیات میں تفصیلاً بیان کر کے محکم کر دیا ہے۔

۹/۱۳ سارا قرآنِ کریم باہم ملتا جلتا یعنی متشابہ ہے۔

محکمات ومتشبہات کی بحث پر پھر ایک بار طائرانہ نگاہ دوڑائیں۔

○ سابقہ صفحات میں آپ ۱۳/۷ کے حوالہ سے ملاحظہ فرما چکے ہیں کہ قرآنِ کریم میں دو قسم کی آیات کریمات ہیں محکمات ومتشابہات۔اصل کتاب محکمات ہیں۔فلہذا متشابہات کا وہ مفہوم صحیح ہے جو محکمات کے خلاف نہ جاتا ہو۔○ اور ۱/۱۱ کے حوالہ سے آپ دیکھ چکے ہیں کہ متشابہات کو خود خداوند تعالیٰ نے محکم کر دیا ہوا ہے۔اور اس کے محکم کرنے کے پانچ مختلف طریقوں کی وضاحت بھی آپ کے سامنے آ چکی ہے۔اور اس پوری بحث کا ماحصل بھی نکھر کر سامنے آ گیا ہے کہ آیات متشابہات سے اگر چہ آیات محکمات کی مخالفت کا شبہ پیدا ہوتا ہے۔اور ٹیڑھے قلوب والے لوگ ان سے فتنہ سامانیاں کرتے ہیں۔لیکن فی الحقیقت یہ محکمات کے عین مطابق ہیں'متضاد ومخالف ہرگز نہیں اسی چیز کا اعلان ذیل کے انتہائی بلیغ انداز میں فرمایا گیا ہے:۔ ○ الله انزل احسن الحدیث کتبا متشابها مثانی ق ۲۳/۳۹

(مفہوم) اللہ ہی وہ عظیم الشان ذات ہے جس نے ایک کتاب احسن الحدیث نازل فرمائی ہے۔(جس میں تضاد واختلاف قطعاً نہیں ہے ۴/۸۲) ساری کتاب متشابہ ہے۔(یعنی آپس میں

ملتی جلتی، باہم اور متماثل اور) بار بار دہرائی ہوئی ہے۔

دیکھئے گا! کہ اس آیت پر معمولی سا غور وفکر کرنے سے بھی یہ بات نکھر کر سامنے آ رہی ہے کہ ایک طرف جہاں ۳/۷ میں کہا گیا ہے کہ پورا قرآن کریم مشتمل ہے آیات محکمات اور آیات متشابہات پر تو دوسری طرف اس آیت ۳۹/۲۳ میں اعلان کر دیا گیا ہے کہ سارے کا سارا باہم متشابہ اور متماثل ہے۔ ''نیز متشابہا مثانی'' کے دو لفظوں نے اس امر کی وضاحت کر دی ہے کہ آیات کریمات کو بار بار دہرانے' اور مختلف انداز تکلم سے بیان کرنے کی غرض' انہیں باہم متماثل ثابت کرنا ہے' جیسے کہ آپ سابقہ صفحات دیکھ چکے ہیں کہ اگر ایک آیت میں کوئی کلام محذوف ہے تو دوسری میں مذکور ہے۔ اگر ایک آیت میں کوئی لفظ مجاز یا استعارہ کے طور پر آیا ہے تو دوسری میں اس کی وضاحت کھلے لفظوں میں کر کے اشتباہ رفع کر دیا گیا ہے۔ اور یہی ہے قرآن کریم کا اسلوب بیان تفسیر القرآن بالقرآن۔

پس قرآن فہمی کا تیرہواں اصول یہ ہے کہ اس میں محکمات بھی ہیں اور متشابہات بھی ہیں۔ اصل کتاب محکمات ہیں۔ پس متشابہات جن سے محکمات کی مخالفت کا شبہ تو پیدا ہوتا ہے لیکن فی الحقیقت وہ محکمات کی مثل و مانند ہیں انہیں محکمات کے ماتحت رکھنا' اور انکا مفہوم محکمات کے مطابق لیا جانا لازم ہے۔

۱۰/۱۳ "متشابها مثانی" کی تعریف "سبعا من المثانی" کے الفاظ میں۔

آیت بالا ۳۹/۲۳ میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ پوری کتاب مثانی (یعنی دہرائی ہوئی) ہے۔ دوسرے مقام پر اس چیز کو ذیل کے الفاظ میں بیان کیا ہے:۔

o ولقد اتینک سبعا من المثانی والقران العظیمo ۱۵/۸۷ (واؤ تفسیری ہے)

(مفہوم) اے رسول سلام علیہ! بیشک ہم نے آپ کو سات دہرائے ہوئے عنوانات یعنی نہایت بلند مرتبہ قرآن عطا فرمایا ہے۔

۱۴۔ پورا قرآن کریم سات دہرائے ہوئے عنوانات ہیں۔

غور فرمایئے گا! کہ آیت بالا ۸۷/ ۱۵ میں قرآن فہمی کا ایک اور اصول بتایا گیا ہے کہ یہ عالی مرتبت کتاب سات دہرائے ہوئے عنوانات پر مشتمل ہے۔ اب ظاہر ہے کہ اس کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ کہ یا تو پوری کتاب کو سات حصوں میں تقسیم کر کے ہر حصے کی ابتداء میں عنوان کی سرخی دیدی گئی ہو۔ اور یا پھر کتاب کے شروع میں ایک ہی مقام پر ساتوں عنوانات بیان کر دیئے گئے ہوں۔ اب چونکہ امر وقعہ یہ ہے کہ نہ قرآنِ کریم سات حصوں میں منقسم ہے اور نہ ہر حصے کی ابتداء میں الگ الگ سرخیاں دی گئی ہیں۔ بلکہ اس کے شروع میں ایک ہی مقام پر سورہ فاتحہ میں سات عنوانات دیدیئے گئے ہیں۔ لہذا ثابت ہوا کہ قرآن مجید کی پہلی سورۃ مجیدہ' جو سات عنوانات کی خبر دیتی ہے' ۸۷/ ۱۵ کے اعلان سبعا من الثانی کے مطابق' اس کتاب مقدس کی فہرست اور پیش لفظ ہے' یہی وجہ ہے کہ اس سورت مجیدہ کا نام ہی سورۃ فاتحہ ہے۔ یعنی کتاب کا افتتاح کرنیوالی فلہذا:۔

قرآن فہمی کا چودھواں اصول خود قرآن کریم کی روشنی میں یہ ہے کہ پورا قرآنِ کریم سورہ فاتحہ کے سات اصولوں کے اجمال کی تفصیل ہے۔ فلہذا لازم آتا ہے کہ قرآنِ کریم کی تفسیر و تفصیل اور تبیین وتشریح میں ذیل کے سات افتتاحی اصولوں کی مخالفت ہرگز نہیں کی جانی چاہیے جہاں کسی آیت مجیدہ کے حقیقی معنی فہرستِ قرآن کے کسی بھی اصول کی مخالفت کرتے ہوں' وہاں اس کے وہ مجازی یا استعاراتی معنی لئے جانے چاہیں۔ جو سورۂ فاتحہ میں مذکور سات اصولوں میں سے کسی ایک کی بھی مخالفت نہ کرنے پائیں اب سورہ فاتحہ کے ساتوں عنوانات جن کی تفصیل و تفسیر پورا قرآن ہے بیک نظر ملاحظہ فرمائیں یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی فہرست سورہ فاتحہ میں قل محذوف کے ساتھ خود رسولِ اکرم سلامٌ علیہ اور نوعِ انسانی کو متکلم بنا کر قرآن کریم کے قاری کی زبان سے ذیل کے سات وعدے لے رکھے ہیں۔ پس یہی وہ سات اجمالی عنوانات ہیں جن کی تفصیل پورا قرآن کریم ہے۔

۱/۱۴ قرآنِ کریم کا سات نکاتی منشور۔

نیز یہی وہ سات نکاتی قرآنی منشور ہے۔ جو رسول اکرم سلامٌ علیہ نے عوام کے سامنے پیش

کرکے قرآنی تحریک ربوبیت عامہ کی ابتدا فرمائی تھی:۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم o اللہ صاحب بخشش عامہ اور رحمتِ خاصہ کے نام کے ساتھ کہہ تو اے صاحب قرآن!

۱۔۲o الحمد للہ رب العالمین o الرحمن الرحیمo ۔پوری حمد وستائش، جو کائنات کا گوشہ گوشہ بزبان حال ادا کررہا ہے، اللہ تعالیٰ کے لئے ہے جو تمام جہانوں کی جملہ مخلوق کی روزی کے سامان مہیا کرنے والا ہے۔وہ اپنی پوری مخلوق پر عام بخشش اور مخصوص رحمت کرنے والا ہے۔(یعنی وہ بلامحنت اور بامحنت دونوں انداز سے نعمتیں عطا کرنے والی ذات مقدس ہے)

۳۔o ملک یوم الدین o۔ روز جزا کا واحد مالک ہے۔(جو اس نے ربوبیت عامہ کے موافق اور مخالف اعمال کی باز پرس کے لئے خود مقرر کر رکھا ہے)

۴۔o ایاک نعبد وایاک نستعین o ۔ (اے بلامحنت اور بامحنت نعمتیں عطا کرنیوالے) ہم تیری ہی فرمانبرداری کرینگے۔اور تجھ ہی سے مدد مانگتے رہیں گے۔(یعنی ہم اقرار کرتے ہیں کہ تیرے سوا نہ کوئی فرمانبرداری کے لائق ہے۔اور نہ کوئی مدد کو پہنچ سکتا ہے۔(لہذا ایسا نہیں ہوگا کہ ہم نماز تیری پڑھیں اور مرادیں غیر اللہ سے مانگیں۔ہم ضرور ضرور عبادت واستعانت میں وصل کرینگے، فصل نہیں کرینگے)

۵۔o اھدنا الصراط المستقیم o۔(پس ہم تجھ ہی سے مدد مانگتے ہوئے دعا کرتے ہیں کہ) ہمیں اسی سیدھے راستے پر چلائے رکھ (کہ تیرے قانونِ ربوبیت کو عملاً تسلیم کریں۔جزا سزا کے دن کے لئے تیار کریں۔اور عبادت واستعانت میں وصل رکھیں فصل نہ کریں۔یعنی ایسا نہ ہو کہ نماز تیری پڑھیں اور مرادیں اور غیروں سے مانگتے رہیں۔

۶۔o صراط الذین انعمت علیھم o ۔ (نیز ہم اقرار کرتے ہیں کہ تیری عطا کردہ یہی صراطِ مستقیم) ان لوگوں کی رہ ہے جن پر تو نے انعام نبوت فرمایا تھا۔(یعنی وہ بھی تیرے اس صراط مستقیم پر ایمان رکھنے اور اسی پر عمل کرنے والے تھے)

۷۔o غیر المغضوب علیھم ولا الضالین o ۔ (ہم اقرار کرتے ہیں کہ تیرے

انعام فرمودہ یعنی جملہ نبی رسولؑ ایسی برگزیدہ جماعت تھی کہ) ان پر کبھی تیرا غصہ نہیں ہوا تھا' کیونکہ وہ تیری راہ گم کرنیوالے تھے ہی نہیں۔

۲/۱۴ تحفظ ناموس رسالت۔

غور فرمائیے گا! کہ باری تعالیٰ نے اپنی کتاب کے شروع ہی میں اس کے قاری سے اپنے مقدس نام سے شروع کرنے کا حکم دیکر' ذیل کے سات اقرار کر لئے ہیں:۔

۱۔ بلاشراکت غیرے خالص حمد باری' اور پورے جہانوں کی پوری مخلوق کی ربوبیت عامہ کا عقیدہ۔

۲۔ اللہ تعالیٰ کی بلامحنت اور بامحنت عطا کردہ بے پایاں نعمتوں میں بلاتمیز پوری مخلوق کی ضروریاتِ زندگی کے مساویانہ حق پر ایمان لانا۔

۳۔ ربوبیت عامہ کی موافقت ومخالفت کی جزا سزا کے لئے قیامت کی عدالتِ عالیہ کے قیام کا یقین' اوراس دن کے متعلق اللہ تعالیٰ کی خالص ملکیت' یعنی اس عدالت میں رشوت' سفارش اور فدیہ وغیرہ کی نفی کا عقیدہ۔

۴۔ اللہ تعالیٰ کی خالص فرمانبرداری' اوراس کی خالص استعانت میں وصل کا عقیدہ۔

۵۔ مذکورہ بالا عقائد ہی کا صراطِ مستقیم ہونا۔ اوراسی راہ پر ہمیشہ چلتے رہنے کے لئے حضور الٰہی میں دعا کرتے رہنا۔

۶'۷۔ جملہ رسل انبیاءؑ کے متعلق ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار رہنے' اور مغضوب وگم کردہ راہ نہ ہونے کا عقیدہ۔

فلہٰذا زیرِ نظر ترجمہ اور تفسیر میں مندرجہ بالا سات عنوانات کی جو قرآن کریم کا دیباچہ ہیں۔ اور پورا قرآن جن کی تفصیل وتشریح ہے' پوری پوری رعایت رکھی گئی ہے۔ جن الفاظ کے حقیقی معنی ان میں سے کسی بھی اصول کے مخالف ہوں' انکے وہ مجازی معنی لئے گئے ہیں' جو سورہ فاتحہ کے ان سات اصولوں کی مطابقت کے ساتھ ساتھ عربی قواعد اور لغت کے بھی مطابق ہیں۔

۳/۱۴ اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کے وصل کا حکم دیا ہے ان میں فصل کرنا موجب فساد ہے۔

سورہ فاتحہ میں لئے گئے مذکورہ بالا وعدوں کی مخالفت کرنے والوں کو فاسق اور مفسد قرار دیا گیا ہے:۔

ہ یضل به کثیرا ویهدی به کثیرا ط مایضل به الا الفسقین ہ الذین ینقضون عهدالله من بعد میثاقه ویقطعون ماامر الله به ان یوصل ویفسدون فی الارض اولئک هم الخسرون ہ ۲۶ - ۲۷ / ۲ - گمراہ پاتا ہے اللہ اس کے ساتھ بہت سے لوگوں کو اور ہدایت یافتہ پاتا ہے اس کے ساتھ بہت سے لوگوں کو۔ اور نہیں گمراہ پاتا اس کے ساتھ مگر فاسقوں ہی کو گمراہ پاتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں۔ جو اللہ کے ساتھ کئے گئے وعدوں کو توڑ دیتے اور اللہ تعالیٰ نے جس چیز کے وصل کرنے کا حکم دیا ہے۔ اسے منقطع کر دیتے ہیں اور اس انفصال و انقطاع کے ذریعہ زمین میں فساد پھیلاتے ہیں یہی لوگ خسارہ پانے والے ہیں۔

نیز انہی کے متعلق ارشاد ہوا ہے:۔ **ہ والذین ینقضون عهدالله من بعد میثاقه ویقطعون ما امر الله به ان یوصل ویفسدون فی الارض اولئک لهم اللعنة ولهم سوء الدار ہ ۲۵/۱۳** اور جو لوگ اللہ کے ساتھ عہد کرنے کے بعد اسے توڑ دیتے ہیں۔ اور ان چیزوں کا باہم وصل نہیں کرتے، جن کے وصل کا اللہ نے حکم دیا ہے (اور اس طرح قرآن کریم سے غیر قرآنی عقائد اعمال کا جواز ثابت کر کے) زمین میں فساد پیدا کرتے ہیں ایسے لوگوں کے لئے اللہ کی لعنت ہے۔ اور ان کے لیے برا ٹھکانہ ہے۔

دیکھئے! آیات بالا میں کافروں منکروں کا ذکر نہیں ہو رہا بلکہ ان کا ذکر ہے، جو اللہ تعالیٰ اور اس کے ضابطے پر ایمان لا کر اس سے عہد بھی کرتے ہیں۔ لیکن عہد کی توثیق کے بعد اسے توڑ دیا جاتا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ سورہ فاتحہ کے الفاظ میں مذکورہ بالا سات وعدے تو بدستور جاری رہتے ہیں۔ لیکن انہیں باانداز ذیل توڑ کر فساد فی الارض کے سامان مہیا کئے جاتے ہیں۔

ا۔ ہ اللہ تعالیٰ کی صفاتِ مخصوصہ میں جو صرف اسی کے لائق ہیں انسانوں کو شامل کر کے حمد

باری کو مجروح کیا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے قانون ربوبیت عامہ کا تصور تک گم کر کے نوعِ انسانی کے ایک طبقہ کے لئے ضروریاتِ زندگی کی محرومی اور دوسرے کے لئے نعمتوں کی فراوانی کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب، ان کی الگ الگ نام نہاد تقدیر بتا کر کمزوروں پر طاقتوروں کے ظلم کا جواز مہیا کیا جاتا ہے۔

۲۔o اللہ تعالیٰ کی بلا محنت اور با محنت حاصل کردہ نعمتوں پر انسانی تصرف کو صحیح درست اور جائز قرار دیکر فی الارض کے سامان مہیا کئے جاتے ہیں یعنی تصور دیا جاتا ہے کہ نعماءِ خداوندی پر متصرف افراد جس طرح چاہیں ضروریاتِ زندگی کی ناہموار تقسیم کرتے چلے جائیں۔

۳۔o ربوبیت عامہ کے خداوندی توازن کو عملاً ختم کر کے روز جزا (یوم الدین) کا عملی انکار کیا جاتا ہے۔ اگرچہ زبان سے مسلسل اقرار کیا جا رہا ہو۔

۴۔o اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کو باہم ملانے یعنی متوصل کرنے کا حکم دیا ہے انہیں ملانے کے بجائے جدا کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً:۔

ا۔ سورہ فاتحہ میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ عہد تو کیا جاتا ہے کہ تیری عبادت اور استعانت کو صرف تیرے لئے مخصوص رکھتے ہوئے ان کا اتصال قائم رکھیں گے۔ لیکن یہ پکا عہد جو ایاک کی ضمیر مقدم کے حصر کیساتھ دو مرتبہ کے تکرار، ایاک نعبد و ایاک نستعین ۴/۱ کے الفاظ میں بار بار کیا جاتا ہے، اسے اس طرح توڑا جاتا اور عبادت و استعانت کے اتصال کو اس طرح منقطع کیا جاتا ہے کہ نماز پڑھی جاتی ہے اللہ کی اور مرادیں مانگی جاتی ہیں غیر اللہ سے۔

ب۔ نیز اللہ تعالیٰ نے محکمات و متشابہات کے باہم وصل کرنے کا حکم دیا ہے ۳/۷ لیکن محکمات و متشابہات کے تصور تک کو گم کر کے متشابہات کو محکمات سے جدا کرتے ہوئے من مانی

ا۔۲ یضل اور یھدی فعل مزید فیہ باب افعال سے ہے جس کا خاصہ وجدان ہے اس لئے معنی لکھا گیا ہے اللہ گمراہ پاتا ہے لیکن یھدی فعل ثلاثی مجرد ہے جس کا خاصہ وجدان اہل قواعد نے تسلیم نہیں کیا۔ ہم نے یہاں بھی خاصہ وجدان کی رو سے معنی لکھا ہے کہ اللہ ہدایت یافتہ پاتا ہے۔ ثلاثی مجرد کے خاصہ وجدان کی بحث آگے آرہی ہے۔

تاویلوں کے ساتھ ابتغاء فتنہ اور فساد فی الارض کیا جاتا ہے۔

ج۔ قرآنِ کریم کے مختلف عنوانات کو فہرست قرآن کے ساتھ متوصل کرنا ضروری نہیں مانا جاتا ہے۔ حالانکہ خدا تعالیٰ نے انکے وصل کا حکم دیا ہے۔ **ولقد اتینک سبعا من المثانی والقرآن العظیم**o ۱۵/۸۷

۵۔o دعا مانگی جاتی ہے مندرجہ بالا متوازن نظامِ ربوبیت والے صراطِ مستقیم کی لیکن غیر متوازن تقدیروں کے عقیدہ کے ذریعہ اس کی شبانہ روز عملاً مخالفت کی جاتی ہے۔

۶۔o۷ اللہ تعالیٰ نے اپنے جملہ نبی رسولوںؑ کی سو فیصد عصمت کا وعدہ لیا ہے لیکن ان کی طرف جھوٹ چوری اور دھوکا فریب وغیرہ تک منسوب کر کے اس عہد کی خلاف ورزی کی جاتی ہے حضرت یوسفؑ پر بھائی کو چور بنانے کا الزام حضرت ابراہیمؑ پر تین مرتبہ جھوٹ بولنے کا بہتان اور حضرت داوٗدؑ پر دھوکے سے پرائی عورت حاصل کرنے کا افتراء باندھ کر عہد خداوندی کو توڑا جاتا اور انبیاء سلام علیہم کو صراطِ مستقیم سے ہٹا ہوا ثابت کیا جاتا ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ نے وعدہ لیا ہے کہ جملہ نبی رسولوںؑ پر اس کا کبھی غصہ نہیں ہوا تھا۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ اس مقدس جماعت پر اللہ کے غصے کا ثبوت مہیا کرتے ہوئے کسی نبی کو آرے سے چروا دیا جاتا ہے کسی کے بدن میں کیڑے ڈلوائے جاتے اور کسی کی حکومت چھنوا کر اس سے مچھیروں کی نوکری کروائی جاتی ہے۔ کسی کو پہلے جنت میں داخل کیا جاتا ہے اور پھر اس سے نکلوا کر زمین پر پھینکا جاتا ہے۔ اور کسی پر اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کے ثبوت میں اس پر کئی کئی دن تک نزول وحی کا بند بن ہو جانے کی خبر دی جاتی ہے۔ العیاذ باللہ!

۱۴/۴ تصویر کا دوسرا رخ۔

یہ تو ہوا ۲/۲۷ اور ۱۳/۲۵ کی قرآنی خبر کے مطابق سورہ فاتحہ کے الفاظ میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کے گئے عہد کو توڑنے والوں اور ان چیزوں کو ایک دوسرے سے جدا کرنے والوں کا ذکر جن کے

---

۱ اہل روایات کے ہاں بھی سورہ فاتحہ کو قرآنِ کریم کی فہرست تو تسلیم کیا گیا ہے لیکن قرآن اور اس کے دیباچہ کو باہم متوصل نہیں کیا جاتا حالانکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔ **ولقد وصلنا لهم القول لعلهم يتذكرون**o ۲۸/۵۱ اور بالتحقیق ہم نے اپنے قول کو باہم متوصل کر دیا ہے۔ تاکہ لوگ اس سے نصیحت حاصل کریں۔

ملانے کا حکم دیا گیا ہے۔اب قرآنی الفاظ میں ان لوگوں کی تعریف ملاحظہ فرمائیں جو نہ اللہ تعالیٰ سے کیئے گئے عہد کو توڑتے ہیں اور نہ ان چیزوں (یعنی عبادت و استعانت ۴/۱' محکمات ومتشابہات ۷/۳' سورہ فاتحہ اور باقی قرآن ۸۷/۱۵) کو ایک دوسرے سے جدا کرتے ہیں جن کے ملانے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دے رکھا ہے:۔

o افمن یعلم انما انزل الیک من ربک الحق کمن ھو اعمی انما یتذکر اولو الباب o الذین یوفون بعھد اللہ و لا ینقضون المیثاق o والذین یصلون ما امر اللہ بہ ان یوصل و یخشون ربھم و یخافون سوء الحساب o ۱۹تا۲۱/۱۳۔

اے رسول! وہ شخص' جو جانتا ہے کہ جو کچھ تیری طرف تیرے رب کی جانب سے نازل ہوا ہے' حق ہے کیا وہ اس شخص جیسا ہو سکتا ہے جو اس حقیقت سے اندھا ہے بلاشبہ عقلمند ہی اس سے نصیحت حاصل کرتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ کے ساتھ کئے ہوئے عہد کو پورا کرتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ کئے ہوئے واثق عہد کو توڑتے نہیں اور اس چیز کو باہم ملاتے ہیں' جس کے وصل کرنے کا اللہ نے حکم دیا ہے حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے رب کی مخالفت اور برے حساب سے ڈرتے ہیں۔

فلہذا زیرِنظر ترجمہ اور تفسیر میں آیات بالا کے مطابق نہ سورہ فاتحہ کے الفاظ میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کئے گئے عہد کو توڑا گیا ہے اور نہ ان چیزوں کا فصل کیا گیا ہے' جن کے وصل کا اللہ تعالیٰ نے ۴/۱' ۸۷/۱۵ میں حکم دے رکھا ہے۔

۱۵۔ قرآنِ کریم کی نہ کوئی آیت ہی منسوخ ہے نہ کسی آیت کا کوئی حصہ

قرآن فہمی کے ایک اور اصول کی خبر آیت ذیل میں ملاحظہ فرمائیں:

o لا تبدیل لکلمت اللہ ۶۴/۱۰۔ اللہ تعالیٰ کے کلمات کے لئے بدلنا ہے ہی نہیں۔

اگر چہ اس آیت مجیدہ میں بانداز بلیغ اعلان کر دیا گیا ہے کہ آیاتِ قرآنی میں تغیر تبدل ہرگز ہرگز ممکن نہیں لیکن آیت ذیل میں اس گمان کو بھی باطل قرار دیا گیا ہے۔عوام کے ہاں یہ نظریہ چل رہا ہے۔ کہ خدا تعالیٰ خود تو اپنے کلام میں رد و بدل کا مجاز ہے چنانچہ اعلان عام کر دیا گیا ہے کہ ہمارا قول خود ہماری طرف سے بھی ہرگز ہرگز تبدیل نہیں کیا جاتا۔اسے تبدیل کرنا تو بندوں بچاروں پر

ظلم عظیم ہے:۔

مایبدل القول لدی وما انا بظلام للعبید ٥ ۲۹/۵۰ میرے ہاں قول بدلا ہی نہیں جاتا۔اور نہ میں (اپنے قول کو بدل کر) اپنے بندوں پر ظلم کرنے والا ہوں۔اگر چہ عام تفاسیر و تراجم میں ناسخ ومنسوخ کا تصور آج تک قائم ہے۔لیکن زیر نظر ترجمہ تفسیر میں آیاتِ قرآنی کے لئے منسوخ ہوجانے کے تصور کو آیاتِ بالا کے انتہائی ٹھوس دلائل کے مطابق قریب تک پھٹکنے نہیں دیا گیا۔سورہ بقر کی آیت مجید **مـا نـنسخ من اية.....** الخ جس سے تنسیخ آیات کا جواز لیا جاتا ہے کی وضاحت ناسخ ومنسوخ کے الگ عنوان میں آگے آرہی ہے۔

پس قرآن فہمی کا پندرہواں اصول یہ ہے کہ کلماتِ خداوندی کو نہ اللہ تعالیٰ خود ہی تبدیل کرتا ہے۔اور نہ کوئی غیر ہی تبدیل کرسکتا ہے۔

(نوٹ)اس اصول کی وضاحت سولہویں اصول میں بھی ملاحظہ فرمائیں۔

۱۶۔ قرآن کریم کی حفاظت خود خداوند تعالیٰ کے ذمہ ہے۔

قرآن فہمی کے ایک اوراصول کی خبر آیت ذیل میں دی گئی ہے:۔

٥ انا نحن نزلنا الذكر وانا له لحفظون ٥ ۱۵/۹۔بیشک الذکر قرآنِ کریم کو ہم ہی نے نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کے نگہبان ہیں۔اس کے برعکس تجرید بخاری کے صفحہ ۱۰۱۴ پر حضرت عمرؓ کی روایت سے منقول ہے کہ قرآنِ کریم میں آیت رجم نازل ہوئی تھی۔لیکن اب اس میں موجود نہیں یہ روایت سالمیت قرآن کو مجروح کرنے کے ساتھ ساتھ حفاظت خداوندی کا مذاق بھی اڑاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حفاظت قرآن کا دعویٰ تو کیا تھا لیکن نباہ نہیں سکا۔کوئی زبردست ہاتھ قرآن کریم سے آیت رجم نکال کر لے ہی گیا۔آیت بالا کی رو سے آیت رجم کے نزول وخروج کا نظریہ مطلقا غلط ہے۔اگر کوئی آیت رجم نازل ہوئی ہوتی تو یقیناً یقیناً قرآن کے اندر موجود ہوتی۔اور جب موجود نہیں ہے تو ثابت ہوا کہ نازل ہی نہیں ہوئی تھی کیونکہ قرآنِ کریم بحفاظتِ خداوندی محفوظ ہے۔اسی چیز کی تائید آیت ذیل سے ہوتی ہے:۔**٥ وانه لكتب عزيز ٥ لاياتيه الباطل من بين يديه ولا من خلفه تنزيل من حكيم حميد٥** ۴۱/۴۲-۴۱ اور وہ قرآن ایک غالب کتاب ہے اس میں باطل نہ آگے کی طرف سے آسکتا ہے نہ

پیچھے کی طرف سے اس کا نازل ہونا صاحب حکمت وحمد کی طرف سے ہے۔افسوس!روایات قرآنِ کریم کے اس دعوے کی بھی تکذیب کرتی ہیں۔جیسے کہ علامہ سیوطیؒ کی اتقان میں بتایا گیا ہے کہ معوذتین یعنی قرآنِ کریم کی آخری دوسورتیں الفلق اور الناس نزولی نہیں' بلکہ الحاقی ہیں العیاذ باللہ تعالیٰ۔

آیاتِ بالا ۱۵/ ۹+ ۴۱۔۴۲/ ۴۱ کی رو سے قرآن فہمی کا سولہواں اصول یہ ہے کہ اس میں نہ کوئی کمی ہوئی ہے نہ زیادتی۔پس زیرِ نظر ترجمہ اور تفسیر میں ایسے کسی تصور کو راہ نہیں دی گئی' جو کتب روایات نے قرآنِ کریم میں سے کسی آیت یا سورت کے گم ہوجانے یا کسی غیر تنزیلی آیت یا سورت کے اضافے کا دیا ہوا ہے۔

۱۷۔اللہ تعالیٰ کی سنت یعنی اسکے کائناتی قوانین ہر گز نہیں بدلتے۔

قرآن فہمی کا ایک اور اصول آیت ذیل میں مذکور ہے:۔

○ فلن تجد لسنت الله تبديلا ولن تجد لسنت الله تحويلا ○ ۴۳/ ۳۵۔اے رسول! اور اے قرآن کریم کے مخاطب! تو اللہ تعالیٰ کی سنت میں ہرگز ہرگز تبدیلی نہیں پائے گا۔
سنت کا مطلق معنی ہے طریقہ' قاعدہ' دستور۔ر اللہ تعالیٰ کا طریقہ قاعدہ' اسکا قانون جاریہ ہے جو مشاہدات عالم کی صورت میں شبانہ روز جاری وساری ہے نیز اس کے عالمی قوانین میں مشاہدہ کی رو سے کبھی بھی تبدیلی نہیں پائی گئی۔قوانین کائنات کے اس استقلال کی خبر آیت بالا ۴۳/ ۳۵ میں دی گئی ہے۔پس اس آیت مجیدہ کے مطابق قرآن کریم سے کوئی ایسا مفہوم برآمد کرنا ہرگز ہرگز صحیح نہیں' جس میں اللہ تعالیٰ کے قوانین کائنات کی مخالفت پائی جاتی ہو۔

پس قرآن فہمی کا سترہواں اصول یہ ہے کہ آیات قرآنیہ میں قوانین کائنات کی مخالفت ہرگز موجود نہیں۔

فلہٰذا زیرِ نظر ترجمہ وتفسیر میں خدا تعالیٰ کے کائناتی قوانین کی مخالفت سے پوری پوری پرہیز کی گئی ہے۔اور قرآنِ کریم کے جن مقامات پر سابقہ تفاسیر نے کائناتی قوانین یعنی سنت اللہ کی مخالفت کی ہے اس اجمال کی تفصیل یا اس مجاز کی حقیقت کو قرآن حکیم کے دوسرے مقامات سے پیش کر کے سنت اللہ کی مطابقت کو ہمیشہ قائم رکھا گیا ہے۔

۱۸۔ قرآن کریم ایک باربط کتاب ہے پراگندہ وبے ربط ہرگز نہیں۔

دنیا بھر کی کتابوں میں سے کسی بھی کتاب کے لئے سب سے بڑا عیب یہ ہوتا ہے کہ اس کے مندرجات میں نظم وربط موجود نہ ہو۔ یعنی کوئی بات کہیں کی ہو کوئی کہیں کی۔ بات ہو رہی ہو امن کی اور اس میں آگھسے جنگ کا قصہ ذکر ہو اقتصادیات کا اور اس میں آدھمکے طبعی جغرافیہ ذکر ہو مسائل طلاق کا اور اس میں حکم دیا جارہا ہو نماز کا' سابقہ تراجم وتفاسیر نے باستثنیٰ بعضے' قرآن کریم کے نظم وربط کو مطلقاً ضائع کر کے اقوام عالم کے لئے کتاب خداوندی پر اعتراضات کے دروازے کھول دے ہوئے ہیں۔ حالانکہ اس ضمن میں اللہ تعالیٰ نے اعلان کر رکھا ہے کہ اس کا قول قرآن حکیم باہم مربوط ومتوصل ہے۔ پراگندہ اور منتشر نہیں :۔

○ ولقد وصلنا لهم القول لعلهم يتذكرون ○ ۵۱/ ۲۸۔ اور بلاشبہ ہم نے اپنے قول (قرآن) کو باہم متوصل کر دیا ہے تاکہ لوگ اس سے نصیحت حاصل کریں۔ دیکھئے! اس آیت مجیدہ میں اس امر کا اعلان کر دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے قول قرآنِ کریم کے اندر باہمی وصل وربط ہے فصل وانتشار نہیں۔ اور ساتھ ہی اس چیز کی بھی خبر دیدی گئی ہے کہ نصیحت اس کتاب سے حاصل کی جاسکتی ہے جس میں ربط وصل ہو۔ چونکہ یہ ایک مسلم امر ہے کہ جب بے ربط کلام سے کچھ پلے ہی نہیں پڑتا تو اس سے نصیحت حاصل کرنے کا تصور کس طرح پیدا ہو سکتا ہے۔ لیکن ارشاد باری کے مطابق قرآن حکیم ایک نصیحت نامہ ہے:۔ ○ ان هذه تذكرة ۱۹/۷۳+۲۹/۷۶ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے مقدس قول اور جلیل المرتبت نصیحت نامے قرآن مجید کو داخلی طور پر باہم مربوط و متوصل کر دیا ہے تاکہ لوگ نصیحت حاصل کریں۔

پس قرآن فہمی کا اٹھارہواں اصول یہ ہے کہ اس کی سورت سورت اور آیت آیت باہم منظوم ومربوط ہے۔

فلہذا ترجمہ وتفسیر زیرِ نظر میں ان تمام آیات مجیدات کا باہم ربط قائم رکھا گیا ہے جنہیں مروجہ تراجم وتفاسیر نے بے ربط کر کے رکھ دیا ہوا ہے۔ نیز قیام ربط کے لئے صرف آیات قرآنیہ اور مشاہدات عالم ہی کا سہارا لیا گیا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے قول وفعل کی ہم آہنگی ہی کو آیات کریمات کے باہمی ربط ووصل پر بطور دلیل لایا گیا ہے۔

۱۹۔ قرآنی محذوفات۔

نیز ربط آیات کے لئے ان قرآنی محذوفات کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے جو ہر زبان میں عموماً اور عربی ادب میں خصوصاً پائے جاتے ہیں۔ مثلاً سورہ یوسف میں جو بلا اختلاف ایک ہی قصے پر مشتمل ایک مربوط سورت مجیدہ ہے محذوفات کی متعدد مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً حضرت یوسفؑ کے بھائی جب دوسری مرتبہ غلہ لیکر مصر سے روانہ ہونے لگتے ہیں تو چھوٹے بھائی کی بوری سے چوری کا پیالہ برآمد ہوتا ہے' اور اسے حراست میں لے لیا جاتا ہے اس پر باقی بھائی کوشش کرتے ہیں کہ اس کی جگہ کسی اور بھائی کو رکھ لیا جائے لیکن ان کی یہ خواہش پوری نہیں ہوتی۔ تو پھر وہ الگ بیٹھ جاتے ہیں۔ سب سے بڑا کہتا ہے کہ میں تو واپس نہیں جاؤنگا۔ کیونکہ والد بزرگوار نے مجھ سے پکا عہد لیا ہوا ہے کہ یوسف کے حقیقی بھائی کو واپس ان کے پاس لے کر آؤنگا لہذا تم سب جاؤ اور والد سے کہو کہ آپ کے بیٹے نے چوری کی ہے۔ آپ اس بستی والوں سے جس میں ہم تھے۔ اور اس قافلے والوں سے جس کے ساتھ ہم آئے ہیں پوچھ کر تصدیق کر لیں۔ کہ واقعی آپ کے بیٹے نے چوری کی ہے۔ اس لئے وہ حراست میں لے لیا گیا ہے۔ اور ہم اسے واپس نہیں لا سکے۔

یہ ہیں بڑے بھائی کے الفاظ' جو اس نے والد کو کہنے کے لئے اپنے بھائیوں سے کہے۔ اب ربط کلام کی رو سے چاہیے تھا' کہ اس سے آگے یہ درج ہوتا کہ ''بڑے بھائی سے مذکورہ ہدایات لے کر باقی بھائی قافلے کے ساتھ وطن کی طرف روانہ ہوگئے اور جب منزل بمنزل چلتے ہوئے اپنی بستی میں پہنچے۔ اور والد بزرگوار نے پوچھا کہ چھوٹے بھائی کو کیوں نہیں لائے۔ تو انہوں نے جواب دیا ابا جان آپ کے چھوٹے بیٹے نے چوری کی ہے۔ اس لئے پکڑ لیا گیا ہے۔ اس کی تصدیق آپ اس بستی والوں سے جس میں ہم تھے۔ اور اس قافلہ والوں سے جس کے ساتھ ہم آئے ہیں کر لیں''۔ لیکن قرآن کریم میں یہ الفاظ جو ہم نے الٹی واوَں کے درمیان لکھے ہیں' موجود نہیں بلکہ اس پورے کلام کو حذف کر دیا گیا ہے۔ اور بڑے بھائی کے اس کلام کے عین بعد جو مصر میں ہو رہی تھی' والد محترم کا جواب درج ہے جو اپنے بیٹوں کے سفر طے کر کے آپ کے پاس پہنچنے اور ان سے چوری کا قصہ سننے کے بعد اپنی بستی میں ارشاد فرمایا تھا۔ دیکھئے قرآنی الفاظ بڑا بھائی چھوٹے بھائیوں سے کہتا ہے:۔

o ارجعوا الی ابیکم فقولو یاباںا ان ابنک سرق وما شهدنا الا بما علمنا وما کنا للغیب حفظین o واسئل القریة التی کنا فیها والعیر التی اقبلنا فیها وانا لصدقون o ۸۱۔۸۲/۱۲۔

اور بڑے بھائی کے اس کلام کے عین بعد جو سرزمین مصر میں ہو رہی تھی حضرت یعقوب کا جواب درج ہے جو بیٹوں کے ایک طویل سفر کے بعد سرزمین وطن میں دیا گیا ہے:۔

o قال بل سولت لکم انفسکم امرا ط فصبر جمیل ط ۱۲/۸۳۔ باپ نے کہا یہ بات تمہارے نفسوں ہی کی تراشیدہ ہے پس میں تو صبر جمیل ہی سے کام لوں گا۔ اب:۔

بنظر تعمق غور فرمایئے گا! کہ انا **لصدقون** کے الفاظ پر بڑے بھائی کا کلام ختم ہوا ہے۔ اور **قال بل سولت** کے الفاظ سے حضرت یعقوب کا کلام شروع ہو گیا ہے۔ درمیانی پورا واقعہ یعنی بھائیوں کا روانہ ہونا' وطن پہنچنا' والد بزرگوار کی خدمت میں آ کر بڑے بھائی کے ہدایت کردہ الفاظ پیش کرنا وغیرہ سب کچھ محذوف ہے۔

پس قرآن فہمی کا انیسواں اصول یہ ہے کہ قرآن کریم میں محذوفات کا اسلوب موجود ہے جس سے فائدہ اٹھانا لازم ہے۔

فلہٰذا زیر نظر ترجمہ تفسیر میں ربط کلام کے لئے قرآنی محذوفات کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اور اس چیز کو ہرگز ہرگز نظر انداز نہیں کیا گیا کہ اپنی کتاب لاریب کے متعلق خود اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے کہ اس میں کسی قسم کی کجی اور ٹیڑھا پن موجود نہیں ہے:۔

o الحمد الله الذی انزل علی عبده الکتب ولم یجعل له عوجا o ۱۸/۱ پوری کی پوری حمد و ستائش اللہ تعالیٰ کے لئے ہے جس نے اپنے بندے پر ایک کتاب نازل فرمائی جس میں اس نے کسی قسم کی کمی کجی اور ٹیڑھا پن ہرگز ہرگز نہیں رکھا۔

۲۰۔ ذو معنی الفاظ کا مفہوم' ان کے متعدد معنوں میں سے' وہ لیا جائیگا' جو ربط کلام' اور عربی لغت و قواعد کے بھی مطابق ہو اور مذکور بالا کسی

قرآنی اصول کیخلاف بھی نہ جاتا ہو۔

ہر زبان میں بعض الفاظ ایسے ہوتے ہیں' کہ اہل زبان کے ہاں ان کے کئی کئی مفہوم چل رہے ہوتے ہیں۔ مثلاً عربی زبان میں ضرب کا لفظ ہے۔اس کے پانچ معنی خود قرآنِ کریم میں مذکور ہیں:۔

ا۔مارنا ۲۔چلنا ۳۔کاٹنا ۴۔اوڑھنا ۵۔بیان کرنا

ا۔مارنا:۔ جو عورتیں زیور پہن کر باہر نکلیں انہیں حکم ہوتا ہے کہ وہ زمین پر زور سے پیر نہ ماریں تا کہ ان کی پوشیدہ زینت ظاہر نہ ہو:ο ولا یضربن بارجلبهن لیعلم مایخفین من زینتهن ۳۱/۲۴۔ضرب بمعنی مارنا۔

۲۔چلنا:۔جب مجاہدین اسلام گھر سے چل کر میدان جنگ میں پہنچیں تو حکم ہوتا ہے:۔

ο واذاضربتم فی الارض فلیس علیکم جناح ان تقصروا من الصلوة۱۰۱/۴
جب مومن (جہاد کے لئے) زمین میں چلیں تو کوئی ہرج نہیں کہ وہ الصلوۃ (نماز) کو کم کرلیا کریں ضرب بمعنی چلنا۔

۳۔ کاٹنا:۔جب مجاہدین اسلام کا میدان جنگ میں کفار کے ساتھ ٹکراؤ ہو تو حکم ہوتا ہے کہ ان کی گردنیں کاٹی جائیں۔

ο فاذا لقیتم الذین کفر والضرب الرقاب ۴/۴۷۔ضرب بمعنی کاٹنا

۴۔اوڑھنا:۔مومنات مسلمات کے لئے ارشاد ہوا ہے کہ اپنے گریبانوں (یعنی پورے سینوں) پر اوڑھنیاں اوڑھے رکھا کریں۔

ولیضربن بخمر هن علی جیو بهن ۳۱/۲۴۔ ضرب بمعنی اوڑھنا

۵۔بیان کرنا:۔اکملیت قرآن کے ضمن میں ارشاد باری ہے کہ ہم نے اس قرآن میں ہر قسم کے ضروری حالات بیان کردیئے ہیں:۔

ο ولقد ضربنا للناس فی هذا القران من کل مثل ۵۸/۳۰ضرب بمعنی بیان کرنا۔

پس غور فرمائیے گا:

مندرجہ بالا مثالوں سے مہر نیمروز کی طرح عیاں ہے کہ:۔

کسی ذو معنی لفظ کا مفہوم ربط کلام قرائن سیاق وسباق اور کائناتی مشاہدات کو ملحوظ رکھے بغیر متعین نہیں کیا جائے گا مثلاً اگر مندرجہ بالا مثال میں جہاں ضرب کا مقامی معنی مارنا ہے۔ اگر وہاں اس کا معنی چلنا کاٹنا' اوڑھنا یا بیان کرنا لیا جائے تو اگرچہ ضرب کے یہ سب معنی قرآن کریم میں مذکور ہیں لیکن یہ مفہوم سراسر غلط ہوگا۔ جیسے کہ مشاہدات عالم ۳۱/۲۴ کے ان ہر چہار مفہوم کی کھلے بندوں تکذیب کر رہے ہیں کہ زیورات والی خواتین اپنے پیروں کے ساتھ چلانہ کریں' پیروں کے ساتھ کاٹا نہ کریں پیروں کے ساتھ اوڑھا نہ کریں' پیروں کے ساتھ بیان نہ کیا کریں' یہ سب معنی غلط ہیں پس ثابت ہوا کہ مصدر ضرب سے متعلقہ مندرجہ بالا پانچ آیات کریمات کے جب تک مذکورہ بالا الگ الگ مفاہیم نہ لئے جائیں۔ اس وقت تک انکا الگ الگ صحیح مقامی معنی برآمد نہیں ہوتا۔ اوران پانچ مثالوں سے یہ بات بھی نکھر کر عیاں ہو رہی ہے کہ ذو معنی الفاظ کا مفہوم متعین کرنے میں لغت عرب کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کے خود مقرر کردہ قوانین جاریہ کا سہارا لینا فرض ہے یعنی جس طرح:۔

ولا یضربن بارجلھن ۳۱/۲۴ میں مصدر ضرب کے معنی متعین کرنے میں اللہ تعالیٰ کے خود مقرر کردہ قوانین کائنات ہی کا فیصلہ اٹل ہے کہ اس آیت میں چلنا' کاٹنا' اوڑھنا اور بیان کرنا چاروں معنی اس لئے غلط ہیں کہ یہ عالمی مشاہدات خداوندی قوانین میں فٹ نہیں آتے۔

پس قرآن فہمی کا بیسواں اصول یہ ہے ذو معنی الفاظ کے معنی قواعد عرب اور مشاہدات عالم کے مطابق لئے جائیں گے۔

○ فلہذا زیر نظر ترجمہ اور تفسیر میں ذو معنی الفاظ کے بالکل وہی معنی لئے گئے ہیں جو ربط کلام' سیاق وسباق اور لغت وقواعد عرب کے مطابق ہونے کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کے خود مقرر کردہ ان قوانین کائنات میں مشاہدۃً بھی فٹ آتے ہیں جو ہر آن ہمارے گردوپیش موجود ہیں۔ اور جن کی ہرگز نہ کھلنے والی زنجیروں میں پوری پوری موجودات' ابتداء آفرینش سے جکڑی ہوئی ہے۔ اور قیامت تک کے لئے جکڑی رہے گی۔

۲۱۔ کلام مقصود اور غیر مقصود میں تمیز کرنا ضروری ہے کلام غیر مقصود محال تام آتا ہے۔

قرآن کریم میں آیا ہے:۔

o ان الذین کذبو ایاتنا واستکبرو اعنها لا تفتح لهم ابواب السماء ولایدخلون الجنة حتی یلج الجمل فی سم الخیاط ۴۰/۷۔ **بیشک جولوگ** ہماری آیتوں کو جھٹلاتے ہیں۔ اور ان سے تکبر کرتے ہیں ان کے لئے آسمانوں کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے۔ نہ انہیں اس وقت تک جنت میں داخل کیا جائے گا۔ جب تک کہ سوئی کے ناکے سے موٹا رسہ نہ گزر جائے۔

جمل کا معنی اونٹ بھی ہے اور جہاز کا موٹا رسہ بھی یہاں سوئی کے ناکے کی مناسبت سے موٹا رسہ معنی لینا درست ہے۔ اونٹ معنی لینا درست نہیں۔

دیکھئے گا! یہاں کلام مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی آیات کریمات کو جھٹلانے والوں کے لئے جنت کا داخلہ قطعاً ناممکن ہے سوئی کے ناکے سے اونٹ یا جہاز کے رسے کا گزرنا کلام غیر مقصود بطور محال تام آیا ہے۔ لہذا اس سے یہ مفہوم اخذ کرنا منشا قرآن کے خلاف ہے کہ قانون جاریہ کے خلاف کسی معجزاتی یا کراماتی طور پر سوئی کے ناکے سے جہاز کا موٹا رسہ بھی گزر سکتا ہے۔ اور کسی نبی ولی کی سفارش کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی آیات کریمات کو جھٹلانے والوں اور تکبر کے ساتھ ان کا مذاق اڑانے والوں کا جنت میں بھی داخلہ ممکن ہے۔ بلکہ بتایا یہ گیا ہے کہ جس طرح سوئی کے ناکے سے باریک دھاگے کے بجائے موٹے رسے کا گزرنا محال تام ہے اسی طرح آیات اللہ کی تکذیب کرنے والوں کا اللہ تعالیٰ کے ہاں کامیاب ہونا بھی محال تام یعنی مطلقاً ناممکن ہے۔

فلہذا ترجمہ وتفسیر زیر نظر میں محالات تامہ کو جن پر مشاہدات عالم کی مہر تصدیق ہر آن ثبت ہو رہی ہے قرآن کریم کے کسی مقام پر بھی واتعاتی رنگ دیکر قوانین کائنات کی مخالفت نہیں کی گئی۔ بلکہ جس امر پر کوئی محال تام لایا گیا ہے اسے مطلق نفی کی دلیل مانا گیا ہے۔

پس قرآن فہمی کا اکیسواں اصول یہ ہے کہ کلام مقصود میں فرق کیا جائے۔ اور کلام غیر مقصود کا

سہارا لے کر قرآنِ حکیم میں کسی قسم کے چیستانی تصورات پیدا کر کے قوانین خداوندی کی مخالفت کا ارتکاب نہ کیا جائے۔

۲۲۔ انقسام مفہوم مطابق قرآنی کلیہ جات وعالمی مشاہدات۔

سورہ بقرہ میں آیا ہے کہ اہل کتاب یہود نصاریٰ کہتے ہیں کہ لوگو! یہودی ہوجاؤ یا نصرانی ہوجاؤ۔تو ہدایت پاجاؤ گے:۔

o وقالوا کونوا ھوداًاو نصری تھتدوا ۲/۱۳۵

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہود نصاریٰ کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ یہودی اور نصرانی دونوں ہدایت یافتہ ہیں؟ کیا اگر کوئی نصرانی یہودی ہوجائے تو نصاریٰ اس پر خوش ہوتے اور اسے ہدایت یافتہ مان لیتے ہیں؟ اور اسی طرح اگر کوئی یہودی نصرانی ہوجائے تو اس پر یہودی خوش ہوتے اور اسے ہدایت یافتہ گردان لیتے ہیں۔اس سوال کا جواب اسی سورت کی آیت ۱۱۳ میں دیا گیا ہے کہ یہود ونصاریٰ دونوں ہی ایک دوسرے کو گمراہ کہتے ہیں۔تو پھر ان کا متفقہ فیصلہ ہرگز نہیں ہوسکتا کہ یہودیوں کے نزدیک نصرانی اور نصرانیوں کے نزدیک یہودی ہدایت یافتہ ہیں۔ دیکھئے ارشاد باری:۔

o وقالت الیھود لیست النصری علی شئی وقالت النصری لیست الیھود علی شئی ۲/۱۱۳

لہٰذا اس آیت مجیدہ ۲/۱۱۳ اور یہود ونصاریٰ کی مشاہداتی شہادت سے بالتصریح ثابت ہوا کہ آیت نمبر ۲/۱۳۵ قالوا کونوا ھوداً اونصری کا معنی انقسامِ مفہوم کی رو سے یہ ہوگا کہ یہودی کہتے ہیں کہ یہودی ہوجاؤ تو ہدایت پالو گے۔اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ نصرانی ہوجائے تو ہدایت پالو گے۔

۲۲/۱ تحفظِ ناموسِ رسالت۔

سابقہ تراجم وتفاسیر میں قرآن فہمی کے مذکورۃ الصدر اصول کو نظر انداز کرنے سے ناموسِ رسالت تک کا عدم تحفظ پایا گیا ہے جیسے کہ سورہ بقرہ میں آیا ہے:۔

○ ام حسبتم ان تدخلوا الجنة ولما یاتکم مثل الذین خلوا من قبلکم
مستهم الباساء والضراء وزلزلوا حتی یقول الرسول والذین امنوا معه
متی نصر الله ط الا ان نصر الله قریب ○ ۲/۲۱۴۔

اس آیت کے ترجمہ میں سابقہ مشہور مترجمین شاہ رفیع لدین شاہ، اشرف علی، شاہ عبدالقادر، سید مقبول احمد شیعہ، ڈپٹی نذیر احمد اور مولوی ثناء اللہ صاحبان رحم اللہ علیہم نے یہ مفہوم پیش کیا ہے کہ سابقہ اقوام پر جب سختی کا وقت آتا تھا تو مومنوں کی جماعت اپنے رسول سمیت پکار اٹھتی تھی کہ اللہ کی مدد کب آئے گی۔ یعنی مومن بھی گھبرا جاتے تھے اور رسول بھی گھبرا اٹھتے تھے۔ حالانکہ انقسام مفہوم کے قرآنی اصول کے مطابق اس آیت مجیدہ میں اللہ کے رسول اس الزام سے بری ہیں۔ قرآنی کلیہ کے مطابق آیت مجیدہ کا صحیح مفہوم تو ذرا آگے چل کر بیان کیا جائے گا۔ پہلے آپ سابقہ مشہور تراجم میں سے شاہ اشرف علی صاحب مرحوم کا مشہور و مقبول ترجمہ ملاحظہ فرمائیں۔ جس میں دوسرے تراجم کی طرح خود رسولوں کے بھی گھبرا اٹھنے کی خبر دی گئی ہے:۔

''دوسری بات سنو کیا تمہارا خیال ہے کہ جنت میں (بے مشقت) داخل ہو جاؤ گے؟ حالانکہ تم کو ہنوز ان (مسلمان) لوگوں کا سا عجیب واقعہ پیش نہیں آیا۔ جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں۔ ان پر (مخالفین کے سبب) ایسی ایسی تنگی اور سختی واقعہ ہوئی اور (مصائب) سے ان کو یہاں تک جنبشیں ہوئیں کہ (اس زمانے کے) پیغمبر تک اور جو ان کے ہمراہ اہل ایمان تھے بول اٹھے کہ اللہ تعالیٰ کی امداد (موعود) کب ہوگی؟ یاد رکھو اللہ تعالیٰ کی امداد بہت نزدیک ہے''۔ (ترجمہ شاہ اشرف علی صاحب مرحوم)

غور فرمایئے گا! کس طرح اللہ تعالیٰ کے مقدس رسولوں گے عزم و استقلال پر حرف آتا ہے کہ خود پیغمبر تک گھبرا کر پکار اٹھتے تھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گے۔ حالانکہ انبیاء سلام علیہم کے متعلق گھبراہٹ کا سوال کیسا۔ مثلاً قوم بنی اسرائیل نے جب حضرت موسیٰ کی معیت میں ہجرت کی اور فرعون تعاقب کر کے ان کے قریب پہنچ گیا تو انہوں نے گھبرا کر کہا:۔ انا لمدرکون ۲۶/۶۱ بیشک ہم پکڑے جانے والے ہیں۔ لیکن حضرت موسیٰ نے فرمایا ہرگز نہیں میرے ساتھ میرا پروردگار ہے وہ عنقریب مجھے کامیاب کرے گا۔ قال کلا ج ان معی ربی سیھدین○

۲۶/۶۲۔

یادرہے کہ رسل انبیاءؑ کے لئے گھبراہٹ کا تصوراخذ کرنا صرف قرآنی کلیہ انقسام مفہوم کونظر انداز کرنے کا نتیجہ ہے۔اب آیت بالا ۲/۲۱۴ کا صحیح مفہوم ملاحظہ فرمائیں' جوانقسام مفہوم کے قرآنی کلیہ کے مطابق درج ذیل ہے:۔

''ایمان والو! کیاتم نے گمان کر لیا ہے کہ جنت میں داخل ہو جاؤ گے' حالانکہ ابھی تم پر وہ حالات نہیں آئے جوتم سے پہلے لوگوں پر آئے تھے۔ انہیں تنگی اور سختی پہنچی۔ اور وہ اس قدر جھنکائے گئے کہ اللہ کے رسول اور اسکے ساتھ مومن بول اٹھے۔ (مومنوں نے کہا) اللہ کی مدد کب آئے گی۔ (اللہ کے رسول نے فرمایا) یادرکھو کہ اللہ کی مدد قریب ہے آیا ہی چاہتی ہے۔

دیکھا آپ نے! کہ لف نشر غیر مرتب کے مطابق'' **یقول الرسول والذین امنوا معہ**'' کے الگ الگ قول اسی طرح انقسام مفہوم کی رو سے نکھر کر سامنے آرہے ہیں۔جس طرح'' **قالوا کونوا ھودا اونصری تھتدوا**'' میں یہود نصاریٰ کے الگ الگ اور مختلف ومتضاد اقوال بالصراحت موجود ہیں۔

پس قرآن فہمی کا بائیسواں اصول یہ ہے کہ خودقرآن حکیم اور عالمی مشاہدات کی مخالفت سے بچنے کے لئے انقسام مفہوم کے قرآنی کلیہ پرعمل کرنا ضروری ہے۔

فلہٰذا زیرنظر ترجمہ اور تفسیر میں قرآنی ہدایت کے مطابق ''انقسام مفہوم مطابق کلیات قرآنیہ ومشاہدات عالم'' کوبھی اس کے ہر مقام کے مدنظر رکھا گیا ہے۔اوراس قرآنی اصول کوبھی ہرگز نظر انداز نہیں گیا۔

۲۳۔ تشریح الفاظ وآیات بذریعہ تقابلِ ضدّین۔

قرآن حکیم میں قرآن فہمی کا ایک اور اصول بھی مذکور ہے۔وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب مقدس کے مخصوص اسلوب بیان میں ایک انداز یہ بھی رکھا ہے۔کہ بعض مقامات پر الفاظ و اصطلاحات کا مفہوم تقابل ضدین کے ذریعہ بھی واضح کرتا چلا جاتا ہے۔مثلاً الفاظ کی وضاحت کے لئے نور کی ضد ظلمت' لیل کی ضد نہار' ہدایت کی ضد ضلالت اور جنت کی ضد جہنم وغیرہ لا کرتشریح کر دیتا ہے یہی حال ہے اصطلاحات کا۔مثلاً قرآن کریم کی ایک اصطلاح ہے الصلوۃ جس کا عام

طور پر صلوۃ موقت (نماز) ہی معنی لیا جاتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے تقابلِ ضدین کے ذریعہ اس اصطلاح کا ایک معنی بتایا ہے "پوری پوری فرمانبرداری کرنا"۔ جیسے کہ سورہ قیامت میں نافرمان انسان کے متعلق ارشاد ہوا ہے:۔

فلا صدق ولا صلی ۷۵/۳۱

ولکن کذب وتولی ۷۵/۳۲

یہی تقابل ضدین ملاحظہ ہو کہ صدق کی ضد کذب آئی ہے۔ اور صلی کی ضد تولی بمعنی روگردانی نافرمانی آئی ہے۔ یعنی سچ کے مقابلہ پر جھوٹ اور صلوۃ کے مقابلے پر نافرمانی لا کر وضاحت کر دی ہے کہ صلوۃ کا ایک معنی نافرمانی کی ضد فرمانبرداری ہے۔

پس قرآن فہمی کا تیئسواں اصول یہ ہے کہ مفہوم قرآن کے لئے اس کے پیش کردہ تقابل ضدین کو ہمیشہ نگاہ میں رکھا جائے فلہٰذا زیرِ نظر ترجمہ وتفسیر میں تقابل ضدین کے قرآنی کلیہ سے بھی پورا پورا استفادہ کیا گیا ہے۔

۲۴۔ جملہ ہائے اعتراض۔

قرآنِ کریم کے اسلوبِ بیان کا ایک خاصہ یہ بھی ہے کہ اس کی آیات کریمات میں جملہ ہائے اعتراض بھی موجود ہیں۔ اگر آیت مجیدہ میں مذکورہ جملے کو الگ کر کے تقدیرِ کلام مرتب کی جائے تو فہم قرآن بالکل آسان ہو جاتا ہے۔ مثلاً ذیل کی آیت مجیدہ پر غور فرمائیں۔ اس میں خط کشیدہ الفاظ جملہ معترضہ ہے:۔

o والذین امنوا وعملوا الصلحت لا نکلف نفسا الا وسعها اولئک اصحب الجنة هم فیها خالدون o ۷/۴۲۔ خط کشیدہ جملہ جو اس آیت میں جملہ معترضہ ہے اگر الگ نہ کیا جائے تو اس کا ترجمہ یہ ہے:۔

"اور جو لوگ ایمان لائیں اور اصلاح کے کام کریں۔ ہم کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتے۔ وہ اہل جنت ہیں اس میں ہمیشہ رہیں گے۔"

متن اور ترجمہ دونوں کے خط کشیدہ جملوں پر غور فرمائیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آیت مجیدہ

سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔لیکن یادرکھیئے گا۔کہ قرآن کریم کا یہ مستقل ومخصوص طرزِ بیان ہے کہ عموماً ہر اعتراض کا جواب جو کسی جملے پر پیدا ہوتا ہے جملہ ہائے اعتراض کی صورت میں ساتھ کے ساتھ دیتا چلا جاتا ہے۔اس آیت مجیدہ میں'' امنوا وعملوا الصلحت'' کے الفاظ سے ہر ذہن پر الگ الگ دباؤ پڑتا ہے کہ نہ جانے اعمال صالحہ کتنی مشکل چیز ہے جو شائد مجھ سے ادا نہ ہو سکے فلہذ قرآن کریم نے آگے بڑھنے سے پہلے اس سوال کا جواب دے دیا ہے کہ اعمال صالحہ کا معیار ہر شخص کی ذاتی وسعت کے مطابق ہے ہم کسی فرد پر اس کی طاقت سے زائد بوجھ ڈالتے ہی نہیں۔ اس طرح ذہنی بوجھ کو ہلکا کرنے اور ذہن میں پیدا ہونے والے سوال کا جواب دے چکنے کے بعد ''امنوا وعملوا الصلحت'' کے متعلق ارشاد فرمایا ہے'' اولئک اصحب الجنة هم فيها خلدون '' یہی لوگ اہل جنت ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔فلہذا آیت مجیدہ کے مفہوم کو آسان تر کرنے کے لئے جملہ معترضہ کو الگ کرنے سے تقدیر کلام یہ ہے:۔

والذين امنوا وعملوا الصلحت ....اولئک اصحب الجنة هم

فيها اخلدون○

(مفہوم)اور جو لوگ ایمان لائے اور اصلاح کے کام کئے (جملہ معترضہ) یہی لوگ اہل جنت ہیں۔وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

جملہ ہائے اعتراض کا اسلوب قرآن کریم میں اس طرح بھی موجود ہے کہ ربط کلام کے مطابق بعض جگہ جملہ معترضہ سُو سُو ڈیڑھ ڈیڑھ سو آیات کریمات پر بھی مشتمل پایا جاتا ہے۔مثلاً سورہ نساء میں وراثت کے مسائل آیت نمبر ۱۱ تا ۱۳ میں اذيوصيكم الله تا تلک حدود الله... الخ بیان ہوئے ہیں۔اور انکا تتمہ آیت نمبر ۱۷۶ میں آیا ہے

پس قرآن فہمی کا چوبیسواں اصول یہ ہے کہ جملہ ہائے اعتراض کو نگاہ میں رکھا جائے۔

۲۵- قرآن کریم اپنی لغت آپ پیش کرتا ہے۔

انسانی لغت تغیر پذیر ہوتی ہے۔تغیر زمانہ کے ساتھ ساتھ بعض الفاظ کا مفہوم بھی بدل کر کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے۔مثلاً صبر' شکر' توکل' دین' صلوٰۃ' زکوٰۃ وغیرہ بیسیوں الفاظ ہیں جن کا مفہوم بدل

چکا ہے- لیکن خدائے علیم وخبیر نے اس مشکل کا حل بھی اپنی مکمل واکمل کتاب مجید میں خود محفوظ کر کے اسے تغیر پذیر لغتوں سے بے نیاز کر دیا ہوا ہے- اس کے نہ صرف الفاظ بلکہ ان کا مفہوم بھی زمانے کے دست برد سے محفوظ کر دیا ہے- انا نحن نزلنا الذکر و انا لہ لحافظون ○ ۱۵/۹

مثلاً لفظ:-

۱/۲۵ صبر: کا معنی آج خود عربوں کے ہاں خصوصاً اور عجمیوں کے ہاں عموماً یہ متعین ہو چکا ہے مصائب زمانہ ظالموں کے ظلم کو انتہائی بے بسی کے ساتھ برداشت کرتے چلے جانا صبر ہے- زیادہ سے زیادہ یہ کہ مدمقابل کو کہہ دیا جائے کہ میرا تو صبر ہی ہے حالانکہ قرآن حکیم نے بالفاظ ذیل، صابرین کی تعریف میں صبر کے معنی خود متعین کر دیے ہیں- ''شاہراہ زندگی میں پیش آنے والی ہر مصیبت کا اس طرح سینہ تان کر مقابلہ کرنا سستی کمزوری اور بددلی قریب تک نہ پھٹکنے پائیں-''

○ وکاین من نبی قتل معہ ربیون کثیر ج فما وھنوا لما اصابھم فی سبیل اللہ وما ضعفوا وما استکانوا واللہ یحب الصبرین ○ ۳/۱۴۶- اور نبیوں میں سے بہت سے نبی ایسے تھے کہ جن کی معیت میں بہت سے رب والوں نے (مخالفین ربوبیت) کے ساتھ جنگ کی- پھر اللہ کی راہ میں ان پر جو مصیبت آئی نہ اس سے وہ سست گام ہوئے نہ ان میں کمزوری ہی آئی اور نہ وہ (تھک ہار کر کوشش چھوڑ کر) بیٹھ گئے- حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ صابرین یعنی مشکلوں کا خم ٹھونک کر مقابلہ کرنے والوں) کو پسند کرتا ہے- اسی طرح:-

۲/۲۵ شکر: کا معنی بھی قرآنی لغت کے خلاف متعین ہو چکا ہے کہ ناہموار نظام کی غلط بخشیوں کی بدولت اگر بھوک، ننگ، اور ذلت ومسکنت کسی پر مسلط ہوتی چلی جائے تو اس پر خوش رہے- اور یہ کہے کہ باری تعالیٰ، تیرا شکر ہے کہ تو نے مجھ پر، کہیں اس سے بڑی ذلت مسلط نہیں کر دی- حالانکہ اللہ تعالیٰ نے بھوک ننگ کا نہیں، بلکہ نعمتوں کا شکر ادا کرنے کا حکم دیا ہے:-

○ واشکروا نعمت اللہ ان کنتم ایاہ تعبدون ○ ۱۶/۱۱۴- اللہ تعالیٰ کی نعمت کا شکر ادا کرو، اگر تم اسی کے فرمانبردار ہو- سورہ دہر میں شکر کا معنی ''محنت وکوشش کا بھرپور نتیجہ'' بتایا گیا

ہے- چنانچہ اہل جنت کے متعلق ارشاد ہوا ہے:-

٥ وجزهم بما صبروا جنة وحريرا ٥ ۷۶/۱۲-ان کے مستقل مزاج رہنے کا بدلہ جنت اور ریشم-------انہیں کہا جائے گا-

٥ ان هذا كان لكم جزاء وكان سعيكم مشكورا ٥ ۷۶/۲۲-بے شک تمہارے اپنے عملوں کا بدلہ ہے-

حقیقت یہ ہے کہ تمہاری سعی مشکور ہے (یعنی تمہاری محنت وکوشش کا یہ بھرپور نتیجہ ہے جو تمہیں میسر آیا ہے) سورہ بقرہ میں آیا ہے:-

٥ فان الله شاكر عليم ۲/۱۵۸-پس اللہ تعالیٰ محنت کا بھرپور ثمر عطا کرنے والا صاحب علم ہے-

پس قرآنی لغت کی رو سے شکر کا معنی ہے ایسی بھرپور کوشش کرنا' کہ اس کا بھرپور نتیجہ برآمد ہو خواہ وہ کوشش قوانین کائنات سے متعلق ہو' خواہ قوانینِ شرعیہ سے متعلق-

۳/۲۵ توکل: صبر اور شکر کے بعد توکل کا معنی بھی مطلقاً غیر قرآنی مشہور ہو چکا ہے کہ جو کام بلاسوچے سمجھے کیا جائے یا جسکی تکمیل کے اسباب موجود ہی نہ ہوں' تو اس کے لئے کہا جاتا ہے توکل بر خدا- حالانکہ قرآنِ کریم نے' معاملہ درپیش کے متعلق پہلے تو خود آنحضور سلام علیہ کو صحابہؓ کے ساتھ مشاورت کا حکم دیا ہے:-٥ وشاورهم في الامر ۳/۱۵۹ اور جب آپس کے پورے غور وخوض کے ساتھ لائحہ عمل مرتب کر لیا جائے تو پھر ارشاد ہوتا ہے:-٥ فاذا عزمت فتوكل على الله ۳/۱۵۹ پھر جب تو باہمی مشاورت کے بعد طے شدہ پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کا ارادہ کرے تو پھر اس پروگرام پر پورا پورا عمل کرتے ہوئے اللہ پر توکل کر-

دیکھا آپ نے! کہ قرآنی لغت میں بلاسوچے سمجھے کام کرنے کو توکل نہیں بتایا گیا- بلکہ کابینہ کا بورڈ بٹھا کر اور معاملہ درپیش کے ہر پہلو پر نگاہ رکھتے ہوئے لائحہ عمل مرتب کرنے اور اس پر پورا پورا عمل کرنے کو توکل کہا ہے-توکل کا لفظی معنی ہے بھروسہ کرنا- اب ظاہر ہے کہ معاملہ درپیش کے متعلق مجلسِ مشاورت میں جو طریق کار مرتب کیا جائے گا- اس کا اللہ تعالیٰ کے ان کائناتی

قوانین کے عین مطابق ہونا لازم ہے۔جن کے متعلق اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے لا تبدیل لکلمت اللہ ۶۴/۱۰ اور فلن تجد لسنت اللہ تبدیلا ۴۳/۳۵۔اور یہی وہ قوانین خداوندی ہیں جو کبھی دھوکا نہیں دیتے۔مثلاً یہ امر نا قابل تردید ہے کہ لوہا پانی میں ڈوب جاتا ہے۔لیکن جب اس کی چادر بنا کر جہاز بنالیا جائے۔تو قوانین خداوندی کے مطابق نہ صرف یہ کہ لوہا خود تیرنے لگتا ہے بلکہ سینکڑوں افراد کو بھی سمندر پار لے جاتا ہے اسی طرح قوانین خداوندی کے مطابق ریلیں موٹریں اور ہوائی جہاز وغیرہ اس وقت تک کبھی دھوکا نہیں دیتے جب تک حضرتِ انسان سے کوئی قانونی تقصیر واقع نہ ہو۔فلہٰذا قرآنی لغت کے مطابق اللہ تعالیٰ کے خود پیدا کردہ مقرر کردہ قوانین کائنات پر بھروسہ کرنا توکل علی اللہ ہے۔

۴/۲۵: دین۔ اسی طرح ایک لفظ ہے ''دین''۔جس کے معنی رسمی نماز روزہ لے گیا ہے۔ اور محض نماز روزہ ادا کرنے والے کو کہا جاتا ہے کہ بڑا دیندار ہے۔خواہ وہ اصل دین یعنی ربوبیت عامہ کے تصور تک سے ناآشنا ہو۔قرآنِ کریم نے سورہ یوسف میں دین الملک ۷۶/۱۲ بمعنی شاہ مصر کا قانون' اور سورہ نور میں زانی اور زانیہ کو سزا دینے میں رعایت نہ برتنے کے حکم میں'' ولا تاخذکم بھما رافۃ فی دین اللہ ۲/۲۴ کے الفاظ لاکر' کہ اللہ کے قانون میں تمہیں ان پر رحم نہیں آنا چاہیے خود بتادیا ہے کہ دین کا ایک معنی قانون ہے۔کسی بادشاہ کا قانون ہو تو اسے دین الملک کہا جاتا ہے۔اور اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ قانون دین اللہ کہلاتا ہے۔قانون کی اساس چونکہ عدل وانصاف پر قائم ہوتی ہے۔اس لئے قرآن نے یوم الدین کہا ہے عدل وانصاف کے دن' یعنی بدلے کے دن کو اوپر بتایا جاچکا ہے کہ:۔

قرآنی لغت کے مطابق اصل دین ہے ربوبیت عامہ قرآنِ کریم کی بنیادی تعلیم صرف اور صرف ربوبیت عامہ ہے۔جیسے کہ اس مقدس ضابطہ حیات کی ابتداء بھی ربوبیت عامہ ہی سے ہوئی ہے:۔ الحمد للہ رب العلمین ۱/۱ اور اس کا اختتام بھی ربوبیت عامہ ہی پر ہوا ہے:۔ اعوذ برب الناس ۱/۱۱۴۔چنانچہ سورہ ماعون میں بالصراحت بتادیا گیا ہے کہ ربوبیت عامہ اصل دین الٰہی ہے:۔

بسم الله الرحمن الرحیم ○	اور اللہ صاحب بخشش عامہ اور رحمت خاصہ کے نام کے ساتھ غور کر
ارء یت الذی یکذب بالدین ○ فذالک الذی یدع الیتیم ○ ولا یحض علی طعام المسکین ○ فویل للمصلین ○ الذین ھم عن صلاتھم ساھون ○ الذین ھم یرائون ○ ویمنعون الماعون○ ع	کیا تو نے اس شخص پر غور کیا' جو اللہ کے دین کو جھٹلاتا ہے- یہ وہ ہے جو بے سہارہ لوگوں کو دھکے دیتا ہے' اور جو افراد کسی وجہ سے ساکن ہو جائیں' ان کی غذائی ضروریات تک بہم پہچانے کی ترغیب نہیں دیتا- تباہی ہے ان مصلین (نمازیوں) کے لئے جو اپنی صلوۃ سے بے خبر ہیں- جو نمازیں دکھلاوے کی پڑھتے ہیں- اور رزق کے سرچشموں کو روک دیتے ہیں (کہ وہ ضرورتمندوں تک نہ پہنچنے پائیں)

دیکھا آپ نے! آیات بالا میں کس وضاحت کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ قرانی لغت کی رو سے دین کا معنی بلا تمیز اعلیٰ وادنیٰ سب کی ربوبیت کرنا ہے- اور جو لوگ رزق کے سرچشموں پر قابض ہو کر ربوبیت عامہ میں رکاوٹ بن جائیں وہ دین کو جھٹلانے والے ہیں- یعنی اللہ کے دین کی تصدیق ربوبیت عامہ کو بروئے کار لانا ہے- اسی آئین ربوبیت کو قرآن کریم میں الدین کہا گیا ہے- اور اسی آئین سے متعلقہ باز پرس کے دن کو یوم الدین کہا ہے-

۵/۲۵ سحر اس لفظ کا معنی عام تفاسیر و تراجم میں لیا گیا ہے جادو- اور جادو سے مراد لی جاتی ہے نام نہاد کالا علم یعنی زبان سے کچھ الفاظ ادا کئے جائیں اور آدمی کا گھوڑا یا گھوڑے سے مکھی بن جائے- قرآن کریم نے تقابل ضدین کے ذریعہ سحر کا معنی بتایا ہے جھوٹ کیونکہ یہ لفظ قرآنِ کریم میں حق کے مقابلے پر لایا گیا ہے:-

فلما جاء ھم الحق من عند نا قالوا ان ھذا لسحر مبین ۱۰/۷۶- پس جب ان کے پاس ہماری طرف سے حق سچ آ گیا تو انہوں نے کہا یہ ظاہرا سحر (ظاہرا جھوٹ

ہے) جھوٹ چونکہ دھوکا دہی کے لئے بولا جاتا ہے اس لیے قرآن نے سحر کا معنی دھوکا بھی بتایا ہے:-

قل من رب السموات السبع ورب العرش العظیم ○ سیقولون .... قل فانی تسحرون ○ ۸۶تا۸۹/۲۳ اے رسول! ان سے پوچھیئے گا کہ یہ ان گنت سماوات اور یہ عظیم سلطنت کس کی ہے- وہ ضرور کہیں گے اللہ کی ہے آپ کہہ دیجئے گا کہ پھر تم کو کہاں سحر ہو گیا ہے یعنی پھر تمہیں اللہ کے ساتھ شریک کرنے میں کہاں دھوکا لگ گیا ہے- پس قرآنی لغت کے مطابق سحر کا معنی جھوٹ اور دھوکا ہے جادو نہیں-

۲۵/۶ اذن: اسی طرح کا ایک لفظ اذن-جس کا معنی اجازت و حکم بھی ہے اور قانون بھی:-

اذن للذین یقتلون بانھم ظلموا ۳۹/۲۲- جن لوگوں کے ساتھ جارحانہ جنگ کی جائے- انہیں مدافعانہ جنگی کی اجازت دی گئی ہے یہ تو ہوا اذن بمعنی اجازت- اس کے علاوہ قرآنی لغت کی رو سے اذن کا معنی قانون بھی ثابت ہے- **فانزلنا به الماء فاخرجنا من کل الثمرات ... والبلد الطیب یخرج نباته باذن ربه والذی خبث لایخرج الا نکدا** ۵۷تا۵۸/ ۷- پس ہم اس بادل کے ذریعہ پانی نازل کرتے ہیں- پھر ہم اس پانی کے ساتھ ہر قسم کے میوے نکالتے ہیں- اور جو عمدہ زمین ہے اس کی نباتات اللہ کے اذن (قانون) کے ساتھ عمدہ اور تندرست پیدا ہوتی ہے- اور جو خبیث یعنی ناقص زمین ہے اس میں سے اللہ کے اذن یعنی قانون سے ناقص پیداوار نکلتی ہے- دیکھئے ان آیات کریمات میں بتایا گیا ہے کہ اللہ کے اذن کے ساتھ عمدہ زمین سے عمدہ پیداوار نکلتی ہے اور ناقص زمین سے ناقص پیداوار پیدا ہوتی ہے- اور یہی اللہ تعالٰی کا قانون جاریہ ہے- جس کے لئے اذن کا لفظ لایا گیا ہے- پس ثابت ہوا کہ خود قرآنی لغت کی رو سے اذن بمعنی قانون بھی ہے- اللہ تعالٰی نے اپنے قانون کی اس حد تک اہمیت بیان فرمائی ہے کہ قرآن کریم کے متعلق جو مشہور ہے کہ اسکی آیات کریمات کے ساتھ خرق عادات کا ظہور ہو سکتا ہے- ایسے نظریات تک کا بطلان کر کے اعلان کر دیا گیا ہے- کہ جادو سحر وغیرہ کا روئے زمین پر وجود تک ہی موجود نہیں- جیسے کہ ارشاد باری ہے:- **ولوان قرانا سیرت به الجبال اوقطعت به الارض او کلم به الموتی بل الله الامر جمیعا ○** ۳۱/۱۳- اگر (کوئی

پڑھنے کی چیز یعنی) قرآن ایسا ہوتا' جس سے پہاڑ چلائے جاسکتے - یااس سے زمین کی مسافت طے کی جاسکتی یااس کے ذریعہ مردوں کے ساتھ باتیں کی جاسکتی (تو اس قرآن کے ساتھ بھی ایسا ہوسکتا تھا) حقیقت یہ ہے کہ سب کے سب کام اللہ ہی کے لئے ہیں- یعنی اللہ کے قانون کے مطابق ہی طے پاتے ہیں اب امر بمعنی قانون بھی قرآن کریم ہی کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں-

۲۵/۷ الامر: امر بمعنی کام اور مہم بھی آیا ہے:- **وشاورهم في الامر ۱۵۹/۳**- اے رسول سلامٌ علیہ! اہم کاموں' مہموں کے لئے صحابہؓ کے ساتھ مشورہ فرمایا کریں- لیکن امر بمعنی قانون بھی قرآنِ کریم میں آیا ہے- ۵ **الم تران الله سخر لكم مافي الارض والفلك تجرى في البحر بامره** ۶۵/۲۲- کیا تو نے غور نہیں کیا- یعنی تجھے غور کرنا چاہیے کہ بیشک زمین میں جو کچھ بھی ہے اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے خصوصا کشتیاں' جو سمندر میں اللہ کے امر (قانون) کے ساتھ چلتی ہیں- دیکھئے یہاں بتایا گیا ہے کہ کشتیاں اللہ کے امر کے ساتھ چلتی ہیں- اب اظہر من الشمس ہے کہ کشتیاں اور لوہے کے بڑے بڑے جہاز اسی وقت سمندروں میں تیرتے ہیں- جب اللہ تعالیٰ کے اس قانون کے مطابق بنائے گئے ہوں جو اس نے خود مقرر کر دیا ہوا ہے کہ پانی میں تیرتی صرف وہ چیز ہے جو اپنے حجم کے پانی کے وزن سے ہلکی ہو- اور جو چیز اپنے حجم کے پانی کے وزن سے بھاری ہو' وہ ڈوب جاتی ہے- پس یہی اللہ تعالیٰ کا قانون ہے- جس کے لئے اس آیت میں امر کا متبادل لفظ آیا ہے **والفلك تجرى في البحر بامره**-

۲۵/۸- قرآنِ کریم میں بعض مقامات پر لفظ اللہ سے مراد اللہ کا قانون ہے-

۱- سورہ نساء میں منافقوں کے ایک قول کے متعلق ارشاد ہوا ہے:- ۵ **وان تصبهم حسنة يقولوا هذه من عندالله وان تصبهم سيئة يقولوا هذه من عندك وقل كل من عندالله فمال هولاء القوم لايكادون يفقهون حديثا** ۷۸/۴ عام تراجم میں اس آیت کا معنی یہ لیا گیا ہے کہ:- ان منافقوں کو اگر کوئی فائدہ پہنچتا ہے تو کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف

سے آیا ہے۔ اور اگر کوئی نقصان پہنچتا ہے تو (اے رسول سلامٌ علیہ! آپ کو) کہتے ہیں کہ یہ تیری طرف سے ہے' آپ کہہ دیجئے گا کہ (نفع نقصان) سب اللہ کی طرف سے ہے۔ پھر انہیں کیا ہو گیا ہے کہ یہ بات کو سمجھنا نہیں چاہتے۔ (ملخص تراجم شاہ اشرف علی صاحب مولوی احمد علی صاحب' مولوی ثناء اللہ صاحب اور مقبول احمد شاہ صاحب شیعہ)

۲۔ اب دیکھئے! اس کل من عنداللہ کا مفہوم' روایتی تراجم نے یہ لیا ہے نفع اور نقصان' سکھ اور دکھ سب اللہ کی طرف سے ہے کتب روایت میں ہے کہ بھلائی اور برائی روز ازل کی لکھی ہوئی ہے (بخاری شریف کتاب الصلوٰۃ) یعنی آیت بالا میں منافقوں کو اسی روایتی مفہوم کی مخالفت پر تنبیہ کی گئی ہے۔ کہ انہیں کیا ہو گیا ہے کہ یہ بھلائی کو اللہ کی طرف اور برائی کو رسولوں کی طرف کیوں منسوب کرتے ہیں۔ بلکہ چاہیے یہ کہ بھلائی اور برائی دونوں کو اللہ کی طرف منسوب کریں۔ لیکن یہاں ایک ایسی ٹھوکر کھائی گئی ہے کہ اگر اس کو سمجھا نہ جائے اور آیت بالا کا مفہوم منشا خداوندی کے مطابق نہ لیا جائے تو اس سے اگلی آیت مجیدہ' معاذ اللہ استغفر اللہ منافقوں کے قول کی تصدیق اور خداوندی قول کی تکذیب کرتی ہے دیکھئے ارشاد ہوتا ہے:۔

○ ما اصابک من حسنۃ فمن اللہ وما اصابک من سیۃ فمن نفسک ۷۹/۴۔ اور اے رسول! آپ کو جو بھلائی پہنچتی ہے۔ پس وہ اللہ کی طرف سے ہے اور جو آپ کو برائی پہنچتی ہے وہ خود آپ کی طرف سے ہے اب غور فرمایئے گا کہ ۷۸/۴ میں منافقوں کے متعلق بھی تو ان کے اسی قول کی خبر دی گئی ہے کہ بھلائی اللہ کی طرف سے ہے اور برائی آپ کے طرف سے ہے۔ اور یہاں خود بھی یہی کچھ کہا جا رہا ہے کہ بھلائی اللہ کی طرف سے ہے اور برائی آپ کی طرف سے۔ تو پھر منافقوں پر لایفقھون حدیثا کی تنبیہ نازل کرنا کہاں کا انصاف ہوا؟

حقیقت حال:

اب چونکہ اللہ تعالیٰ اس عیب سے پاک ہے کہ اگر منافق بھلائی کو اللہ کی طرف اور برائی کو رسول کی طرف منسوب کریں' تو انہیں ڈانٹ پلا دے۔ اور آپ اگلی ہی آیت میں وہی کچھ کہہ دے جس پر منافقوں کو متنبہ کیا گیا ہے۔ فلہٰذا ۷۸/۴ کے الفاظ ھذہ من عنداللہ میں لفظ اللہ

سے مراد اللہ ہے۔ اور کل من عند الله میں لفظ اللہ سے مراد اللہ کا قانون ہے۔ اور آیت مجیدہ ۴/۷۹ اسی مفہوم کی تائیدی اور تفسیری آیت ہے۔ اب ہر دو آیات کریمات کا مسلسل قرآنی مفہوم ملاحظہ فرمائیں۔

وان تصبهم حسنة يقولوا هذه من عندالله وان تصبهم سية يقولوا هذه من عندک قل کل	اور اگر انہیں کوئی بھلائی پہنچتی ہے تو کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے۔ اور انہیں برائی پہنچتی ہے تو (اے رسول سلام علیہ! آپ کو) کہتے ہیں کہ یہ آپ کی طرف سے ہے۔ (یعنی آپ کی غلط تدابیر کا نتیجہ ہے)
من عندالله فمال هولاء القوم لا يكادون يفقهون حديثاً o ۴/۷۸	آپ کہہ دیجئے گا کہ حقیقت یہ ہے کہ بھلائیاں اور برائیاں سب اللہ کے قانون کے مطابق آتی ہیں۔ پھر انہیں کیا ہو گیا ہے۔ کہ یہ بات کو سمجھنا چاہتے ہی نہیں۔

یعنی واضح یہ کیا گیا ہے کہ مثلاً اگر راہ میں پڑے ہوئے پتھر سے بچ کر نکل جائیں تو ٹھوکر نہیں لگتی' یہ بھلائی بھی اللہ کے قانون کے مطابق آتی ہے کہ پاؤں اس لئے محفوظ رہا ہے کہ' پاؤں اور پتھر کا تصادم نہیں ہوا۔ اور اگر غفلت و بے توجہی کی بدولت پاؤں اور پتھر میں تصادم ہو جائے تو یہ تکلیف و برائی بھی اللہ کے قانون کے مطابق آتی ہے کہ پاؤں اور پتھر کے تصادم میں پتھر کا کچھ نہیں بگڑیگا پاؤں ہی زخمی ہوگا۔ چنانچہ منافقوں کو متنبہ کیا گیا ہے کہ جہاں برائیاں' سیات کسی غلط تدبیر کا نتیجہ ہوتی ہیں' جو قانونِ خداوندی کی مخالفت پر مبنی ہوتی ہے۔ وہاں حسنات بھی حسن کا نتیجہ ہیں جو قانونِ خداوندی کی موافقت کا ماحصل ہوتا ہے اور اس مستقل قانون کے مطابق اگلی آیت مجیدہ میں خود آنحضور سلام علیہ کو بھی متنبہ کر دیا گیا ہے کہ آپ بھی ہمارے اس قانون سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ اور یہ تو منافقوں کا تذکرہ تھا۔ لیکن اس سے آگے آپ بھی سن لیجئے گا:۔

ما اصابک من حسنة فمن	(اے رسول!) خود آپ کو بھی جو بھلائی پہنچے گی۔ وہ

اللہ وما اصابک من سیئۃ فمن نفسک وارسلنک للناس رسولا وکفی باللہ شہیدا ۞ ۴/۷۹

بھی اللہ کے قانون کے مطابق ہی پہنچے گی (یعنی وہ آپ کے ان افعال کا نتیجہ ہوگی جو قانونِ خداوندی کے مطابق ہوں گے) اور آپ کو جو تکلیف پہنچے گی (وہ بھی اللہ کے قانون کے مطابق پہنچے گی) وہ خود آپ کی طرف سے ہوگی (یعنی کسی تدبیری کمزوری کا نتیجہ ہوگا۔ ہمارا قانون کسی کی رعایت نہیں کرتا) ہم نے آپ کو لوگوں کے لئے پیغام رساں بنا کر بھیجا ہے۔ (قانونِ مشیت میں دخیل نہیں بنایا) اور اس پر خود اللہ تعالیٰ ہی کافی گواہ ہے

آیاتِ بالا میں آپ نمبر ۱ اور نمبر ۲ کی بحث دیکھ چکے ہیں کہ اگر روایاتی تراجم کے مطابق یہاں لفظ اللہ سے مراد اللہ کا قانون نہ لیا جائے۔ تو پہلے نمبر پر آیات نمبر ۴/۷۸ اور ۴/۷۹ میں تضاد وتخالف پایا جاتا ہے اور یہ باہم متصادم پائی جاتی ہیں اور دوسرے نمبر پر معاذ اللہ قولِ الٰہی کی تکذیب اور منافقوں کے قول کی تصدیق ہوتی ہے۔

فلہٰذا ترجمہ اور تفسیر زیرِ نظر میں ان آیات کریمات کے فیصلے کے مطابق کہ قرآنی لغت میں لفظ اللہ سے اللہ کا قانون بھی مراد ہے۔ اس لئے سیاق وسباق اور ربطِ کلام کے مطابق بعض مقامات پر اللہ سے مراد اللہ کا قانون لیا گیا ہے۔

---

۱ ہمیں ناموسِ رسالت ہر آن عزیز ہے۔ تدبیری کمزوری کے الفاظ سے کوئی حرف آنحضرت کی ذاتِ اقدس پر ہماری طرف سے تصور نہ کریں۔ یہ بالکل اسی طرح ہے کہ جیسے ایک جنگ کے موقعہ پر کچھ منافقوں نے عذر بہانے کر کے جنگ میں عدمِ شمولیت کی اجازت لے لی تھی۔ اور اس پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو متنبہ فرمایا تھا:۔ لم اذنت لھم ۹/۴۳ ۔ آپ نے کیوں اجازت دے دی ہے۔ اور اس طرح جو نقصان ہوا اس کی وضاحت آیت مجیدہ کے اگلے الفاظ میں کی گئی ہے:۔ ۞ حتی یتبین لک الذین صدقوا وتعلم الکذبین ۞ ۹/۴۳۔ اس طرح آپ پر سچے مسلمان نکھر کر عیاں ہو جاتے۔ اور جھوٹوں یعنی منافقوں کو آپ جان لیتے۔

۲۶ – اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول

جس طرح قرآنی الفاظ کے معانی کے ضمن میں سابقہ تفاسیر وتراجم میں نفسِ مضمون، سیاق وسباق کلام اور حقیقت حال سے بے اعتنائی برتی گئی ہے۔ اسی طرح بعض جملوں کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک روا رکھا گیا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم کا ایک جملہ ہے:۔ اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول۔

۲۶/۱۔ حکم صرف اللہ تعالیٰ کا ہے۔

سابقہ تفاسیر وتراجم نے اس جملہ کہ اطیعوا اللہ سے مراد ہے قرآن کی اطاعت اور اطیعوا الرسول سے روایات کی اطاعت مقصود ہے۔ یعنی اس آیت کریمہ سے دین اسلام میں اللہ تعالیٰ اور رسول سلام علیہ کی دو الگ الگ اطاعتوں کا تصور دیا جاتا ہے لیکن آیت ذیل کے مطابق قرآن کریم کی رو سے اللہ اور رسول سلام علیہ کی الگ الگ دو اطاعتوں کا تصور تک پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ اطاعت ہوتی ہے حکم کی۔ اور صاحب حکم صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے:۔

○ ان الحکم الا للہ ۶/۵۷+۱۲/۴۰۔ اللہ کے سوا کسی کا حکم ہے ہی نہیں نیز فرمایا۔

○ لایشرک فی حکمہ احداo ۱۸/۲۶۔ وہ اپنے حکم میں کسی ایک کو بھی شریک نہیں ٹھہراتا آنحضور خود بھی اللہ تعالیٰ ہی کے مطیع[1] تھے۔ اور صحابہؓ کو بھی اللہ تعالیٰ ہی کی اطاعت کا حکم دیا کرتے تھے۔ نیز ہر نبی رسول سلام علیہ کا یہی حال تھا:۔

۲۶/۲ اللہ کے رسول اپنی نہیں، بلکہ خالص اللہ تعالیٰ کی اطاعت کراتے تھے:

○ ماکان لبشر ان یوتیہ اللہ الکتب والحکم والنبوۃ ثم یقول للناس کونوا عبادا لی من دون اللہ ولکن کونوا ربنین بما کنتم تعلمون الکتب و بما کنتم

---

[1] آنحضور کو حکم تھا:۔ ○ اتبع ما اوحی الیک من ربک ۶/۱۰۵o+ واتبع مایوحی الیک ۱۰/۱۰۹۔ اے رسول اس کتاب کی اتباع کیجئے گا جو آپ کی طرف آپ کے رب کی طرف سے وحی کی گئی ہے

تدرسون ۵ ۷۹/۳

(مفہوم) اور نہیں لائق واسطے اس بشر کے کہ اللہ اسے اپنی کتاب دے اور (کتاب کے ساتھ) حکم (کرنے کا اختیار) دے۔ یعنی اسے خلعت نبوت عطا کرے۔ پھر وہ لوگوں کو یہ کہے کہ اللہ کے ساتھ ساتھ [۱] میرے بھی بندے بنو۔ (یعنی اللہ کی اطاعت بھی کرو اور میری اطاعت بھی کرو) بلکہ (اسکا فرض ہے کہ یہ کہے لوگو!) رب والے بن جاؤ! (خالص اللہ کا حکم مانو) کیونکہ تم اللہ ہی کی کتاب کی تعلیم و تدریس کرتے ہو۔

۲۶/۳۔ اصل مطاع اللہ تعالیٰ ہے۔

فلہٰذا اللہ کے نبی رسول تو لوگوں کو رب والے (یعنی خالص اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار) بنانے کے لئے مبعوث کیے جاتے تھے، اپنی اطاعت کروانے کے لئے نہیں آتے تھے۔ پھر مسئلہ زیر بحث پر جب اس قرآنی اصول کے مطابق غور کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور صاحب حکم ہے ہی نہیں۔ تو جملہ اطیعوا الرسول کا مفہوم خود لفظ رسول کے اندر سے پھوٹ پھوٹ کر عیاں ہو جائیگا۔ کہ رسول اللہ کا معنی اللہ کا پیغام پہنچانے والا ہے۔ نہ کہ اپنا کوئی حکم دینے والا۔ اور جب آنحضور بدلائل ذیل، اللہ کا پیغام پہنچانے والے تھے:۔

۰ ما محمد الا رسول ۱۴۴/۳۔ محمد صرف اللہ کا پیغام پہنچانے والے ہیں۔

۰ ما علی الرسول الا البلغ ۹۹/۵۔ رسول کے ذمہ صرف اللہ کا پیغام پہنچانا ہے۔

پس یہ چیز نکھر کر عیاں ہو چکی، کہ اطیعوا الرسول کا معنی یہ ہے کہ ہمارے پیغام کی اطاعت کرو، جو ہم نے اپنے پیغام پہنچانے والے کے ذریعہ بھیجا ہے۔ اور اس حقیقت کے پیش نظر، کہ حاکم صرف

(گزشتہ سے پیوستہ) اور اس کی حکم تعمیلی صورت کا اعلان خود آنحضور کی زبان سے کرادیا گیا ہے:۔ ان اتبع الا ما یوحی الی ۵۰/۶+۹/۴۶۔ میں صرف اور صرف اس (کتاب) کی اتباع کرتا ہوں جو میری طرف وحی کی گئی ہے۔ (حاشیہ صفحہ ہذا)

[۱] من دون اللہ کا معنی قرآنی لغت کے مطابق اللہ کے سوا بھی ہے۔ اور اللہ کے ساتھ بھی ہے تفصیل، حروف کی بحث میں آگے آرہی ہے۔

اللہ تعالیٰ ہے ۵۷/۶+۴۰/۱۲۔ وہ اپنا حکم اپنے رسولوں ہی کے ذریعہ پہنچاتا ہے' خود سامنے نہیں آتا تو پورے جملہ اطیعو اللہ و اطیعو الرسول کا معنی ثابت ہوا کہ اللہ کی اطاعت کرو یعنی اس کے حکم نامے کی اطاعت کرو جو اس نے رسول عربی کے ذریعے تمہاری طرف نازل فرمایا ہے۔" پس اطیعو اللہ و اطیعو الرسول کی درمیانی واؤ مغائرت کی نہیں بلکہ تفسیری ہے۔ (واؤ تفسیری کی وضاحت حروف کی بحث میں آگے آ رہی ہے)۔ فلہٰذا جملہ زیر بحث میں ایک ہی اطاعت کا حکم ہے الگ الگ دو اطاعتوں کا حکم نہیں۔ بالفاظ دیگر خدا تعالیٰ نے خود ہی رسول مقبول کو اپنے حکم میں شریک ٹھہرا کر خود ہی معاذ اللہ شرک فی الحکم کی تعلیم نہیں دی۔

مختصر الفاظ میں یوں سمجھئے گا کہ رسول یعنی پیغام بر کی اطاعت پیغام کی اطاعت ہوتی ہے۔ اس کی ذاتی اطاعت ہرگز نہیں ہوتی۔ کیونکہ اصل مطاع خود اللہ تعالیٰ ہے شخصی رسول نہیں۔ شخصی رسول کی اطاعت کو قرآنِ کریم نے باذن اللہ کی قید میں مقید کر دیا ہوا ہے۔ دیکھئے ارشاد باری:۔

○ وما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن اللہ ۶۴/۴۔ اور نہیں بھیجا ہم نے کوئی رسول' مگر اس لئے کہ اس کی اطاعت' اللہ کے حکم نامہ اس کی کتاب کے ذریعہ کی جائے۔ دیکھئے! اگر رسول' کی شخصیت ہی مطاع ہوتی تو اذن اللہ کی قید نہ لگائی جاتی۔ اب سوال پیدا ہوتا کہ اللہ کا اذن کیا ہے۔ جس نے رسول مقبول کو مطاع بنا دیا تھا؟ اذن کا ایک معنی ہے قانون جس کی وضاحت عنوان ۲/۲۵ میں گزر چکی ہے۔ یہاں اللہ کا اذن وہ خداوندی حکم نامہ قرآنِ کریم ہے۔ جس کی آمد سے پہلے حضور مطاع نہیں تھے۔ اور جس کے نزول پر اس کے ذریعہ مطاع ہو گئے' نیز آپ کی پیغام رسانی اس حد تک صداقت و امانت پر مبنی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اعلانِ عام رکھا ہے میرا رسول میرے پیغام میں ہرگز ہرگز کمی بیشی نہیں کرتا۔ میرے پیغام کے نام سے جو کچھ پیش کرتا ہے۔ وہ وہی کچھ ہوتا ہے جو اس کی طرف وحی کیا جاتا ہے:۔ ماینطق عن الھوی○ ان ھو الا وحی یوحی○ ۳-۴/۵۳۔ وہ (ہمارا رسول' ہمارے پیغام کے سلسلے میں) اپنی خواہش سے نہیں بولتا۔ (بلکہ جسے وحی کے نام سے پیش کرتا ہے) وہ وہی ہی ہوتی ہے' جو اس کی طرف وحی کی جاتی ہے۔ سورۂ نساء میں اس عنوان کی یوں وضاحت دی گئی ہے' کہ جس نے رسول کی' (یعنی ہمارے

رسول کے ذریعہ ہمارے بھیجے ہوئے ضابطے کی اطاعت کی) بیشک اس نے اللہ ہی کی اطاعت کی۔

○ من یطع الرسول فقد اطاع الله ۴/۸۰

پھر سن لیجئے گا! کہ رسالت یعنی پیغام کی اطاعت ہی بیک وقت اللہ کی اطاعت بھی ہوتی ہے اور پیغام لانے والے کی بھی۔ اس آیت مجیدہ میں بھی اطاعتِ واحدہ ہی کی خبر دی گئی ہے۔ اللہ اور رسول کی الگ الگ دو اطاعتوں کی دلیل نہیں لائی گئی۔ پس اسلام اطاعتِ واحدہ کا علمبردار ہے۔ اور اطاعتِ واحدہ صرف اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے۔ جو اس کے حکم نامہ کے ذریعہ ہوگی جسے رسول امین لائے اور بلاکم وکاست پہنچا دیا' اور خود بھی اسی کے مطیع وفرمانبردار رہے۔ مزید برآں قرآنِ کریم نے اللہ ورسول کے لئے ضمیر واحد لاکر بھی واضح کر دیا کہ جملہ'' یاایھا الذین آمنوا اطیعوا الله ورسوله ولا تولوا عنه ۸/۲۰۔ ایمان والو! اللہ کی یعنی اس کے رسول کے لائے ہوئے حکم نامہ کی اطاعت کرو' اور اس (اکلوتے حکم نامے کی) اکلوتی اطاعت سے روگردانی نہ کرنا۔ دیکھئے گا! اگر اطیعوا الله واطیعوا الرسول میں قرآن اور روایات کی الگ الگ دو اطاعتوں کا حکم دیا گیا ہوتا تو ضمیر تثنیہ کی صورت میں '' ولا تولوا عنهما '' آنا چاہیے تھا '' ولا تولوا عنه'' کی ضمیر واحد ڈنکے کی چوٹ اعلان کر رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اکیلی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے خود ہی لا یشرک فی حکمه احد ۱۸/۲۶ کی خبر دینے کے بعد خود ہی رسول مقبول کو اپنے حکم میں شریک ٹھہرا کر نہ شرک فی الحکم لازم کر دیا ہے۔ اور نہ تضاد بیانی فرمائی ہے۔

۵/۲۶۔ مرکزی اتھارٹی۔

قرآن کریم کی بعض آیات کریمات سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے اطیعوا الله واطیعوا الرسول'' جملہ اصطلاح کے طور پر اس قرآنی نظام اور مرکزی اتھارٹی کے لئے بھی لایا گیا ہے۔ جسے رسول مقبول نے قرآنی آئین کی بنیادوں پر قائم کیا تھا۔ مثلاً ارشاد ہوتا ہے۔

○ یا یھا الذین امنو اطیعوا الله واطیعوا الرسول واولی الامر منکم فان تنازعتم فی شیء فردوه الی الله والرسول ان کنتم تومنون

باللہ والیوم الاخر ذالک خیر واحسن تاویلا ۵ ۵۹/۴

(مفہوم) ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو نیز رسول اور اپنے میں سے اصحاب امر کی اطاعت کرو۔ پھر اگر اصحاب امر کے ساتھ تمہارا کوئی تنازعہ ہو جائے تو تم اگر اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہو تو اس تنازعے کو اللہ اور رسول کی طرف پھیر لاؤ۔ یہی امر بہتر اور انجام کی رو سے بہت ہی اچھا ہے۔

دیکھئے! اس آیت مجیدہ میں اپنے میں سے مقرر کردہ اصحاب امر کی اطاعت کا حکم بھی دیا ہے۔ اور ان کے ساتھ اختلاف وتنازعہ کی اجازت بھی عطا فرمائی۔ اور تنازعہ کی صورت میں متنازعہ امر کو اللہ اور رسول کی طرف پھیر لانے کا حکم دیا ہے۔

اب یہاں پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ کون اصحاب امر ہیں جن کے حکم یا فیصلے کو چیلنج کرنے کی گنجائش رکھی گئی ہے۔ کہ ہم کھلے بندوں کہہ سکتے ہیں کہ ہمیں تمہارا فیصلہ منظور نہیں۔ اور ان کے حکم سے سرتابی کرنے میں ایمان پر آنچ تک نہیں آتی۔ اور دوسرا سوال یہ ہے کہ آنحضور کی وفات کے بعد جب آپ موجود نہیں ہیں۔ تو متنازعہ امر کو کس طرف پھیر لیجانے کا حکم دیا گیا ہے۔ جو فیصلہ دیگا اور اختلاف وتنازعہ یکسر ختم ہو جائے گا۔ یعنی جسے اللہ تعالیٰ نے ذالک خیر واحسن تاویلا کے الفاظ میں بہتر اور انجام کی رو سے احسن قرار دیا ہے۔ اس ضمن میں:۔

روایاتی تفاسیر کا کہنا ہے کہ متنازعہ امر کو قرآن اور حدیث کی طرف لے جاؤ۔ لیکن مسلمانوں کی شکلی فرقہ بندی گواہ ہے کہ اہل روایات کے اس تصور کے مطابق قرآن وحدیث نے امت کے چھوٹے بڑے کسی بھی متنازع امر کا فیصلہ نہیں دیا۔ اور امت فرقوں میں بٹتی چلی گئی ہے۔ ہر فرقے کا دعویٰ یہ ہے کہ قرآن اور حدیث اسی کے حق میں فیصلہ دیتے ہیں۔ فلہذا ثابت ہوا کہ جس تصور نے امت کو متحد کرنے کی بجائے منتشر ومختلف کر دیا ہے نہ یہ خیر ہو سکتا ہے اور نہ احسن تاویلا ہی قرار دیا جاسکتا ہے۔ فلہذا روایات کا دیا ہوا یہ تصور مطلقاً غلط ہے۔

۲۶/۶ اولی الامر منکم کون ہیں؟

اب آیئے حقیقت حال کی طرف آیت مجیدہ نے اولی الامر منکم کی اطاعت کا حکم دینے کے

بعد جوان سے اختلاف وتنازعہ کی اجازت بھی دیدی ہے۔اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ ماتحت عدالتوں کے قاضی یا مجسٹریٹ ہیں جو قرآنی نظام کی مرکزی اتھارٹی کی طرف سے مقدمات کی سماعت کے لئے متعین کئے جاتے ہیں۔اور یہ اطاعت دینی امور کی نہیں کیونکہ دین کے کسی حکم کو چیلنج کیا ہی نہیں جاسکتا۔ بلکہ یہ عوام کے معاشرتی جھگڑوں کا ذکر ہے عوام اپنے تنازعات مرکز کے مقرر کردہ قاضی اور مجسٹریٹوں کے پاس لے جائیں گے۔اب ان سے اگر کوئی فیصلہ غلط صادر ہو جائے تو جس فرد یا جماعت کی دادرسی نہیں ہوئی وہ **اولی الامر منکم** کے فیصلے کو اپیل کے ذریعہ چیلنج کرنے کا مجاز ہے۔اس سلسلے میں آیت مجیدہ ۴/۵۹ میں حکم دیا گیا ہے کہ متنازع امر کو اپیل کے ذریعے(**فردوه الى الله والرسول**) اللہ اور رسول یعنی مرکزی اتھارٹی کی طرف لوٹا کرلے جاؤ تاکہ دوبارہ غور وخوض کے بعد آخری فیصلہ دیدیا جائے جس کی اپیل نہیں۔ جب تک آنحضور خود زندہ رہے آپ آخری اتھارٹی تھے۔اور آپ کے بعد آپ کے جانشین آخری اتھارٹی رہے جن کے فیصلے آخری ہوتے تھے مقدمات کے فیصلوں کے لئے اسی انداز کو قیامت تک کے خیر بھی کہا گیا ہے اور احسن تاویلا بھی لیکن یادر ہے کہ **اطیعوا الله واطیعوا الرسول** کی پاکیزہ اصطلاح کے ماتحت وہ نظام آسکتا ہے جس میں اقتدار اعلیٰ اللہ تعالیٰ کا تسلیم کیا جاتا ہو۔ فیصلے قرآنی آئین کے مطابق ہوں۔اور جہاں رشوت اور سفارش راہ نہ پاسکتی ہو۔یعنی جو نظام اللہ کے بھیجے ہوئے اور رسول مقبول کے لائے ہوئے ضابطہ حیات قرآن کریم کی بنیادوں پر قائم ہوگا۔وہ اس پاکیزہ اصطلاح کا مصداق ہوسکتا ہے نہ نظام ملوکیت اس میں داخل ہوسکتا ہے اور نہ سرمایہ دارانہ نظام، جن میں اللہ اور رسول کے اولین سبق' درس ربوبیت ہی کی مخالفت موجود ہو۔ حکام عیش اڑار ہے ہوں اور عوام ضروریات زندگی سے محروم پائے جاتے ہو۔

پس یہ اصطلاح ہموار ومتوازن قرآنی نظام کی مرکزی اتھارٹی کے سوا کسی اور نظام کے لئے ہرگز استعمال نہیں کی جاسکتی۔ **اولی الامر منکم** سے مراد قرآنی مرکز کی طرف سے متعین کردہ قاضی، مجسٹریٹ، حلقہ کے چئیر مین ہیں جو الگ الگ ایک ایک حلقہ یونٹ یا وارڈ میں عوام کے فیصلوں کے لئے متعین کئے جائیں گے۔اللہ ورسول کے الفاظ انہیں متعین کرنے والی مرکزی

اتھارٹی کے لئے اصطلاحاً استعمال کئے گئے ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم متعدد مقامات پر اس نظام کے لئے اصطلاح کے طور پر اللہ تعالیٰ اور رسول کے الفاظ لا کر ان کے لئے ضمیریں بھی واحد لائی گئی ہیں:۔

o یحلفون باللہ لکم لیرضوکم واللہ و رسولہ احق ان یرضوہ ان کانوا مومنینo ۹/۶۲

دیکھئے! یہاں اللہ اور رسول کے لئے ضمیر تثنیہ نہیں بلکہ یرضوہ میں ضمیر واحد لائی گئی ہے۔ اور آیت مجیدہ کا مفہوم یہ ہے۔

ایمان والو! منافق لوگ تمہیں راضی کرنے کے لئے اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں۔ حالانکہ اللہ اور رسول زیادہ حقدار ہے کہ اگر وہ مومن ہیں تو اس ایک کو راضی رکھیں۔ یعنی قرآنی نظام کے وفادار رہیں اب بات صاف ہے کہ اللہ اور رسول کے لئے ضمیر واحد آئی ہے لیکن اللہ اور رسول ایک نہیں اللہ اللہ ہے رسول رسول ہے پیغام دینے والا اور پیغام پانے والا ایک نہیں ہو سکتے۔ خالق اور مخلوق ایک نہیں ہو سکتے پس اللہ اور رسول کے لئے واحد ضمیریں لا کر انہیں ایک ٹھہرانے سے صاف ظاہر ہے کہ جملہ اللہ اور رسول اصطلاح کے طور کسی ایسی چیز کے لئے لایا گیا ہے جو ایک ہے دو نہیں اس کی وضاحت واحد ضمیر لا کر آیت ذیل میں بھی کر دی گئی ہے کہ یہ اصطلاح اس ہموار و متوازن نظام کے لئے استعمال کی گئی ہے جو عوام کی ضروریات زندگی کا ضامن ہو کر انہیں غم معاش سے بے نیاز کر دیتا ہے:۔

o اغنھم اللہ ورسولہ من فضلہ ۹/۷۴۔ انہیں اللہ اور رسول نے اپنے ں (بیت المال) سے غنی کر دیا۔ یعنی واحد مرکزی نظام نے جو اللہ کے رسول نے اللہ کے حکم کے مطابق قائم کیا ہے ان کی ضروریات زندگی کا ضامن بن کر انہیں معاشی غم و فکر سے آزاد کر دیا ہے۔

فلہٰذا ترجمہ اور تفسیر میں " اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول " کا معنی ہر مقام پر سیاق وسباق کے مطابق کہیں تو اللہ تعالیٰ کے مقدس رسول سلام علیہ کے لائے ہوئے ضابطہ خداوندی قرآن کریم کی اطاعت مراد لیا گیا ہے اور کہیں اس ہموار و متوازن مرکزی نظام کی اطاعت جو

آنحضور نے قرآنی خطوط کے مطابق متشکل فرمایا تھا اور جو بلا تمیز اعلیٰ وادنیٰ پورے عوام کی ضروری زندگی کا ضامن تھا بالفاظ دیگر قرآن کریم نے ربوبیت عامہ کی بنیادوں پر قائم کردہ اس ہموار ومتوازن نظام کے لیے "اللہ ورسول" کے جملہ کو بطور اصطلاح استعمال کیا ہے جس میں نہ کوئی بھوکا ہو نہ ننگا نہ بے مکان ہو نہ بے علاج ۱۱۸تا۱۱۹/۲۰ نیز زیر نظر ترجمہ میں " اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول " کے جملہ سے اللہ اور رسول کی دو الگ الگ اطاعتوں کا تصور ہرگز نہیں دیا گیا۔ جس سے قرآن کریم میں تضاد ثابت ہوتا ہو کہ اللہ تعالیٰ نے ۵۷/ ۶ اور ۴۰/۱۳ میں خود ارشاد فرمایا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی واجب الاطاعت ہے ہی نہیں۔ اور خود ہی رسول مقبول کو اپنی اطاعت میں شریک کرنے کا مشرکانہ حکم بھی دے رکھا ہے۔ العیاذ باللہ تعالیٰ۔

۲۷۔ناسخ ومنسوخ

سابقہ تفاسیر وتراجم میں قرآن کریم کے متعلق یہ تصور دیا گیا ہے کہ اس کی کچھ آیتیں منسوخ بھی ہو چکی ہیں۔حتیٰ کہ بعض کے نزدیک پانچ سو آیات کریمات منسوخ ہیں۔اور بعض کے نزدیک الگ الگ تین سو، دو سو، پچاس اور شاہ ولی اللہ رحمت اللہ علیہ کے نزدیک صرف پانچ منسوخ ہیں

لیکن یاد رہے کہ کتاب خداوندی کی کسی ایک آیت کو بھی منسوخ تسلیم کرنے سے : باری محفوظ نہیں رہتی۔یعنی یہ تصور سامنے آتا ہے کہ معاذ اللہ معاذ اللہ بعض حکم نازل کرتے ، اللہ تعالیٰ کو معلوم نہیں ہوتا تھا کہ یہ وقت کے بدلتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکے گا۔اور کل کو واپس لینا پڑے گا۔یہ تصور اس ذاتِ مقدس کے متعلق کس طرح قابلِ قبول ہو سکتا ہے، جو علیم بذات الصدور ہونے کے ساتھ ساتھ ہر قسم کے عیوب ونقائص سے پاک ہے۔

۲۷/۱ اللہ تعالیٰ کے جملہ احکام وقت کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔

خدائے علیم وخبیر کے کلام کی جامعیت وہمہ گیری کا یہ عالم ہے کہ جن احکام میں وقتی تقاضوں کی تبدیلی کا سوال پیدا ہونے والا ہوتا ہے۔ان کی وضاحت آیت متعلقہ میں ساتھ کے ساتھ کر دی گئی ہے۔مثلاً ○ وضو کا حکم سورۂ مائدہ کی آیت ۶ میں درج ہے۔لیکن اسی آیت میں وضاحت کر دی گئی ہے کہ اگر ایسا وقت آ جائے کہ تم سفر میں ہو اور پانی نہیں ملتا' یا اگر تم بیمار ہو' اور پانی موجود تو ہے لیکن پانی کے ساتھ وضو کرنا وقتی حالات کے مطابق مضرِ صحت ہے تو تیمم کر لیا کرو۔اسی طرح:۔

○ نماز کے متعلق سورۂ نساء کی آیت ۱۰۳ میں حکم دیا گیا ہے کہ اسے مقررہ اوقات میں ادا کرنا فرض ہے:۔

○ ان الصلوۃ کانت علی المومنین کتبا موقوتا○ ۱۰۳ : ۴

لیکن یاد رہے کہ نماز کا حکم بعد میں دیا گیا ہے اور اس کے متعلق بدلتے ہوئے حالات کے وقتی تقاضوں کی وضاحت پہلے کر دی ہے' اور خدائے علیم وخبیر کی شان بھی یہی ہو سکتی ہے کہ اس کے

احکام میں وقتی تقاضوں میں سے کسی ایک کی وضاحت وصراحت کو بھی نظر انداز نہ کیا گیا ہو۔ چنانچہ سورۂ نسا کی آیات مجیدہ ۱۰۱۔۱۰۲ میں تشریح کر دی گئی ہے کہ اگر تم میدان جنگ میں ہو ابھی لڑائی شروع نہیں ہوئی نماز با جماعت ادا کرنا اگرچہ ممکن ہے لیکن اگر پورا لشکر ایک ہی مرتبہ نماز میں کھڑا ہو جائے تو خطرہ ہے کہ دشمن یک بارگی حملہ نہ کر دے۔ لہذا اس وقتی تقاضے کے مطابق حکم ہوتا ہے کہ نماز کو کم کر لیا کرو:۔

o واذا ضربتم فی الارض فلیس علیکم جناح ان تقصروا من الصلوة ان خفتم ان یفتنکم الذین کفروا ط ان الکفرین کانوا لکم عدوا مبینا o ۴/۱۰۱ اس سے اگلی آیت مجیدہ میں حکم دیا گیا ہے کہ آدھی آدھی فوج باری باری کے ساتھ قصر نماز ادا کر لیا کرے۔ کہ ایک گروہ سالارِ لشکر کے ساتھ با جماعت نماز ادا کر رہا ہو۔ اور دوسرا پہرہ دے رہا ہو:۔

o واذا کنت فیھم فاقمت لھم الصلوة فلتقم طائفة منھم معک ولیاخذوا اسلحتھم فاذ اسجدوا فلیکونوا من ورائکم ولتات طائفة اخری لم یصلوا فلیصلوا معک ۴/۱۰۲۔ اور اے رسول! جب آپ خود ان میں موجود ہوں تو امامِ صلوة کے فرائض آپ خود انجام فرمائیں۔ پس چاہیے کہ مجاہدوں کا ایک گروہ آپ کے ساتھ قیام صلوة میں کھڑا ہو جائے (اور دوسرا گروہ پہرہ دیتا رہے) پھر جب وہ (پہلا گروہ) سجدہ (کر کے ایک رکعت پوری) کر چکے تو چاہیے کہ وہ تمہارے پیچھے (پہرہ پر) چلا جائے۔ اور دوسرا گروہ آ جائے، جس نے صلوة ادا نہیں کی۔ اے رسول! وہ بھی آپ کے ساتھ صلوة ادا کر لے۔

یہ تو ہوا اس وقتی تقاضے کے متعلق حکم کہ جب ابھی لڑائی شروع نہ ہوئی ہو۔ اور جب لڑائی شروع ہو جائے تو اس وقت کے متعلق حکم ہوتا ہے۔ کہ اگر اس دوران صلوة کا وقت آ جائے تو ہر مجاہد جس حالت میں بھی، کھڑے، بیٹھے یا لیٹے الگ الگ اللہ تعالیٰ کا ذکر کر لیا کرے:۔

o فاذا قضیتم الصلوة فاذکروا اللہ قیما وقعودا وعلی جنوبکم ۴/۱۰۳۔ پھر جب تم مذکورہ تقاضوں والی صلوة پوری کر چکو (اور لڑائی شروع ہو جائے تو اس کے دوران اگر صلوة کا وقت آ جائے) تو پھر صرف اللہ کا ذکر کر لیا کرو، بیٹھے اور لیٹے (جس پوزیشن میں بھی ہو) اور اس کے بعد جب جنگ اور خطرہ فتنہ کفار ختم ہو جائے تو اپنے وقت کے لئے حکم ہوتا ہے:۔ o

فاذا اطمانتم فاقیموا الصلوۃ ۴/۱۰۳۔ پھر جب تمہیں اطمینان ہو جائے (کہ دشمن کا خطرہ نہیں رہا) تو پورے آداب و شرائط کے ساتھ پوری نماز ادا کیا کرو۔ اور اس طرح بدلتے ہوئے حالات سے متعلقہ ہدایات دے چکنے کے بعد ارشاد ہوا ہے:۔ ٥ ان الصلوۃ کانت علی المومنین کتبا موقوتا ٥ ۴/۱۰۳۔ یا تنے تکلف کا حکم اس لئے دیا گیا ہے کہ فرضیت نماز مقررہ اوقات کی حدود میں محدود ہے۔ وقتوں کی پابندی ہر آن فرض ہے۔

٥ اسی طرح سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۲۳۹ میں نمازی کے وقتی تقاضوں میں سے ایک ایسے وقت کے لئے حکم دیا گیا ہے کہ اگر تم سفر میں ہو۔ نماز کا وقت ہے لیکن اگر تم پوری قرآنی حدود و قیود کے ساتھ نماز ادا کرو تو کسی وقتی خطرے کا خوف ہوتا ہے تو ایسا کیا کرو کہ اگر سواری پر ہو تو سواری پر ہی نماز ادا کر لیا کرو۔ اور پیدل سفر کر رہے ہو تو پیدل چلتے چلتے نماز ادا کر لیا کرو:۔ فان خفتم فرجالا او رکبانا ۲/۲۳۹۔

دیکھا آپ نے کہ خدائے علیم و خبیر بدلتے ہوئے حالات کے وقتی تقاضوں سے کس طرح باخبر ہے۔ اور اس نے کس وضاحت صراحت کے ساتھ نماز کے متعلقہ احکام میں وقتی تقاضوں کی ایک ایک شق کو کھول کر بیان کر دیا ہے۔ کہ پانی نہ ہو یا مضر صحت ہو تو تیمم کر لیا کرو۔ جنگ میں ہو تو ایک ایک گروہ باری باری سے دوسرے گروہ کے پہرے میں نماز ادا کر لیا کرے۔ جنگ شروع ہو تو مجاہد جس پوزیشن میں ہو اسی پوزیشن میں صلوۃ ادا کر لے۔ سفر میں ہو اور کوئی خطرہ لاحق ہو جائے تو پیادہ پا یا سواری پر چلتے چلتے نماز ادا کر لیا کرو۔

اب بتائیے گا کہ ایسی ذات علیم و علام کے متعلق کیا ایسا تصور بھی کیا جا سکتا ہے کہ اس نے کبھی بھی کوئی ایسا حکم نازل فرمایا ہو جو وقت کے بدلتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ نہ دے سکتا ہو۔ اور اسے واپس لینا پڑ گیا ہو۔ یعنی پہلے حکم کو دوسرے حکم کے ساتھ منسوخ کرنا پڑ گیا ہو؟

۲/۲۷۔ تنسیخ آیات کے متعلق قرآنی فیصلہ۔

تنسیخ آیات کے متعلق سورہ بقرہ کی آیت ذیل سے لیا جاتا ہے:

٥ ماننسخ من ایۃ اوننسھا نات بخیر منھا او مثلھا الم تعلم ان اللہ علی

كل شيء قدير ٥ ٢/١٠٦ (مروجہ ترجمہ)۔ جو ہم کسی آیت کو منسوخ کرتے یا اسے بھلا دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا اس جیسی آیت لاتے ہیں کیا تو نہیں جانتا کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

اس ترجمے پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ اپنی ہی آیتوں میں سے بعض کو منسوخ کر دیتا ہے تو ان سے بہتر لانا بھلا ایک بات ہوئی جو اگرچہ اللہ تعالیٰ کے شایانِ شان نہیں کہ ایسی آیت نازل ہی کیوں فرمائی جو واپس لینی پڑی، پہلے ہی بہتر آیت کیوں نہ نازل کی لیکن دوبارہ بھی پھر اس جیسی مثلھا نازل کرنے کا کیا فائدہ اور اگر دوبارہ اس جیسی ہی نازل کرنی تھی تو پہلی کے منسوخ کرنے کا کیا مطلب؟

برادران عزیز! خداوند تعالیٰ ایسے عبث افعال کے تصور تک سے پاک و منزہ ہے کہ پہلے تو کوئی ایسی آیت نازل کر دے جو وقت کے تقاضوں کا ساتھ نہ دے سکے اور اسے واپس لینا پڑ جائے اور پھر دوبارہ نازل کرتے وقت یا تو اس سے بہتر آیت نازل کرے اور یا پھر اس جیسی نازل کر دے جو پہلی کی مانند وقتی تقاضوں کے ساتھ نہ چل سکے۔

اب آیئے حقیقتِ حال کی طرف واضح رہے کہ ماننسخ من ایته کی تنوین عوض مضاف الیہ ہے لیکن اس کا مضاف الیہ اللہ تعالیٰ نہیں ہے۔ کہ اس کے متعلق اپنی ہی نازل کردہ آیتوں کو منسوخ کرنے کا تصور پیدا ہونے لگے۔ اور نہ وہ دوبارہ انہی جیسی قابل منسوخ آیتیں (مثلھا) لانے کے فعل عبث کا مرتکب ہوتا رہے لیکن ہماری اس تنقیح پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ اپنی آیتوں کو منسوخ نہیں کرتا۔ تو پھر کس چیز کو منسوخ کرتا ہے کیونکہ "ماننسخ من ایته" کے الفاظ سے مطلقاً عدم تنسیخ کا تصور تو لیا ہی نہیں جا سکتا اس سوال کا جواب سورہ حج کی آیت ذیل میں ملاحظہ فرمائیں۔ دیکھئے گا ارشاد ہوتا ہے:

٥ وما ارسلنا من قبلک من رسول ولا نبی الا اذا تمنی القی الشیطن فی امنیته فینسخ الله ما یلقی الشیطن ثم یحکم الله ایته و الله علیم حکیم٥ ٢٢/٥٢

(مفہوم) صاحب قرآن! آپ سے پہلے ہم نے کوئی نبی رسول نہیں بھیجا کہ اس کے ساتھ ایسا نہ ہوا ہو جب وہ کتاب اللہ کی تلاوت کرتا (یعنی لوگوں کو ہمارا پیغام پہنچاتا) تو شیطان اس کے

پہنچائے ہوئے پیغاموں میں اپنی طرف سے پیش کر دیتا۔ پھر اللہ تعالیٰ اس چیز کو منسوخ کر دیتا جو شیطان پیش کرتا۔ اس کے بعد اپنی آیتوں کو محکم کر دیتا حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ صاحب علم وحکمت ہے۔ (یعنی وہ بے علم وحکمت نہیں کہ ایسی آیتیں نازل کرے جو وقت کے بدلتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ نہ دے سکیں اور پھر انہیں منسوخ کرنا پڑے)۔

دیکھئے گا! اس آیت مجیدہ میں ایک مستقل اصول بیان کر دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی آیتوں کو محکم کرتا ہے منسوخ نہیں کرتا۔ منسوخ اس چیز کو کرتا ہے' جو شیطان پیش کرتا ہے فلہذا ثابت ہوا کہ آیت مجیدہ ۲/۱۰۶ میں ایۃ تنوین سے ''آیت الشیطن'' مراد ہے آیت اللہ مراد نہیں پس ۲/۱۰۶ میں جس چیز کی تنسیخ کی خبر دی گئی ہے اسی چیز کو ۲۲/۵۲ میں مایلقی الشیطن فرمایا ہے اور اپنی آیتوں کے متعلق یحکم اللہ ایتہ کی خبر دی گئی ہے جس سے آیات اللہ کی تنسیخ کا تصور تک پیدا نہیں ہو سکتا۔ بلکہ یہ الفاظ استحکام آیات اللہ کی مبین دلیل ہیں۔

اب ملاحظہ فرمائیں ۲۲/۵۲ کا مستقل اصول کی روشنی میں آیت مجید ۲/۱۰۶ کا صحیح قرآنی مفہوم:

○ یایھا الذین امنو لا تقولوا راعنا وقولوا انظرنا واسمعوا وللکفرین عذاب الیم ○ ۲/۱۰۴ (مفہوم) ایمان والو! تم (ہمارے رسول کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے) راعنا نہ کہنا۔ (یہ یہودیوں کی نشانی ہے ۴/۴۶) تم انظرنا کہا کرو۔ اور جب ہمارا نبی تمہاری طرف متوجہ ہو کر کلام فرمائے تو سنا کرو۔ ہمارے حکم کا انکار کرنے والوں کے لئے دردناک عذاب ہے اب ملاحظہ فرمائیے گا کہ سورہ نساء ۴/۴۶ میں راعنا کہنے کو یہودی شیطانوں کی نشانی (آیت) بتایا گیا ہے:

○ من الذین ھادوا یحرفون الکلم عن مواضعہ ویقولون سمعنا وعصینا واسمع غیر مسمع وراعنا لیا بالسنتھم ۴/۴۶۔ اور یہودیوں میں سے ایسے ہیں۔ جو اللہ کے کلام کو اس کے اصل مقام سے بدل دیتے ہیں۔ اور (ہمارے رسول کو) کہتے ہیں کہ ہم نے آپ کی بات سنی اور انکار کر دیا۔ پس آپ ہماری سنیے دوسروں کی نہ سنیے۔ اور زبان کو پیچ دے کر کہتے ہیں راعنا (یعنی راعینا کہتے۔ اے ہمارے چرواہے)

اب غور فرمایئے گا کہ باری تعالیٰ یہودی شیطانوں کی اس نشانی راعنا کو منسوخ کر کے اور اسے بھول جانے کا حکم دے کر محکمیت میں اس سے بہتر نشانی لائے ہیں انظرنا کہ زبان کے پیچ بگاڑ کر اس کا کوئی توہین آمیز مفہوم لیا ہی نہیں جا سکتا۔ اور مفہوم کے لحاظ سے بالکل اسکی مثل و مانند ہے۔ یعنی راعنا اور انظرنا مترادف المفہوم الفاظ ہیں۔ راعنا کا معنی ہے ہماری رعایت فرمائیں۔ اور انظرنا کا معنی ہے۔ ہماری طرف توجہ فرمائیں۔ فلہذا انظرنا محکمیت کے لحاظ سے راعنا سے بہتر ہے۔ اور مفہوم کے لحاظ سے مثل و مانند۔ اور مذکورہ آیت مجیدہ ۲/۱۰۴ میں اس شیطانی نشانی کو منسوخ کرنے کے بعد ۲/۱۰۶ میں باری تعالیٰ نے اپنا یہ مستقل قانون پیش کر دیا ہے:

o ماننسخ من ایته[1] او[2] ننسها[3] نات بخیر[4] منها[5]

او مثلها[6] الم تعلم ان الله علی کل شئی قدیرo ۲/۱۰۶

(مفہوم) نہیں منسوخ کرتے ہم کسی (شیطانی) نشانی کو یعنی ترک کرا دیتے ہیں۔ تو محکمیت میں اس سے بہتر نشانی لاتے ہیں اور (مفہوم میں) اس جیسی۔ اے مخاطب! کیا تو نہیں جانتا کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کے اندازے اور پیمانے مقرر کرنے والا ہے۔ (اس کی کوئی آیت صحیح اندازوں اور پیمانوں کے خلاف ہوتی ہی نہیں کہ اسے نازل کرنے کے بعد پھر منسوخ کرنا پڑ جائے) فلہذا اس ترجمہ اور تفسیر میں ناسخ و منسوخ کے مروجہ روایاتی تصور کا گزر تک نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ایک ایک آیت اپنے مقام پر محکم اور چٹان کی طرح اٹل ہے۔

---

[1] یہاں آیت بمعنی نشانی ہے

[2] او عاطفہ بمعنی واؤ تفسیری بمعنی یعنی ہے۔ او عاطفہ کی تشریح حروف کی بحث میں آگے آ رہی ہے۔

[3] بھلا دینا بمعنی ترک کروا دینا۔

[4] خیر منها بمعنی محکمیت میں اس سے بہتر کہ زبان کے پیچ کے ساتھ راعنا کی طرح بگاڑا نہیں جا سکتا۔

[5] او عاطفہ واؤ کا فائدہ دیتی ہے بمعنی اور

[6] مثلها سے مراد ہے مفہوم میں اس جیسی۔

۲۸۔شانِ نزول

۱/۲۸ قرآنِ کریم عالم گیر ضابطۂ حیات ہے۔

قرآن فہمی کی راہ میں بے شمار رکاوٹیں سدِ سکندری بن کر کھڑی ہوئی ہیں۔ جیسے کہ آپ سابقہ عنوان میں دیکھ چکے ہیں کہ خود قرآن کی رو سے تو قرآن کا کوئی شوشہ تک منسوخ نہیں۔ اور ادھر اس کی پانچ سو آیات کریمات کو منسوخ قرار دے رکھا ہے۔ اسی طرح سابقہ تفاسیر میں ایک نظریہ چل رہا ہے شان نزول کا کہ یہ آیت فلاں یہودی کے حق میں اتری تھی اور یہ فلاں منافق کے بارے میں۔ یہ آیت فلاں صحابی کی شان میں نازل ہوئی تھی اور یہ اہل بیت کے فلاں فرد محترم کے لئے اور اس طرح قرآنی احکام کی عمومیت کو جو قیامت تک پوری نوع انسانی کے لئے ہے' صرف چند افراد تک محدود کر کے رکھ دیا گیا ہے۔ اس طرح شان نزول کا عقیدہ فہمِ قرآن کی راہ میں سد سکندری بنا ہوا ہے جو کسی بھی آیت کا مفہوم سمجھنے کے لئے قرآن کریم کی طرف آنے ہی نہیں دیتا۔ اور حالت یہ ہوتی ہے کہ آیت تو لے لی قرآن سے اور شانِ نزول تفسیروں سے ڈھونڈنا شروع کر دیا۔ اور پھر مزیداری یہ کہ قرآن کریم کے ایک ہی نسخہ کے ایک ہی صفحہ پر ایک ایک آیت کے کئی کئی شان نزول باندازِ تشکیک درج ذیل ہیں۔ یعنی یقینی بات کوئی نہ ملے گی کہ یہ آیت کس کے حق میں نازل ہوئی تھی مثلاً:

۲/۲۸ شان نزول کے باہمی اختلافات۔

آیت مجیدہ والذی جاء بالصدق و صدق بہ ۳۳/۳۹ کے متعلق تفسیر عزیزی حاشیہ نسخہ قرآنِ کریم مطبوعہ ملک دین محمد اینڈ سنز کے صفحہ ۲۷ پر لکھا ہے کہ:

''معالم التنزیل میں ہے'' جاء بالصدق'' ابن عباسؓ کی روایت میں ہمارے حضور سلام علیہ ہیں سدی کی روایت میں جبریل۔ اسی طرح مزید لکھا ہے کہ'' وصدق بہ'' سدی کے نزدیک

ہمارے حضور سلام علیہ ہیں اور کلبی کی روایت میں حضرت ابوبکر صدیقؓ "۔

اب غور فرمایئے گا کہ شان نزول کے پردے میں ایک ہی جنبش قلم کے ساتھ کتنی غیر یقینی باتیں لکھ دی گئی ہیں یعنی "جاء بالصدق" یا آنحضرت کے حق میں نازل ہوا یا جبریل کے حق میں اور "صدق بہ" یا تو آنحضور کے حق میں نازل ہوا تھا۔ اور یا حضرت صدیقؓ کے حق میں۔

۲۸/۳ حاشیہ تفسیر ثنائی:

یوں تو آپ کو کوئی بھی تفسیر جو شانِ نزول کے نظریہ پر لکھی گئی ہو ایسی نہیں ملے گی جس میں شانِ نزول کا اختلاف موجود نہ ہو۔ لیکن ہم آپ کو دور جدید کی مشہور ترین تفسیر کی سیر کراتے ہیں مولوی ثناء اللہ صاحب مرحوم کے مترجم قرآن مجید مرتبہ محمد داؤد صاحب راز مطبوعہ دہلی کے صفحہ ۲۷۰ پر سورہ تحریم کی اولین آیت:

○ یایھا النبی لم تحرم ما احل اللہ لک تبتغی مرضات ازواجک ۶۶/۱

کا پہلے نمبر پر تو مفہوم ہی غلط اور ناموسِ رسالت کے منافی لے لیا ہے کہ رسول اکرم نے معاذ اللہ معاذ اللہ اللہ تعالیٰ کی حلال فرمودہ کسی چیز کو حرام ٹھہرالیا تھا اور اس کے بعد شانِ نزول میں جو گل کھلائے ہیں حاشیہ کے اپنے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں۔ لکھا ہے:

"اس سورت کی ابتدائی آیتوں کی شان نزول میں مفسروں کے اقوال یہ ہیں (۱) بعض تو کہتے ہیں یہ حضرت ماریہؓ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ ان کو حضور نے اپنے اوپر حرام کر لیا تھا۔ نسائی میں یہ روایت موجود ہے کہ حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ کے کہتے سننے سے ایسا ہوا تھا۔ آپ نے کفارہ دے کر اپنی قسم توڑی اور اس لونڈی سے ملے جلے۔ (۲) بالکل صحیح بات[1] یہ

---

[1] یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اہل روایات کے ہاں جب نسائی شریف میں جو صحاح ستہ میں داخل ہے یہ لکھا ہے کہ یہ آیت حضرت ماریہؓ کو حرام کرنے پر اتری تھی۔ تو یہ شہد والی بالکل صحیح بات بتانے والے صاحب کون ہیں؟ کیا امام نسائی سے وہ زیادہ صحیح بات پر پہنچنے والے ہیں؟ تعجب کی بات ہے کہ ایک طرف تو نسائی شریف صحیح ہے اور دوسری طرف اس کے مندرجات کو یہ کہہ کر غلط قرار دے دیا گیا کہ جو بالکل صحیح بات ہے وہ نسائی شریف کے خلاف ہے۔

ہے کہ حضرت زینب بنت جحش کے گھر میں آپ شہد پیا کرتے تھے۔۔۔۔اس بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔"

یہاں پہنچ کر سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت ماریہؓ کا کیا واقعہ ہے کہ ایک شان نزول کے مطابق انہیں آنحضور نے اپنے اوپر حرام کرلیا تھا؟ اور شہد کا کیا واقعہ ہے جسے آپ نے حرام فرما دیا تھا؟۔۔۔۔روایات کے ان تراشیدہ واقعات کی تفصیل مولوی شاہ اللہ صاحب کے مذکورہ بالا مترجم قرآن کریم کے صفحہ ۶۷۱ کے حاشیے پر بالفاظ ذیل درج ہے:

۴/۲۸ حضرت ماریہؓ کا روایتی قصہ:

"کہتے ہیں آنحضرت نے ام المومنین حفصہؓ کے گھر میں ماریہؓ اپنے حرم سے صحبت کی۔حضرت حفصہؓ نے کہا یارسول اللہ! کیا میرے گھر میں میرے بستر پر آپ ایسا کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا اب سے ماریہؓ میرے اوپر حرام ہے۔اور تو اس کا ذکر عائشہؓ سے نہ کرنا۔لیکن حضرت حفصہؓ نے عائشہؓ سے یہ حال کہہ دیا۔ان کو بہت غصہ آیا۔یہاں تک کہ آپ نے قسم کھائی کہ اب میں ماریہؓ کے پاس کبھی نہیں جاؤں گا۔اس وقت یہ آیت اتری۔"

یہ تو ہے آیت مجیدہ **یایھا النبی لم تحرم ما احل اللہ لک تبتغی مرضات ازواجک۔** ۶۶/۱ کے شان نزول کی تفصیل کہ معاذ اللہ معاذ اللہ آنحضرت نے گھر میں ایک لونڈی رکھی ہوئی تھی۔آپ کا اس کے ساتھ میاں بیوی کا تعلق تو تھا۔لیکن اسے کوئی گھر نہیں دیا ہوا تھا۔آپ نے حضرت حفصہؓ کے گھر میں اس بے گھر بیوی کا حق زوجیت ادا کیا۔لیکن حفصہؓ ناراض ہوگئیں۔انہیں خوش کرنے کے لیے آپ نے اسے اپنے اوپر حرام کردیا۔اور حفصہؓ سے کہا۔اس واقعہ کا ذکر عائشہؓ سے نہ کرنا (کیوں؟) لیکن وہ باز نہ آئی آپ کو غصہ آ گیا۔اور حفصہؓ کا غصہ بچاری بے گناہ ماریہؓ پر نکالا۔اور قسم کھائی کہ اب ماریہؓ کے جنسی حقوق کبھی ادا نہیں کروں گا۔اس پر یہ آیت اتری کہ اے رسول! تو اپنی بیویوں کو خوش کرنے کے لیے اپنے اوپر اس چیز کو کیوں حرام کرتا ہے جسے اللہ نے تیرے لیے حلال ٹھہرایا ہے۔جس پر حضرت نے قسم توڑی اور مسکینوں کو کھانا کھلا کر کفارہ ادا کیا۔یہ پورا قصہ محض تراشیدہ ہے۔آیت مجیدہ ۶۶/۱ کے الفاظ

اس کے حامل نہیں ہیں۔

۵/۲۸ شہد کا روایتی قصہ:

اب اسی آیت مجیدہ کے دوسرے شان نزول کی تفصیل ملاحظہ فرمائیں۔ اسی صفحہ پر لکھا ہے:
''بعضوں نے کہا کہ آنحضرت نے اپنی بی حضرت زینبؓ کے گھر شہد پیا۔ حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ نے صلاح کی کہ جب آنحضرت ہمارے پاس آئیں تو ہم یہ کہیں کہ آپ کے منہ سے گوند کی بو آتی ہے۔ اور آنحضرت کو اس سے بڑی نفرت تھی کہ آپ کے بدن' لباس یا کپڑے سے کوئی بری بو آئے۔ چنانچہ جب آنحضرت ان کے پاس آئے تو دونوں نے مل کر یہی کہا۔ آپ نے فرمایا میں نے تو زینبؓ کے پاس شہد پیا تھا۔ اب سے شہد کبھی نہیں پیوں گا۔ اس وقت یہ آیت اتری۔ بعضوں نے کہا کہ بی بی ام سلمہؓ کے پاس سفید شہد پیا تھا''

ایک اہم نوٹ:

حاشیہ نگار کہتا ہے کہ آنحضور نے شہد' یا تو حضرت زینبؓ کے گھر سے پیا تھا اور یا حضرت ام سلمہؓ کے گھر سے۔ لیکن بخاری شریف مطبوعہ قرآن محل کراچی جلد سوم کے صفحہ ۱۳۶ پر لکھا ہے کہ آپ نے شہد حضرت حفصہؓ کے گھر سے پیا تھا۔

یہ ہے دوسرے شان نزول کی تفصیل' کہ شہد پلانے والی۔ کہیں حضرت زینبؓ بتائی گئی ہے' کہیں ام سلمہؓ اور کہیں حفصہؓ (الامان والحفیظ) نیز پہلے نمبر پر تو یہ بتایا گیا ہے کہ آنحضور کی دو بیویوں نے ایک جھوٹ گھڑا' پھر جھوٹ پر ایک دوسری سے تعاون کیا۔ اور اس کے بعد مل کر مجوزہ جھوٹ بولا کہ یا رسول اللہ آپ کے منہ سے بو آتی ہے۔ اس پر آنحضور نے بلا تحقیق اپنے اوپر شہد حرام کر دیا۔ یہ تو ایک معمولی سطح کا آدمی بھی جانتا ہے کہ ہاتھ کی ہتھیلی پر سانس خارج کر کے سونگھنے سے پتہ چل جاتا ہے کہ منہ سے کس قسم کی بو آ رہی ہے۔

اب بتایئے! کہ اس بالکل صحیح شان نزول نے ناموس ازواج مطہراتؓ کو داغدار تو کیا ہی تھا۔ خود رسول اکرم سلام علیہ کو کس سطح کا انسان ثابت کر دکھایا ہے۔ کہ بلا تحقیق ایک ایسا کام کر دیا جس سے آپ پر اللہ تعالیٰ کے حلال کو حرام کرنے کی سنگین دفعہ عائد ہوگئی۔ اور ذات باری کو تنبیہ

کے طور پر آیت نازل کرنی پڑی کہ:

اے نبی ! یعنی ہماری طرف سے خبر پا کر لوگوں کو حلال و حرام کی تمیز دلانے والے، تجھے تو عوام کی رہنمائی کے لیے مبعوث کیا گیا ہے تو نے خود ہی اللہ کے حلال کو کیوں حرام کر دیا ہے؟۔۔۔۔کیا ایسا تصور جناب خاتم النبیین سلام علیہ کے متعلق کیا جاسکتا ہے جن کا اقرار و اعلان اللہ تعالیٰ نے اپنی مقدس کتاب میں قیامت تک کے لیے محفوظ کر رکھا ہے: ان اتبع الا مایوحی الی ۶/۵۰+۱۰/۱۵+۹/۴۶ میں تو صرف اور صرف اسی ضابطے کی اتباع کرتا ہوں جو میری طرف وحی کیا گیا ہے۔۔۔۔آنحضور کے اس صحیح اور سچے اعلان کی روشنی میں:

۶/۲۸ آیہ تحریم کا صحیح مفہوم:

اب آیہ مجیدہ یایھا النبی لم تحرم ما احل اللہ لک تبتغی مرضات ازواجک ۱/۶۶ کا صحیح مفہوم ملاحظہ فرمائیں۔یاد رہے کہ لم تحرم استفہام[1] انکاری ہے اور تحرم فعل مضارع مستقبل کے لیے آیا ہے، حال کے لیے نہیں آیا۔

اے نبی ! تو ایسی چیز کو کیوں حرام کرے گا جو اللہ نے تیرے لیے حلال ٹھہرائی ہے۔(یعنی تو اللہ کے حلال کو کبھی حرام نہیں ٹھہرائے گا اس سلسلے میں) تو بیویوں کو خوشنودی کیوں چاہے گا؟(یعنی تو بیویوں کی خوشنودی کے لیے بھی اللہ کے کسی حلال کو حرام نہیں ٹھہرائے گا)

دیکھا آپ نے اپنے ان الفاظ میں کس طرح ناموس رسالت کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا گیا ہے لیکن جو آیت مجیدہ تحفظ ناموس رسول کی ضامن ہے، شان نزول کے روایتی نظریہ نے اسی آیت کی مدد سے حضور کے دامن عصمت کو اس بری طرح داغدار کر رکھا ہے، کہ قرآنی حلال و حرام کے ضامن سلام علیہ ہی نے اللہ کے حلال کو حرام کر دیا تھا۔العیاذ باللہ!

---

[1] عربی زبان کا عموماً قاعدہ ہے کہ استفہامیہ فقروں میں انکار سے اقرار اور اقرار سے انکار مقصود ہوتا ہے۔اسی طرح ۱/۶۶ میں جو بصورت استفہام ارشاد ہوا ہے کہ تو اسے کیوں حرام کرے گا جسے اللہ نے حلال کیا ہے۔تو یہ استفہام انکاری ہے۔اور مفہوم یہ ہے کہ اے نبی! آپ اللہ کے حلال کو کبھی بھی حرام نہیں ٹھہرائیں گے۔

۷/۲۸ شان نزول کا نظریہ خود شان باری کے بھی کے خلاف ہے۔

سابقہ تفاسیر و تراجم نے تصور دیا ہے کہ وضو کا حکم نازل کرنے کے بعد تیمم کا حکم اس وقت نازل ہوا تھا کہ جب رسول اکرم معہ صحابہؓ ایک سفر میں تھے۔ قافلہ ایسے مقام پر تھا' جہاں پانی موجود نہیں تھا۔ قافلے کو روانگی کا حکم ہوا چنانچہ کوچ ہونے والا تھا کہ حضرت عائشہؓ کا ہار گم ہو گیا۔ ہار کی تلاش میں نماز کا وقت تنگ ہو گیا۔ صحابہؓ نے حضرت ابوبکرؓ کو طعنے دینے شروع کیے کہ دیکھا تیری بیٹی نے کیا کیا ہے۔ نماز کا وقت جا رہا ہے پانی یہاں ہے نہیں اور اس قافلہ کو روک دیا ہے۔ اس پر حضرت ابوبکرؓ نے بیٹی کے کندھے پر کچوکے دیئے۔ اور بہت سخت سست کہا' لیکن اس نے اس لیے کوئی جواب نہ دیا کیونکہ آنحضور اس کے زانو پر سر رکھ کر سوئے ہوئے تھے۔ حضرت عائشہؓ صحابہؓ رسول اور والد بزرگوار کے طعنوں کو زہر کے گھونٹ کر کے پی گئیں۔ تو اس وقت تیمم کا حکم نازل ہوا کہ پانی نہ ہو تو تیمم کر لیا کرو۔ (ملخص بخاری شریف قرآن محل کراچی جلد دوم صفحہ ۷۷)

دیکھا آپ نے! یہ ہے آیہ تیمم کا شان نزول جس میں ناموس رسالت و صحابہؓ کو اس طرح مجروح کیا گیا ہے کہ قافلے بھر میں نماز کے وقت کے ضیاع کی بدولت اضطراب آیا ہوا ہے۔ اور آپ دوران سفر بھی زوجہ محترمہ کے زانو پر سر رکھے آرام فرما رہے ہیں کیا آنحضور کو نماز کے وقت کی فکر نہیں تھی؟ ۔۔۔۔۔ دوسرے نمبر پر اگر یہ واقعہ صحیح ہے تو صحابہ رسول کو زوجہؓ رسول کا اتنا بھی احترام نہیں تھا کہ ہار کا گم ہو جانا کوئی خود اختیاری امر نہیں۔ اور تیسرے نمبر پر خود خدا تعالیٰ کو کیا اتنا بھی معلوم نہیں تھا کہ امت پر ایسے وقت بھی آئیں گے جہاں وضو کے لیے پانی موجود نہیں ہوگا۔ تیمم کا حکم وضو کے حکم کے ساتھ ہی کیوں نہ نازل کر دیا کہ جہاں پانی نہ ملے تیمم کر کے نماز پڑھ لیا کرنا۔

افسوس ہے کہ روایات نے قرآن کریم سے پوری پوری بے اعتنائی اختیار کر رکھی ہے۔ ورنہ حقیقت حال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک ہی آیت مجیدہ ۵/۶ میں وضو کے حکم کے عین متصل وضاحت کر دی ہے: و ان کنتم مرضی او علی سفر او جاء احد منکم من الغائط او

لمستم النساء فلم تجدوا ماء فتيمموا صعيدا طيبا فامسحوا بوجوهكم و ايديكم منه ما يريد الله ليجعل عليكم من حرج ۵/۶. اور اگر (پانی موجود ہے لیکن) تم بیمار ہو (اور پانی مضر پڑتا ہے) تم سفر میں ہو۔ یا تم میں سے کوئی جائے ضرورت سے آئے۔ یا بیوی سے لمس کرے اور پانی نہ پائے تو آلائش کو پاکیزہ مٹی کے ساتھ صاف کر لیا کرو۔ اور منہ اور ہاتھوں سے گرد و غبار پونچھ لیا کرو۔ اللہ تعالیٰ تم پر کسی قسم کی تنگی کا ارادہ ہرگز نہیں کرتا۔ اب دیکھیے گا! کہ قرآن کریم ہر مسئلے کی ضروری شقیں ساتھ کے ساتھ بیان کرتا چلا جاتا ہے۔ مگر روایات ہیں کہ شان نزول کا شاخسانہ کھڑا کر کے یہ تصور دے رکھا ہے کہ جب تک کسی آیت کے نزول کے لیے اسباب پیدا نہیں ہوتے تھے نازل نہیں ہوتی تھی۔

۲۸/۸ ایک ضروری وضاحت۔

شان نزول کے ضمن میں واضح کرنے کی یہ چیز ہے کہ قرآن کریم میں بعض مقامات پر اللہ تعالیٰ نے اپنے مقدس رسول پر بعض مسائل کی وضاحت لوگوں کے سوال کرنے سے پہلے ہی اس طرح فرمادی تھی کہ لوگ آپ سے یہ سوال پوچھیں گے آپ یہ جواب دیجئے گا مثلاً ارشاد ہوا ہے:

یسئلونک ما ذا ینفقون ط قل العفو (۲/۲۱۹)

صاحب قرآن! لوگ آپ سے سوال کریں گے کہ وہ کہاں تک اللہ کی راہ میں خرچ کرتے چلے جائیں۔ آپ فرمادیجئے گا کہ تمہیں ضرورت سے زائد ہر چیز راہ اللہ میں دے دینی ہوگی۔

یسئلونک عن المحیض ط قل هو اذی (۲/۲۲۲)

صاحب قرآن! لوگ آپ سے عورتوں کے ماہواری کورس کے متعلق سوال کریں گے آپ فرمادیجئے گا کہ وہ ایک بیماری ہے ان ایام میں ان سے پرہیز کرتے رہنا۔ (وغیرہ وغیرہ)

واضح رہے کہ یسئلون فعل مضارع ہے۔ جو عربی زبان میں الگ الگ حال اور استقبال دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے مروجہ تراجم و تفاسیر نے اسے حال کے لئے مختص کر کے شان نزول کا جواز ثابت کیا ہے کہ لوگ جب آپ سے سوال کرتے تھے تو اللہ تعالیٰ ان کے سوال کو دہرا کر جواب نازل کرتا تھا۔ بالفاظ دیگر جب سائل سوال کرتا تھا تو معاذ اللہ معاذ اللہ آپ کے

پاس کوئی جواب موجود نہیں ہوتا تھا۔آپ وحی کا انتظار کرتے تھے۔اور جب وحی آتی تب جواب دیا کرتے تھے لیکن یہ چیز تو کسی انسان کے متعلق بھی باور نہیں کی جاسکتی کہ وہ کسی کو اپنا نمائندہ بنا کر کسی قوم کی طرف بھیجے لیکن اس قوم کے سوالوں کا جواب اور نمائندگی سے متعلقہ ہدایات دیئے بغیر روانہ کردے۔مگر اللہ تعالیٰ کے آخری نمائندہ رسول عربی کے متعلق تفاسیر میں لکھا ہے کہ لوگوں نے قصہ اصحاب کہف کے متعلق سوال کیا لیکن آنحضور کے پاس جواب موجود نہیں تھا آپ نے فرمایا کل بتاؤں گا خیال یہ تھا کہ جبرئیل آئیں گے اور پوچھ کر بتادوں گا لیکن جبرئیل نہ آئے اٹھارہ دن اور آپ معاذ اللہ! اٹھارہ دن تک لوگوں کے سامنے ندامت اٹھاتے رہے (دیکھئے حاشیہ موضح القرآن متعلقہ آیات مجیدہ ۲۳۔۲۴/ ۱۸) اس کے برعکس اللہ تعالیٰ اور اس کے مقدس نمائندہ کی شان یہی ہوسکتی ہے کہ سوال سائل کے منہ میں ہو اور ادھر جواب حاضر و موجود ہو۔پس اس ٹھوس مسلمہ کی رو سے یسئلونک فعل مضارع سے زمانہ حال مراد نہیں بلکہ زمانہ استقبال مراد ہے۔اور قوم کے ہر قسم کے سوالوں کے جوابات حضور کو قبل از وقت ہی عطا کردیئے گئے تھے کہ اے رسول! لوگ آپ سے یہ سوال کریں گے آپ یہ جواب دینا۔یہ سوال کریں گے تو یہ جواب دینا۔

المختصر! شان نزول کے روایاتی نظریہ کے مطابق چونکہ ناموس باری اور ناموس رسالت دونوں مجروح ہوتی ہیں۔اس لئے یہ نظریہ مطلقاً غیر قرآنی' غلط اور زمانہ رسالت سے کہیں بعد کی پیداوار ہے۔

فلھذا از یر نظر ترجمہ اور تفسیر میں روایاتی شان نزول کی طرف ہرگز رخ نہیں کیا گیا بلکہ قرآن کریم کے اپنے بتائے ہوئے مندرجہ بالا اصول و قواعد کے مطابق قرآن کی تفسیر خود قرآن کریم کے ساتھ کی گئی ہے۔

۲۹۔حروفِ مقطعات

۲۹/۱ کیا حروفِ مقطعات کا مفہوم' معاذ اللہ رسول کریم بھی نہیں جانتے تھے۔

قرآن کریم کی متعدد سور مجیدات کے ابتداء میں الـمٓ' الـمٓـصٓ کی قسم کے حروف آئے ہیں جن کے متعلق سابقہ تفاسیر وتراجم نے ایک تصور تو یہ دیا ہے: اللہ اعلم حیث مرادہ اس کا معنی اور مفہوم اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اور دوسرا تصور دیا ہے کہ ان کا مفہوم اللہ اور اس کا رسول ہی جانتے ہیں انہوں نے کسی کو بھی نہیں بتایا۔ اول تو یہ نظریے اس لحاظ سے بھی محل نظر ہیں' کہ اگر ان حروف کا مفہوم پوشیدہ رکھنا ہی منظور تھا تو ان کے نازل کرنے کا کیا مقصد؟ کیا یہ صرف محبت کے تعویذوں پر لکھنے کے لئے نازل کئے گئے تھے؟ العیاذ باللہ۔ ان میں سے پہلا تصور انتہائی خطرناک ہے کہ کیا ان کا مفہوم رسول مقبول بھی نہیں جانتے تھے؟ حالانکہ یہ حروف قرآن کریم کا حصہ ہیں اور اللہ تعالیٰ نے پورے قرآن کریم کے متعلق چار مرتبہ کے تکرار کے ساتھ اعلان فرمایا ہے: ولقد یسرنا القران للذکر فھل من مدکر ۵۴/۴۰-۳۲-۲۲-۱۷ اور بے شک بے شک ہم نے پورے قرآن کو نصیحت کے لیے آسان کر دیا ہے۔ ہے کوئی نصیحت حاصل کرنے والا۔ ان آیات کریمات میں القرآن کا الف لام استغراقی ہے۔ اور واضح کر دیا گیا ہے کہ حروف مقطعات سمیت سارے کا سارا قرآن کریم آسان اور انسانی فہم وادراک کے عین مطابق ہے۔

۲۹/۲۔حروف مقطعات کیا ہیں؟

تقطیع کا معنی ہے کاٹنا' جدا کرنا۔ لہذا مقطعات اپنے الفاظ سے قطع کردہ حروف ہیں۔ جو اپنے اپنے الفاظ کے قائم مقام کے طور پر از روئے اختصار آتے ہیں۔ اختصار کا یہ طریقہ ہر زبان میں موجود ہے۔ مثلاً انگریزی میں ڈپٹی کمشنر کے لیے ڈی۔سی' اور ڈویژنل آفیسر کے لئے ڈی۔او استعمال ہوتا ہے چنانچہ ڈی ڈپٹی کا۔ اور سی کمشنر کا قائم مقام ہے۔ اور اسی طرح ڈی ڈویژنل کا اور

اور آفیسر کا قائم مقام ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا قرآن کریم میں قطع حروف کی کوئی مثال موجود ہے؟ اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک رسول کا تعارف دو ناموں ال یاسین اور الیاس سے کرایا ہے۔ اول الذکر ان کا پورا نام ہے۔ اور موخر الذکر قطع کردہ۔ قطع حرف کے لیے ذیل کے نقشہ کو بغور ملاحظہ فرمائیں:

۱۔ الیاسین = الیا+سین

۲۔ الیاس = الیا+ س ← قطع کردہ از سین

دیکھیے! اس نقشہ سے بالصراحت عیاں ہو رہا ہے کہ الیاس کا س الیاسین کے سین کا پہلا قطع کردہ حرف ہے۔ ارباب عقل و دانش کے لیے قرآن کریم کی یہ مثال حروف مقطعات کو سمجھنے کے لیے کافی ہے کہ وہ اپنے اپنے الفاظ کے قطع کردہ پہلے حروف ہیں اور اپنے اپنے پورے الفاظ کے قائم مقام ہیں۔

۳/۲۹۔ روایاتی اور قرآنی تصور کا الگ الگ خاکہ۔

ایک طرف تو روایات یہ تصور دیتی ہیں کہ حروف مقطعات کا مفہوم صرف اللہ یا اللہ اور رسول کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اور نہ انہوں نے ان کا کوئی مفہوم بتایا ہی ہے۔ اور دوسری طرف الـــم کا یہ مفہوم بتایا بھی جاتا ہے کہ الف سے اللہ لام سے جبریل اور م سے محمد مراد ہے۔ کیا خوب کلیہ اختیار کیا گیا ہے کہ دو لفظوں اللہ اور محمد کے تو پہلے حروف قطع کر لیے ہیں۔ اور تیسرے لفظ جبریل کا آخری حرف کاٹ لیا ہے۔ اور میم مشددہ جو دراصل دو میم ہیں ان میں سے ایک میم چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اور بعض لوگ الـــم کا مفہوم بتاتے ہیں آل محمد۔

اب بتایئے حقیقت حال کی طرف! حروف مقطعات کا مفہوم سمجھنے کے لیے ایک آسان ترین مقطعہ پر غور فرمائیں۔

یٰس ○ و القران الحکیم ○ انک لمن المرسلین ○ ۱ تا ۳/۳۶ ۔ یٰس میں یا حرف ندا اور س منادیٰ ہے۔ اور انک میں ک ضمیر واحد مذکر مخاطب آئی ہے جو اپنے مرجع کو چاہتی

ہے۔اور یہاں دوپہر کے سورج کی طرح عیاں ہے کہ اس ضمیر کا مرجع س ہی ہے جسے قرآن کریم کی شہادت کے ساتھ کہا گیا ہے کہ بلاشبہ آپ ہمارے رسولوں میں سے ایک رسول ہیں۔اب بتایئے گا کہ یہ کونسی ذات مقدس ہے جنہیں نزول قرآن کے ساتھ شرف رسالت عطا ہوا تھا؟ ۔۔۔اب دیکھیئے! اس کے جواب میں آپ کی زبان پر بے ساختہ آ رہا ہے' حضور صاحب نور کا نام نامی محمد رسول اللہ ۔ پس یس کے بعد آنے والی ک ضمیر واحد مخاطب نے ثابت کر دیا کہ س حرف مقطعہ جناب محمد رسول اللہ سلام علیہ ہی کے لیے آیا ہے اور یہ حضور کا لقب گرامی ہے' جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے آپ کو مخاطب کر ارشاد فرمایا ہے کہ اے س! آپ بھی ہمارے رسولوں میں سے ایک رسول ہیں۔

۲۹/۴۰ س کا مفہوم۔

س کیا ہے اور یہ کس لفظ کا قطع کردہ حرف ہے؟ اس کا جواب انک لمن المرسلین کی خداوندی خبر کے مطابق رسولوں کی صفات حمیدہ کی فہرست میں ملے گا۔ حضرت زکریا علیہ السلام کو' حضرت یحییٰ علیہ السلام کی خوشخبری ان الفاظ میں دی گئی ہے: ان اللہ یبشرک بیحی مصدقا بکلمۃ من اللہ و سیدا و حصورا و نبیا من الصلحین ۳۹/۳۔ اے زکریا! بلاشبہ' اللہ تجھے یحییٰ کی خوشخبری دیتا ہے' جو قانون الٰہی کا مصدق سید متحمل مزاج' نبی اور صالحین میں سے ہوگا۔ اس آیت مجیدہ میں حضرت یحییٰ علیہ السلام کی پانچ صفتیں بیان ہوئیں ہیں۔ جن میں ایک صفت سید ہے۔ پس لا نفرق بین احد من رسلہ ۲/۲۸۵۔ کے مطابق اللہ کے سب رسول معہ آنحضور سید ہیں۔ فلہٰذا ثابت ہوا کہ یس کا س لفظ سید سے قطع کردہ پہلا حرف ہے۔ اور سید آنحضور کا قرآنی لقب گرامی ہے' جو انبیاء سلام علیہم کے لیے مختص ہے۔

۲۹/۵۔ حروف مقطعات کا قاعدہ کلیہ۔

حرف مقطعہ س کی قرآنی بحث سے حروف مقطعات کے متعلق یہ قاعدہ کلیہ نکھر کر عیاں ہو چکا کہ جملہ حروف مقطعات آنحضور کے القاب گرامی اور اپنے اپنے الفاظ سے قطع کردہ پہلے حروف ہیں۔ واضح رہے کہ قرآن کریم کی ۲۹ سورتوں کی ابتداء میں الگ الگ ذیل کے حروف

مقطعات آئے ہیں:

آلــــم ۔ سورۂ بقرہ۔آل عمران، عنکبوت، روم، لقمان اور سجدہ۔ چھ سورتوں کے شروع میں آئے ہیں۔

الـمص — سورۂ اعراف کے شروع میں۔اور آلر سورۂ یونس، ہود، یوسف، ابراہیم اور حجر پانچ سورتوں کی ابتداء میں آئے ہیں۔

آلمر ۔سورۂ رعد کے شروع میں اور حــــم سورۂ مومن، حم سجدہ، زخرف، دخان، جاثیہ اور احقاف چھ سورتوں کی ابتداء میں آئے ہیں۔

طــس ۔سورۂ نمل کے شروع میں۔اور طسم سورۂ شعراء اور قصص کی ابتداء میں آئے ہیں۔

طــــہ۔سورۂ طٰہٰ اور یــس سورۂ یٰس کے شروع میں، ص سورۂ ص کے شروع میں ق سورۂ ق کی ابتداء میں آیا ہے۔

ن سورۂ قلم کے شروع میں آیا ہے، حــم عسق سورۂ شوریٰ کی اور کھیعص سورۂ مریم کی ابتداء میں آئے ہیں۔

جیسے کہ حرف مقطعہ س کی بحث میں ثابت کیا جا چکا ہے کہ جملہ حروف مقطعات آنحضور کے القاب گرامی ہیں۔ پس واضح رہے کہ انہیں ہر جگہ پر، یا تو مرجع کی حیثیت حاصل ہے یا مامور کی۔اور ہر مقام پر حروف مقطعات کے بعد یا تو آنحضور کے لیے ک ضمیر حاضر مخاطب آئی ہے، جس کا مرجع حروف مقطعات ہیں اور یا آپ ہی کو مخاطب کر کے کوئی حکم دیا گیا ہے۔ذیل میں جملہ حروف مقطعات الگ الگ معہ ضمائر مخاطب پیش خدمت ہیں۔

آلم۔سورۂ بقرہ، یؤمنون بما انزل الیک وما انزل من قبلک ۲/۴ کے الفاظ میں دو مرتبہ کے تکرار کے ساتھ ک ضمیر مخاطب میں آنحضور سلام علیہ کو مخاطب کیا گیا ہے۔اور ان ضمائر کا مرجع آلم ہے۔سورۂ آل عمران میں نزل علیک الکتب ۳/۳۔سورۂ عنکبوت میں ولئن جاء نصر من ربک ۲۹/۱۰۔سورۂ سجدہ میں بل ھو الحق من ربک ۳۲/۳۔سورۂ روم میں فاقم وجھک ۳۰/۳۰۔الگ الگ ک ضمیر مخاطب آنحضور ہی کے لیے آئی ہے۔اور

سورۂ لقمان میں فبشرہ بعذاب الیم ۳۱/۷ کے الفاظ میں آنحضور سلام علیہ ہی کو مخاطب کیا گیا ہے۔ ل جس سے بالوضاحت ثابت ہوا کہ آلم حروف مقطعات حضور سلام علیہ ہی کے لیے القاب گرامی ہیں۔ جن کے ساتھ آپ کو ان چھ سورتوں کے شروع میں مخاطب کیا گیا ہے۔

المص سورۂ اعراف میں کتب انزل الیک فلا یکن فی صدرک ۷/۲ کے الفاظ میں دو مرتبہ کے تکرار کے ساتھ ک ضمیر مخاطب میں آنحضور ہی کو مخاطب کیا گیا ہے۔ اور ان ضمائر کا مرجع المص ہے۔

الر کے خطاب سے سورۂ یونس میں قل مایکون لی... الخ ۱۰/۱۵ کے الفاظ میں آنحضور ہی کو مخاطب کیا گیا ہے۔ سورۂ ہود میں قل محذوف کے ساتھ آنحضور ہی کو حکم ہوا ہے کہ اعلان کر دیجئے گا انني لكم منه نذير و بشير ۱۱/۲۔ سورۂ یوسف میں نحن نقص علیک احسن القصص ۱۲/۳۔ اور سورۂ ابراہیم ۱۴/۱ میں کتب انزلنه الیک کے الفاظ میں الگ الگ ک ضمیر مخاطب کے ساتھ آنحضور ہی کو خطاب کیا گیا ہے۔ اور سورۂ حجر ۱۵/۳ میں ذرهم کے فعل امر کے ساتھ آنحضور ہی کو حکم دیا گیا ہے کہ مخالفین کو چھوڑ دیجئے گا۔ فلہٰذا حروف مقطعات الر بھی حضور سلام علیہ ہی کے القاب گرامی ہیں جن کے ساتھ پانچ سورتوں کے شروع میں آپ کو مخاطب کیا گیا ہے۔

المر کے خطاب سے سورۂ رعد میں والذی انزل الیک من ربک الحق ۱۳/۱ کے الفاظ میں دو مرتبہ کے تکرار کے ساتھ ک ضمیر مخاطب لا کر آنحضور ہی کو مخاطب کیا گیا ہے کہ اور ان

ل سورۂ روم میں الم حروف مقطعات کے بعد تیسویں آیت میں ک ضمیر مخاطب آئی ہے۔ واضح ہے کہ ضمیر کے مرجع سے دور واقع ہونے سے حروف مقطعات کی حیثیت پر کوئی مخالف اثر نہیں پڑتا۔ کیونکہ سورۂ بقرہ اور آل عمران میں مرجع الم کے عین متصل ضمیر مخاطب موجود ہے: آلم ٥ الله لا اله الا هو الحی القیوم ٥ نزل علیک الکتب بالحق ۱ تا ۳/۲۔ اسی طرح باقی حروف مقطعات کے بعد بھی اگر کہیں ضمیر مخاطب یا قل کا خطاب ذرا دور وارد ہوا ہو تو اس سے کوئی حرج واقع نہیں ہوتا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے دوسری جگہ پر انہی مقطعات کے عین متصل ضمیر مخاطب لا کر شک و شبہ کی گنجائش تک ختم کر دی ہوئی ہے۔

ضمائر کا مرجع المر ہے۔

حٰمٓ کے خطاب سے سورۂ مومن میں فلا یغررک ۴/۴۰۔۔۔سورۂ دخان میں رحمۃ من ربک ۶/۴۴۔اور سورۂ جاثیہ میں تلک ایت اللہ نتلوھا علیک بالحق ۶/۴۵ میں الگ الگ کَ ضمیر مخاطب کے ساتھ آنحضور ہی کو مخاطب کیا گیا ہے۔۔۔سورۂ احقاف میں قل ارء یتم..... الخ ۴/۴۶۔اور سورۂ حم سجدہ میں قل انما انا بشر مثلکم ۶/۴۱۔اور سورۂ زخرف میں لئن سالتھم..... الخ ۹/۴۳ کے الفاظ میں آنحضور ہی کو مخاطب کیا گیا ہے جس سے ثابت ہوا کہ حٰمٓ کے حروف مقطعات بھی حضور سلام علیہ کے القاب گرامی ہیں۔جن کے ساتھ آپ کو چھ سورتوں کے شروع میں مخاطب کیا گیا ہے۔

طٰسٓ کے خطاب سے سورۂ نمل میں انک لتلقی القران..... الخ ۶/۲۷ کے الفاظ میں کَ ضمیر واحد مخاطب کے ساتھ آنحضور ہی کو مخاطب کیا گیا ہے اور اس ضمیر کا مرجع طٰسٓ ہے۔

طٰسٓمٓ کے خطاب سے سورۂ شعراء لعلک باخع نفسک ۲/۲۶ کے الفاظ میں دو مرتبہ کے تکرار کے ساتھ۔اور سورۂ قصص ۳/۲۸ میں بھی نتلوا علیک کے الفاظ میں الگ الگ کَ ضمیر مخاطب کے ساتھ آنحضور ہی کو مخاطب کیا گیا ہے جس سے ثابت ہوا کہ طٰسٓمٓ بھی آنحضور کے القاب گرامی ہیں۔

طٰہٰ کے خطاب سے سورۂ طٰہٰ میں ما انزل علیک القران لتشقی ۲/۲۰ کے الفاظ میں کَ ضمیر مخاطب کے ساتھ حضور ہی کو مخاطب کیا گیا ہے۔

یٰسٓ کے خطاب سے سورۂ یٰسٓ میں انک لمن المرسلین ۳/۳۶ کے الفاظ میں آنحضور ہی کے لیے کَ ضمیر مخاطب آئی ہے۔

صٓ کے خطاب سے سورۂ صٓ میں ام عندھم خزائن رحمۃ ربک ۹/۳۸ کے الفاظ میں حضور سلام علیہ ہی کے لیے کَ ضمیر مخاطب آئی ہے۔

قٓ کے خطاب سے سورۂ قٓ میں فاصبر علی ما یقولون ۳۹/۵۰ میں فعل امر کے ساتھ آنحضور سلام علیہ کو مخاطب کیا گیا ہے۔

نٓ کے خطاب سے سورۂ قلم میں ما انت بنعمة ربک بمجنون ۲/۶۸ کے الفاظ میں انت اور لك ضمائر مخاطب کے دو مرتبہ کے تکرار کے ساتھ آنحضور سلام علیہ ہی کو مخاطب کیا ہے۔ صٓ، قٓ اور نٓ یک حرفہ مقطعات ہیں۔ ان میں حرف مقطعہ قٓ کے خطاب کے بعد فاصبر فعل امر اگرچہ ذرا دور جا کر وارد ہوا ہے لیکن اس سے حرف مقطعہ کی اصل حیثیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ کیونکہ یک حرف مقطعہ صٓ کے قریب لك ضمیر مخاطب آئی ہے۔ اور نٓ حرف مقطعہ کے بالکل متصل دو مرتبہ کے تکرار کے ساتھ آنحضور سلام علیہ کے لیے انت اور لك دو ضمائر مخاطب واقع ہوئی ہیں۔

حمٓ ٥ عسٓقٓ کے خطاب سے سورۂ شوریٰ میں یوحی الیک والی الذین من قبلک ۳/۴۲ کے الفاظ میں دو مرتبہ کے تکرار کے ساتھ آنحضور سلام علیہ ہی کے لیے لك ضمیر مخاطب لائی گئی ہے۔ اور ان ہر دو ضمائر کا مرجع حمٓ عسٓقٓ ہی ہے۔

کھٰیٰعٓصٓ کے خطاب سے سورۂ مریم میں ذکر رحمة ربک ۲/۱۹ کے الفاظ میں آنحضور سلام علیہ ہی کے لیے لك ضمیر مخاطب لائی گئی ہے جس کا مرجع کھٰیٰعٓصٓ ہی ہے۔

۱۰۔ حروف مقطعات کے الگ الگ مفاہیم

یہاں تک تو صرف اس امر کی وضاحت کی گئی ہے کہ قرآن کریم میں آمدہ حروف مقطعات اپنے اپنے پورے الفاظ سے قطع کردہ پہلے حروف ہیں۔ اور چونکہ ہر ایک کے بعد آنحضور کے نام یا تو کسی فعل امر کے ساتھ کوئی حکم دیا گیا ہے۔ اور یا کہ ضمیر مخاطب کے ساتھ آپ کو خطاب کیا گیا ہے پس یہ سب آنحضور سلام علیہ کے وہ القاب گرامی ہیں جن کے ساتھ خداوند عالم نے آپ کو مخاطب کر کے اپنا پیغام اپنے بندوں تک پہنچایا ہے۔ اب رہا سوال حروف مقطعات کے مطالب ومفاہیم کا:

جواباً عرض ہے کہ جس طرح سی۔ آئی۔ سی کا مفہوم ملٹری ڈیپارٹمنٹ ہی بتا سکتا ہے کہ یہ کمانڈر ان چیف کا مخفف ہے اور ڈی۔ ایس۔ پی کے مفہوم کی وضاحت محکمہ سول ہی کر سکتا ہے کہ یہ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس کا قائم مقام ہے۔ اسی طرح قرآنی حروف مقطعات کا مفہوم صرف

قرآن کریم ہی سے دریافت کیا جا سکتا ہے جیسے کہ مضمون کے شروع میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ حرف مقطعہ ںٓ کا مفہوم خود قرآن نے متعین کیا ہے سید۔

اب باقی حروف مقطعات کا مفہوم آئینہ قرآنیہ میں ملاحظہ فرمائیں : یاد رہے کہ حروف مقطعات اگرچہ ۲۹ سورتوں کے شروع میں آئے ہیں لیکن بعض مقطعات چونکہ بتکرار وارد ہوئے ہیں۔ مثلاً آلـم چھ سورتوں کے شروع میں' الـر پانچ سورتوں' طسـم دوسورتوں اور حـم چھ سورتوں کی ابتداء میں آئے ہیں۔ اس لیے حروف مقطعات کی تعداد ۱۴ ہے۔ لہٰذا بالترتیب ۱۴ نمبروں میں ان کے قرآنی مفاہیم' خود آیات قرآنیہ کی روشنی میں حاضر خدمت ہیں۔

۱/ ۳۰ الـم یہ چار حروف ہیں۔ الف۔ لام اور میم مشددہ' جن کے ساتھ چھ سورتوں' بقرہ' آل عمران' عنکبوت' روم' لقمان اور سجدہ کے شروع میں آنحضور سلام علیہ کو مخاطب کیا گیا ہے۔ الف سے امین۔ لام سے لین القلب' میم سے مرسل اور میم ثانی سے محمد سلام علیہ مراد ہے۔ یہ حروف بالترتیب مذکورہ الفاظ سے قطع کردہ پہلے حروف ہیں اور اپنے اپنے پورے لفظ کے قائم مقام ہیں۔ ثبوت کے لیے سطور ذیل بغور ملاحظہ فرمائیں:

ا۔ الف سے امین مراد ہے۔

قرآن کریم شاہد ہے کہ اللہ کے سب نبی رسول امین [۱] تھے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۂ شعراء میں متعدد رسولوں کو خود انہیں کے الفاظ میں امین بتا کر قرآن کریم میں قیامت تک کے لیے محفوظ کر رکھا ہے:

☆ حضرت نوح علیہ السلام نے قوم سے کہا: انـی لـکـم رسـول امین ۱۰۷/۲۶۔ اور بعینہٖ یہی جملہ حضرت ہود علیہ السلام کی طرف سے ۱۲۵/۲۶ میں حضرت صالح علیہ السلام کی طرف

---

[۱] اللہ کے رسول امین رسالت تھے۔ اللہ کے پیغام میں نہ کمی کرتے تھے نہ زیادتی۔ سابقہ انبیاء اپنی اپنی قوم کی طرف بھیجے گئے تھے۔ لیکن آنحضور سلام علیہ کے بعد چونکہ کوئی نبی رسول آنے والا نہیں تھا اس لیے آپ سے اعلان کروایا گیا: قل یایها الناس انی رسول الله الیکم جمیعا ۱۵۸/۷۔ اے رسول! اعلان کر دیجئے گا کہ لوگو! میں تم سب (یعنی قیامت تک کی نوع انسانی) کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں۔

سے۱۴۳/ ۲۶ میں' حضرت لوط علیہ السلام کی طرف سے۱۶۲/ ۲۶ میں' اور حضرت شعیب علیہ السلام کی طرف سے۱۷۸/ ۲۶ میں موجود ہے۔

مندرجہ بالا قرآنی شواہد اور لا نفرق بین احد من رسلہ ۲/۲۸۵ کے مطابق اللہ تعالیٰ کے جملہ نبی رسول امین تھے' اور چونکہ انک لمن المرسلین ۳/ ۳۶ کے خداوندی ارشاد کے مطابق حضور سلام علیہ بھی رسولوں میں سے ایک تھے۔ لہذا حضور بھی امین ہیں۔ اور چونکہ الـم حضور کے القاب گرامی ہیں۔ فلہذا الـم میں الف اپنے پورے لفظ امین کا قطع کردہ پہلا حرف اور اسی کا قائم مقام ہے۔

ب۔ لام سے لین القلب مراد ہے حضور سلامٌ علیہ لین القلب تھے۔

اللہ کا پیغام جب اللہ کے رسول' اس کے بندوں تک پہنچاتے تو سرکش لوگ رسل انبیاء پر قسم قسم کی پھبتیاں کستے اور طعنے دیتے چنانچہ قرآن کہتا ہے کہ آنحضور سلام علیہ کو مفتری' ساحر' کاہن اور مجنون وغیرہ کے برے القاب سے ملقب کر کے آپ کا مذاق اڑایا جاتا تھا۔ جب مخالفین' مجلس رسول میں آتے تو انکا انداز کلام اس قدر تمسخر و تضحیک کا مرقع ہوتا کہ اگر حضور متین و متحمل مزاج نہ ہوتے تو برہم ہو جاتے اور لوگ مجلس سے اٹھ کر چلے جاتے لیکن حضور اس قدر متحمل مزاج اور نرم دل (لین القلب) واقع ہوئے تھے کہ آپ کو شاعر' کاہن' دیوانہ اور مفتری کی پھبتیاں برہم نہیں کر سکتی تھیں۔ اسی چیز کی وضاحت میں آنحضور کے متعلق ارشاد ہوتا ہے:

فبما رحمة من اللہ لنت لھم ولو کنت فظا غلیظ القلب لا نفضوا من حولک ۳/۱۵۹ صاحب قرآن! اللہ کی رحمت سے لوگوں کے لیے آپ لین القلب نرم دل ہیں۔ اگر آپ غلیظ القلب سخت دل ہوتے تو لوگ آپ کی مجلس سے بھاگ جاتے۔ دیکھئے! یہاں حضور سلامٌ علیہ کی صفت غلیظ القلب کی ضد لین القلب بیان ہوئی ہے۔ پس حروف مقطعات الـم میں لام اپنے پورے الفاظ لین القلب کا پہلا قطع کردہ حرف اور انہی کا قائم مقام ہے۔

ج۔ میم سے مراد ہے مرسل۔

الـم کا میم اول لفظ مرسل کا قطع کردہ پہلا حرف اور اسی کا قائم مقام ہے۔ حضور کا مرسل ہونا

آیت ذیل سے ثابت ہے: انک لمن المرسلین ۳/۳۱

د۔ میم ثانی سے مراد ہے محمد، حمد در حمد کیا ہوا۔

الـم کا میم ثانی لفظ محمد کا پہلا قطع کردہ حرف ہے۔ محمد کے معنی ہیں حمد در حمد کیا ہوا بے حد تعریفوں والا۔ یہ بھی آنحضور سلام علیہ کا لقب گرامی ہے۔ جو کثرت استعمال کی بدولت آپ کا نام مشہور ہو چکا ہے۔ قرآن کریم نے حضور سلام علیہ کا نام نامی اور اسم گرامی احمد سلام علیہ بتایا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے الفاظ میں مذکور فی القران ہے:

و اذ قال عیسی ابن مریم یبنی اسرآء یل انی رسول الله الیکم مصدقا لما بین یدی من التورته و مبشرا برسول یاتی من بعدی اسمه احمد ۶/۶۱۔ اور وہ وقت قابل ذکر ہے جب مریم کے بیٹے عیسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ اے بنی اسرائیل! میں تمہاری طرف اللہ کا بھیجا ہوا آیا ہوں۔ توراۃ کی تصدیق کرنے والا ہوں، جو مجھ سے پہلے آ چکی ہے۔ اور ایک رسول کی خوشخبری دینے والا ہوں جو میرے بعد آئے گا۔ اس کا نام احمد ہوگا۔

دیکھئے! قرآنی شہادت کے مطابق حضور کا اسم گرامی احمد ہے۔ اور محمد سلام علیہ چونکہ آپ کے القاب کی فہرست میں مذکور ہے۔ اس لیے قرآنی رہنمائی کے مطابق حضور سلام علیہ کا لقب گرامی ہے۔۔۔ یاد رہے کہ اس سے ہماری غرض کوئی نئی بحث کھڑی کرنا نہیں۔ بلکہ یہ بتانا مقصود ہے کہ قرآن کریم اس امر کی رہنمائی کرتا ہے کہ جب لفظ محمد کا کسی دوسری زبان میں ترجمہ کیا جائے تو اس کے معنی اجاگر کیے جائیں۔

محمد بمعنی حمد در حمد اور تعریف در تعریف کیا ہوا

المختصر! الـم کے الف سے مراد ہے امین۔ لام سے لین القلب۔ میم اول سے مرسل اور میم ثانی سے مراد ہے محمد (حمد در حمد کیا ہوا)۔ سلام علی الـم

۲/۳۰۔ المص:

یہ پانچ حروف ہیں جو صرف سورۂ اعراف کے شروع میں آئے ہیں۔ پہلے چار حروف کی

وضاحت سطور بالا میں گزر چکی ہے۔آخری حرف صؔ' صاحب الناس اور صاحب قرآن کا پہلا قطع کردہ حرف اور انہی کا قائم مقام ہے۔

ماضل صاحبکم ۵۳/۲ میں کم ضمیر جمع مذکر مخاطب آئی ہے۔جو زمانہ رسالت سے لے کر قیامت تک کے مخاطبین سے خطاب کرتی چلی جائے گی۔فلہذا صاحبکم کی قرآنی خبر کے مطابق حضور صاحب الناس یعنی دنیائے انسانیت کے ساتھی (مونس و غمخوار) تھے۔اور پیشتر عرض کیا جا چکا ہے کہ ۱۵۸/۷ کے مطابق آنحضور سلام علیہ قیامت تک کی نوع انسانی کے رسول تھے۔کیونکہ آپ کے بعد کوئی نبی رسول آنے والا نہیں۔اور قیامت تک کی نوع انسانی کے ساتھ آپ کی مذکورہ مصاحبت صرف اور صرف اس کتاب مقدس کے واسطے ہی سے قائم اور قائم رہے گی جو قیامت تک کے لوگوں کے پاس اپنے صحیح متن کے ساتھ پہنچنے والی ہے یعنی قرآن کریم۔اس لیے ثابت ہوا کہ حضور سلام علیہ صاحب الناس بھی ہیں اور صاحب قرآن بھی۔۔۔۔
فلہذا المص میں الف سے امین لام سے لین القلب میم اول سے مرسل میم ثانی سے محمد اور ص سے صاحب قرآن اور صاحب الناس مراد ہے۔(سلام علی المص)

۳/۳۰۔ الرا۔

یہ تین حروف ہیں جو سورہ یونس' ہود' یوسف' ابراہیم اور حجر کی ابتدا میں آئے ہیں۔پہلے دو حروف مقطعات الف اور لام کی وضاحت اوپر گزر چکی ہے تیسرا حرف ہے۔راجو راکع سے علامت فتح سمیت قطع کردہ پہلا حرف ہے۔قرآن کریم میں آنحضور کے نام حکم صادر ہوا ہے: اقم الصلوۃ ۱۱۴/۱۱+۷۸/۱۷۔جس میں آنحضور سلام علیہ کو ہمیشہ صلوٰۃ ادا کرتے رہنے کا حکم دیا گیا ہے۔نیز قرآنی شہادت کے مطابق آپ قرآن کریم کے سو فیصدی متبع تھے ان اتبع الا ما یوحی الی ۵۰/۶+۱۵/۱۰+۹/۴۶ پس آپ سو فیصدی صلوٰۃ گزار تھے۔اور چونکہ قیام' رکوع اور سجدہ صلوٰۃ کے رکن ہیں۔پس آپ قائم بھی تھے قیام صلوٰۃ کرنے والے۔راکع بھی تھے رکوع صلوٰۃ کرنے والے۔اور ساجد بھی تھے سجدہ صلوٰۃ کرنے والے۔

فلہذا الر میں الف سے امین لام سے لین القلب اور را سے راکع مراد ہے۔(سلام علی الر)

۳۰/۴۔ المر :

یہ پانچ حروف ہیں جو سورۂ رعد کے شروع میں آئے ہیں۔ الف۔ لام۔ میم۔ میم۔ را۔ ان پانچوں کی وضاحت اوپر گزر چکی ہے: امین' لین القلب' مرسل' محمد' راکع۔ (سلام علی المر)

۳۰/۵۔ یس :

کی وضاحت اوپر گزر چکی ہے کہ یا حرف ندا اور منادیٰ ہے۔ جو سید کا پہلا قطع کردہ حرف ہے۔ (سلامٌ علی یسٓ)

۳۰/۶۔ صٓ :

یہ صاحب قرآن کا پہلا قطع کردہ حرف ہے۔ وضاحت کے لیے دیکھئے عنوان المص (سلامٌ علی ص)

۳۰/۷۔ ق :

قائم کا پہلا قطع کردہ حرف ہے۔ قیام صلوٰۃ کرنے والا۔ وضاحت کے لیے دیکھئے عنوان الر۔ (سلامٌ علی ق)

۳۰/۸۔ نٓ :

سورۂ قلم کے شروع میں آیا ہے۔ اور نذیر کا قطع کردہ پہلا حرف ہے۔ قرآنی سند کے لیے ملاحظہ ہو آیت ذیل' جس میں آپ کو قیامت تک کی نوع انسانی کے لیے نذیر ٹھہرایا گیا ہے: قل یایھا الناس انما انا لکم نذیر مبین ۲۲/۴۹ ۔ اے رسول ! اعلان کردیجئے گا کہ اے نوع انسانی میں تم سب کے لیے نذیر مبین ہوں۔ (سلامٌ علی نٓ)

۳۰/۹۔ طٰہٰ :

یہ دو حروف ہیں طٰ اور ہٰ' جو بالترتیب طاہر اور ہادی کے پہلے قطع کردہ حروف اور انہی الفاظ کے قائم مقام ہیں۔ ملاحظہ ہوں قرآنی اسناد: انہ لقران کریم ٥ فی کتب مکنون ٥ لا

یمسـه الا المطهـرون ۷۷تا۷۹/ ۵۶۔ بے شک وہ ایک بلند مرتبہ قرآن ہے۔کائنات کی پراسرار کتاب میں موجود ہے۔اس کی طرف صرف وہی لوگ آتے ہیں' جو طاہر و پاکیزہ ہیں۔۔ اب چونکہ قرآن کریم کا نزول ہی آنحضور سلام علیہ پر ہوا تھا۔لہذا حضور سلام علیہ بدرجہ اولیٰ طاہر واطہر ہیں۔اس کے بعد حضور سلام علیہ کے ہادی ہونے کی قرآنی سند ملاحظہ فرمائیں۔ارشاد باری ہے: انما انت منذر و لکل قوم هاد ۷/۱۳۔اے رسول !بے شک آپ نذیر ہیں۔اور ہر ایک قوم کے لیے ایک ہادی ہے۔آنحضور سلام علیہ چونکہ قل یایها الناس انما انا لکم نذیر مبیـن کے مطابق قیامت تک کی اقوام کے لیے نذیر ہیں۔اس سے ثابت ہوا کہ سابقہ انبیاء علیہ السلام الگ الگ اقوام کے لیے ہادی اور نذیر تھے لیکن آپ قیامت تک کے لیے ہادی اور نذیر ہیں۔پس حروف مقطعات طٰہٰ میں ط سے مراد طاہر اور ہ سے مراد ہادی ہے۔(سلام علی طه)

۳۰/۱۰۔ طس :

سورۂ نمل کے شروع میں آئے ہیں۔ط سے مراد طاہر اور س سے مراد سید ہے۔ ہر دو حروف کی وضاحت گزر چکی ہے۔(سلام علی طس)

۳۰/۱۱۔ طسم :

سورۂ شعراء اور قصص کے شروع میں آئے ہیں۔ان چاروں حروف ط' س' میم اول اور میم ثانی کی وضاحت گزر چکی ہے۔ط سے مراد طاہر' س سے سید' میم اول سے مرسل اور میم ثانی سے محمد مراد ہے۔حمد در حمد کیا ہوا۔(سلام علی طسم)

۳۰/۱۲۔ حٰمٓ :

یہ دونوں ذیل کی چھ سورتوں کی ابتداء میں آئے ہیں۔مومن' حٰم سجدہ' زخرف' دخان' جاثیہ اور احقاف۔ح سے مراد حامل قرآن اور میم سے مراد محمد ہے' حمد در حمد کیا ہوا۔حامل قرآن کی قرآنی سند یہ ہے: فـانـه نـزلـه علی قبلک باذن الله ۷/۹۷۔اے رسول !بے شک جبریل نے قرآن کریم کو آپ کے قلب اطہر پر اتازل کیا ہے۔چونکہ حضور نزول قرآن کے متحمل ہیں۔لہذا

آپ حامل قرآن ہیں۔میم کی وضاحت گزر چکی ہے۔اس سے مراد مرسل بھی ہے اور محمد سلامٌ علیہ بھی (سلام علی حم)

۲۰/۱۳ حم عسق :

یہ پانچ حروف سورۂ شوریٰ کی ابتداء میں آئے ہیں۔ ح سے حامل قرآن مراد ہے۔م سے محمد سلامٌ علیہ۔حمد در حمد کیا ہوا۔ ع سے عبداللہ۔س سے سید اور ق سے قائم (قیام صلوٰۃ کرنے والا) ان حروف میں سے ح' م' س اور ق کی وضاحت گزر چکی ہے۔ ع سے عبداللہ کی قرآنی سند ملاحظہ فرمائیں۔سورۂ جن میں ارشاد ہوا ہے: و انه لما قام عبد الله يدعوه ۷۲/۱۹ ۔اور یہ کہ بے شک جب عبداللہ (اللہ کا بندہ محمد قیام صلوٰۃ میں اللہ کے حضور) کھڑا ہوتا ہے تو اس کے حضور میں دعائیں کرتا ہے۔لہذا عبداللہ بھی آنحضور کا ایک لقب گرامی ہے جس کا قطع کردہ حرف ع' عسق میں آیا ہے۔(سلام علی حم عسق)

۳۰/۱۴۔ کھیعص :

یہ پانچ حروف مقطعات سورۂ مریم کے شروع میں آئے ہیں جن میں یا سے مراد ہے یـامن بمعنی برکت دینے والا۔اور باقی بالترتیب کریم' ہادی عبداللہ اور صاحب قرآن کے پہلے قطع کردہ حروف ہیں۔ان میں سے ہ' ع اور ص کی وضاحت گزر چکی ہے ك کی قرآنی سند درج ذیل ہے۔ارشاد باری ہے: انه لقول رسول كريم ۶۹/۵۰ ۔ بلاشبہ قرآن کریم اہل عالم کے سامنے قول کی صورت میں ایک رسول کریم سلامٌ علیہ کی زبان مبارک سے پیش ہوا ہے۔اس آیت میں آنحضور سلامٌ علیہ الٰہی کریم کے گرامی لقب سے ملقب کئے گئے ہیں۔لہذا ان حروف مقطعات میں ك کریم کا قطع کردہ حرف اور اسی کا قائم مقام ہے۔(سلام علی کھیعص)

گزارش:

قرآن کریم کے حروف مقطعات جو آنحضور کے وہ القاب گرامی ہیں جن کے ساتھ خداوند عالم آنحضور کو مخاطب فرمایا کرتے تھے ان کا قرآنی مفہوم ۱۴ نمبروں میں ختم ہوا۔ان میں بعض حروف ایسے ہیں۔جو ایک سے زیادہ مفاہیم کے حامل ہیں۔مثلاً قرآن کریم کی روشنی میں ن سے

نذیر بھی ثابت ہے اور نبی بھی۔ ع سے عبداللہ بھی ثابت ہے اور عابد بھی۔ ص سے صادق بھی ثابت ہے اور صاحب قرآن اور صاحب الناس بھی۔ ح سے حامد بھی ثابت ہے اور حامل قرآن بھی۔ اس طرح حروف مقطعات کی وضاحت میں جن الفاظ کو قرآنی اسناد کی تائید حاصل ہو ان کے تسلیم کرنے میں کسی راستباز کو انکار نہیں ہوسکتا۔ لیکن یہ نظریہ ہرگز ہرگز قابل قبول نہیں ہوسکتا کہ حروف مقطعات کا مفہوم کوئی نہیں جانتا۔ حتی کہ خود رسول مقبول بھی نہیں جانتے تھے۔ جن کے یہ اپنے القاب گرامی ہیں۔ اور یا صرف اللہ اور رسول جانتے ہیں انہوں نے کسی کو نہیں بتایا

۳۱۔ حروف کی بحث

قرآن فہمی کے لیے جہاں یہ لازم ہے کہ ہر لفظ کے صحیح مقامی معنی لیے جائیں۔ وہاں یہ بھی ضروری ہے کہ عربی ادب کی رو سے جن ذو معنی حروف کے کئی کئی معنی مسلم ہیں۔ ان میں سے وہ معنی لیے جائیں جو نہ سیاق و سباق کے خلاف جاتے ہوں اور نہ قرآنی کلیہ جات و عالمی مشاہدات کی مخالفت لازم آتی ہو۔ ذیل میں چند حروف مثلاً واؤ' اؤیا' فاء'فی' من' عن' الی' کلا' بل اور دون وغیرہ کے متعدد معنی قرآن کریم کی روشنی میں پیش کیے جاتے ہیں۔ ان میں سے بعض معنی سابقہ مفسرین و مترجمین نے لیے ہی نہیں۔ حالانکہ قرآنی لغت نے ان معنوں کو وضاحتاً اجاگر کر رکھا ہے۔

۳۱/۱ واؤ کے استعمالات

واؤ عاطفہ۔ الفاظ کا عطف الفاظ پر اور جملے کا عطف جملے پر ہوتا ہے۔

ا۔ واؤ بمعنی اور:

ایسی واؤ عاطفہ کہلاتی ہے۔ الفاظ کا عطف الفاظ پر اور جملوں کا عطف جملوں پر ہوتا ہے۔ مثلاً آیت مجیدہ:

خلق السموت و الارض بالحق ۳/۱۶ میں لفظ ارض کا عطف لفظ سماوات پر ہے۔

اور آیت مجید:

فانما علیک البلغ و علینا الحساب ٥ ١٣/٤٠ میں جملہ علینا الحساب کا عطف جملہ فانما علیک البلغ پر ہے۔

خبر کا عطف خبر پر' امر کا عطف امر پر اور مثال کا عطف مثال پر ہوتا ہے۔

لقد ارسلنا نوحا الی قومہ ٥٩/٧ بے شک ہم نے نوح علیہ السلام کو اس کی قوم کی طرف بھیجا۔

والی عاد اخاھم ھودا ٦٥/٧ اور بے شک ہم نے قوم عاد کی طرف ان کے بھائی ہود علیہ السلام کو بھیجا۔ والی ثمود اخاھم صلحا ٧٣/٧۔ اور بے شک ہم نے قوم ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح علیہ السلام کو بھیجا۔ والی مدین اخاھم شعیبا ٨٥/٧۔ اور بے شک ہم نے اہل مدین کی طرف ان کے بھائی شعیب علیہ السلام کو بھیجا۔ دیکھئے! ان آیات کریمات میں' چھ' چودہ اور چھبیس آیتوں کے وقفہ کے بعد بھی خبر کا عطف خبر ہی پر آیا ہے۔ اور اولین معطوف علیہ ٥٩/٧ میں مذکور لقد ارسلنا کی خبر کے الفاظ' اگرچہ ٦٥/٧ ٧٣/٧ اور ٨٥/٧ میں دہرائے نہیں گئے۔ بلکہ صرف الی مدین آیا ہے۔ لیکن بوجہ معطوف ارسلنا کی خبر ان تینوں میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ اب امر کا عطف امر پر کی مثال ملاحظہ فرمائیں۔ سورۂ بنی اسرائیل میں ابلیس کو مخاطب کر کے ارشاد ہوا ہے:

قال اذھب فمن تبعک منھم فان جھنم جزاؤکم جزاء موفورا ٥ و استفزز من استطعت منھم بصوتک و اجلب علیھم بخیلک و رجلک و شارکھم فی الاموال و الاولاد وعدھم وما یعدھم الشیطن الاغرورا ٥ ٦٣. ٦٤/١٧ – دیکھئے! ان دو آیتوں میں یکے بعد دیگرے سات واؤ آئی ہیں۔ پہلی' دوسری' چوتھی اور چھٹی واؤ کے بعد دیگر اذھب امر پر عطف ہیں۔ تیسری اور پانچویں میں الفاظ کا عطف الفاظ پر ہے۔ اور ساتویں اظہار حقیقت کے لیے آئی ہے آیات کریمات کے مفہوم پر غور فرمائیں۔

اللہ نے کہا جا' جو کوئی تیری اتباع کرے گا۔ تو تابع اور متبوع' تم سب کا پورا پورا بدلہ جہنم ہو گا۔ اور تو اپنی آواز کے ساتھ جسے بہکا سکتا ہے بہکا لے۔ اور ان پر اپنے سوار اور پیادے چڑھا لے۔ اور ان کے مالوں اور اولاد میں شریک ہو جا۔ اور انہیں جھوٹے وعدے دیتا رہ۔ حقیقت یہ

ہے کہ شیطان انہیں جو بھی وعدہ دیتا ہے وہ فریب محض ہے۔ (مثال کا عطف مثال پر اس کی متعلقہ آیات مجیدہ او عاطفہ کے تحت آگے آرہی ہیں)

۲۔ واوَ بمعنی لیکن۔ ۳۔ واوَ بمعنی کیونکہ۔ ۴۔ واوَ برائے اظہار حقیقت کے لیے۔

آیت ذیل پر غور فرمائیں۔ اس میں تین واوَ آئی ہیں۔ پہلی کا معنی ہے لیکن دوسری کا معنی ہے "کیونکہ" اور تیسری اظہار حقیقت کے لیے آئی ہے۔

یستخفون من الناس ولا یستخفون من اللہ وھو معھم اذیبیتون مالا یرضی من القول و کان اللہ بما یعملون محیطا ۱۰۸/۴ ۔وہ (چھپ چھپ کر تجویزیں کرنے والے منافق) لوگوں سے چھپ سکتے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ سے نہیں چھپ سکتے۔ کیونکہ جب وہ رات کو چھپ کر ایسی تجویزیں کرتے ہیں جنہیں وہ پسند نہیں کرتا۔ اس وقت بھی وہ ان کے ساتھ ہوتا ہے حقیقت یہ ہے کہ وہ جو بھی عمل کرتے ہیں اللہ تعالیٰ انہیں گھیرے ہوئے ہیں۔

۵۔ واوَ بمعنی بلکہ:

آیت ذیل میں تین واوَ آئی ہیں۔ پہلی کا معنی ہے بلکہ دوسری میں جملے کا عطف جملے پر ہے اور تیسری اظہار حقیقت کے لیے آئی ہے: فلا تخشوا الناس و اخشون ولا تشتروا بایتی ثمنا قلیلا و من لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکفرون۔ ۵/۴۴۔ پس لوگوں سے نہ ڈرو بلکہ مجھ سے ڈرو۔ اور میری آیتوں کے بدلے دنیا کا حقیر مال حاصل نہ کرنا۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ ما انزل اللہ کے ساتھ حکم نہیں کرتے۔ وہی تو کافر ہیں۔

۶۔ واوَ بمعنی جبکہ:

انی یکون لہ ولد ولم تکن لہ صاحبۃ ۶/۱۰۱ ۔اللہ کا بیٹا کس طرح ہو سکتا ہے جبکہ اس کی بیوی ہی کوئی نہیں۔ یہاں واوَ حالیہ تسلیم کرنا بھی درست ہے۔ حالانکہ اس کی بیوی ہی کوئی نہیں۔

۷۔ واؤ تفسیر بمعنی یعنی:

تلک ایت الکتب و قران مبین ○ ۱۵/۱ ۔ مذکورہ بالا آیتیں الکتاب یعنی بیان کرنے والے قران کی ہیں۔

۸۔ واؤ بمعنی اس لیے:

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قوم بنی اسرائیل کو ارض مقدس کے ایک شہر میں داخل ہونے کا حکم دیا۔ تو انہوں نے جواب دیا:

قالوا یموسی ان فیھا قوما جبارین و انا لن ندخلھا حتی یخرجوا منھا ۵/۲۲

بنی اسرائیل نے کہا کہ اے موسیٰ اس شہر میں ایک طاقتور قوم ہے۔ اس لیے ہم اس وقت تک اس شہر میں داخل نہیں ہوں گے جب تک کہ وہ اس میں سے نکل نہ جائیں۔

۹۔ واؤ بمعنی حالانکہ:

آیت ذیل میں اہل کتاب کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے:

اتا مرون الناس بالبر و تنسون انفسکم و انتم تتلون الکتب ۲/۴۴۔ کیا تم لوگوں کو بھلائی کا حکم کرتے ہو۔ اور اسکے ضمن میں اپنے آپ کو بھلا دیتے ہو۔ حالانکہ تم توراۃ و انجیل کی تلاوت کرتے ہو (جن میں ایسا کرنے سے منع کر دیا گیا ہے)

۱۰۔ واؤ بمعنی تو، پھر: پس (یعنی واؤ بمعنی فا)

وجعل لکم من الفلک و الانعام ماتر کبون ○ لتستوا علی ظھورہ ثم تذکروا نعمۃ ربکم اذا استویتم علیہ و تقولوا سبحن الذی سخر لنا ھذا .....

۱۲۔۱۳/۴۳۔ اور اللہ نے تمہارے لیے جہاز اور چار پائے بنائے جن پر تم سوار ہوتے ہو تاکہ (ان میں سے ہر) ایک کی پیٹھ پر سیدھے (متوازن) سوار ہوا کرو۔ پھر تم اپنے رب کی نعمت کو یاد کرو، جب تم اس پر باطمینان سوار ہو جاؤ۔ تو کہا کرو پاک ہے وہ ذات، جس نے انہیں ہمارے لیے مسخر کر دیا ہے۔۔۔۔۔ الخ۔ یہاں واؤ بمعنی تو آیا ہے۔ اگلی آیتوں میں دیکھئے! واؤ بمعنی یعنی اور

برائے اظہار صفت ہے۔

واذکر و انعمت الله علیکم وما انزل علیکم من الکتب و الحکمة یعظکم به و اتقو الله اوراللہ کی نعمت کو یادرکھو جوتم پر کی گئی یعنی جو اس نے تم پر اپنی حکمت والی کتاب نازل کی ہے۔ وہ تمہیں اس ایک ہی کتاب کے ساتھ نصیحت کرتا ہے۔ پس اللہ کے قانون کی مخالفت سے بچے رہو۔۲/۲۳۱

۱۱۔ واؤ برائے اظہار صفت۔

آیت بالا میں الکتب والحکمۃ کی واؤ سے یہ مراد نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کتاب اور حکمت الگ الگ دو چیزیں نازل فرمائیں ہیں۔ کیونکہ **یعظکم به** میں ہ ضمیر واحد آئی ہے جس سے ثابت ہے کہ یہ ایک چیز ہے دو نہیں اور الکتب والحکمۃ کی درمیانی واؤ کا معنی **یس ٥ و القران الحکیم** کے الفاظ میں بتا دیا گیا ہے۔ شہادت ہے حکمت والے قرآن کی۔ پس اس قرآنی شہادت اور **یعظکم به** کی ضمیر واحد کی رو سے الکتب والحکمۃ کا معنی ہے حکمت والی کتاب۔

۱۲۔ واؤ بمعنی بذریعہ۔

و اذان من الله و رسوله الی الناس یوم الحج الاکبر ان الله بری من المشرکین ۳/۹۔ اور حج اکبر کے دن لوگوں کے لیے اللہ کا اعلان ہے اس کے رسول کے ذریعہ کے بے شک اللہ تعالیٰ مشرکوں سے بےزار ہے۔ دیکھئے یہاں واؤ بمعنی ذریعہ آیا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حج اکبر کو اپنا مذکورہ بالا اعلان کہ وہ مشرکوں سے بیزار ہے اپنے رسول سلام علیہ ہی کے ذریعہ کروایا تھا۔ نیز **ماوعدنا الله و رسوله** ۳۳/۱۲ میں بھی واؤ بمعنی "کے ذریعہ" آئی ہے۔ کیونکہ اللہ اپنے رسول کے ذریعہ ہی وعدہ فرماتا ہے۔ خود آکر نہ کوئی وعدہ دیتا ہے نہ لیتا ہے۔

۱۳۔ واؤ بمعنی او (یا)۔

آیت ذیل میں واؤ بمعنی یا ہے۔ قوم بنی اسرائیل کے متعلق ارشاد ہوا ہے:

ضربت علیهم الذلة این ماثقفوا الابحبل من الله وحبل من الناس ۳/۱۱۲۔

بنی اسرائیل پر وہ جہاں کہیں بھی پائے جائیں' ذلت لازم کردی گئی ہے۔ سوائے اس کے کہ وہ اللہ کے قانون کو تھام لیں یا لوگوں کے بنائے ہوئے قوانین میں سے کسی قانون کا سہارا لے لیں۔

۱۴۔ واؤ استیناف۔

اس واؤ کے ساتھ سابقہ مضمون سے الگ نیا مضمون شروع ہوتا ہے یعنی اس کا نہ ماقبل کے کسی لفظ پر عطف ہوتا ہے نہ کسی جملے پر۔ صرف ماقبل عنوان کے کسی گوشے کے متعلق کچھ واضح کرنا مطلوب ہوتا ہے۔ **وکذلک انزلنہ حکما عربیا ولئن اتبعت اھواء ھم بعد ماجاء ک من العلم مالک من اللہ من ولی ولا واق ٥** ۱۳/۳۷۔ اور اسی طرح ہم نے آپ پر اپنا حکم نامہ شستہ عربی زبان میں نازل کیا ہے۔ اور اگر آپ نے ہمارا علم آ جانے کے بعد لوگوں کی خواہشات کی پیروی کی تو آپ کا اللہ کے سوا نہ کوئی مددگار ہوگا اور نہ کوئی اس کے عذاب سے بچانے والا ہوگا۔ دیکھئے! یہاں **ولئن اتبعت.... الخ** کی واؤ کا عطف' نہ ماقبل کسی لفظ پر ہے نہ جملے پر۔ صرف **ماانزل اللہ** کے متعلق اس امر کی وضاحت کی گئی ہے کہ اگر اسے چھوڑ کر رسول مقبول سلامٌ علیہ بھی کسی کی اتباع کریں گے تو انہیں بھی چھڑانے والا کوئی نہیں ہوگا۔

۱۵۔ واؤ برائے معیت بمعنی نیز۔

لقد کفر الذین قالوا ان اللہ ھو المسیح ابن مریم قل فمن یملک من اللہ شیا ان اراد ان یھلک المسیح ابن مریم و امہ و من فی الارض جمیعا ۵/۱۷۔ بے شک وہ لوگ کفر کرتے ہیں جو کہتے ہیں کہ مسیحؑ ابن مریم ہی اللہ ہے۔ اے رسول! کہہ دیجئے گا۔ کہ اگر اللہ تعالیٰ یہ ارادہ کرتا کہ مسیح ابن مریم اور اسکی ماں' نیز (ان کے ساتھ) زمین میں جو بھی جاندار ہیں' سب کو ہلاک کر دیتا' تو کون ہوتا جو اس کی منشاء کے خلاف کچھ بھی اختیار رکھتا۔ دیکھئے! **ومن فی الارض جمیعا** والی واؤ معیت کی ہے۔ چونکہ نصاریٰ مسیح کو عین اللہ اور حضرت مریم و مسیح دونوں کو شریک الوہیت ٹھہراتے ہیں لیکن مریم کو مردہ اور مسیحؑ کو زندہ مانتے ہیں۔ اس لیے یہاں بتایا گیا ہے کہ صرف مریم ہی نہیں بلکہ دونوں ماں بیٹا فوت ہو چکے ہیں۔ اگر خدا تعالیٰ کی

مشیت میں ہوتا تو وہ ان کے ساتھ زمین کے ہر جاندار کو ہلاک کر دیتا۔ اسے کون روکنے والا تھا لیکن یہ اس کی مشیت میں نہیں۔

١٦۔ واؤ برائے قسم (شہادت)۔

کسی مقدمہ میں جب گواہوں سے گواہی لی جاتی ہے تو وہ اللہ کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ یہ واقعہ یوں ہوا تھا۔ فی الحقیقت گواہ یہ کہتا ہے کہ میں اپنے بیان پر اللہ حاضر و شاہد کی شہادت پیش کرتا ہوں۔ عربی ادب میں اس کے لیے واللہ کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے لیکن یاد رہے کہ جب اللہ تعالیٰ خود کوئی شہادت پیش کرتا ہے تو اپنے پیدا کردہ ان شاہکاروں کو جن میں ابتدائے آفرینش سے آج تک کوئی تغیر نہیں آیا' گواہی کے لیے پیش کرتا ہے۔ ورنہ قسمیں کھانا اللہ تعالیٰ کی شان کے خلاف ہے مثلاً:

والشمس. والقمر. والليل. والنهار وغیرہ کا معنی ہے۔ شہادت ہے سورج کی۔ شہادت ہے چاند کی۔ شہادت ہے رات کی۔ شہادت ہے دن کی' کہ جس طرح یہ حقائق ثابتہ ہیں۔ اسی طرح یہاں جو کچھ بیان کیا جا رہا ہے وہ بھی ایک لاریب حقیقت ہے۔

المختصر! قرآنی لغت کے مطابق واؤ کے متعدد معنی قرآن کریم میں موجود ہیں (١) اور (٢) لیکن (٣) کیونکہ (٤) حقیقت یہ ہے (٥) بلکہ' (٦) جبکہ (٧) یعنی (٨) اس لئے (٩) حالانکہ تو (١٠) پھر' برائے (١١) اظہار صفت' (١٢) بذریعہ (١٣) یا' (١٤) استیناف (١٥) معیت اور (١٦) شہادت۔

اب یہ فیصلہ قارئین کرام پر رہا کہ ان میں سے دوسرے تیسرے' چوتھے' پانچویں اور چھٹے نمبر والے پانچ معنی جن کی قرآن کریم نے بانداز صریح وضاحت کر رکھی ہے۔ کیا سابقہ تراجم میں کہیں یہ معنی آپ کو ملتے ہیں؟

۳۱۲/ او کے مختلف استعمالات۔ مثال کا عطف مثال ہی پر ہوتا ہے

ا۔ او بمعنی یا :

وضو کے لیے پانی موجود نہ ہو یا مضر پڑتا ہو تو تیمم کے حکم میں، کیے بعد دیگر تین مرتبہ او آیا ہے۔ اور تینوں کا معنی ہے یا:

و ان کنتم مرضی او علی سفر او جاء احد منکم من الغائط او لمستم النساء فلم یجدوا ماء فتیمموا صعیدا طیبا..... ۵/۶۔ اور اگر تم بیمار ہو اور پانی کا استعمال مضر پڑتا ہو، یا تم مسافر ہو، یا تم میں سے کوئی قضاء حاجت سے آیا ہو، یا تم نے بیویوں کو ازدواجی انداز سے چھوا ہو اور پانی نہ پاؤ تو آلائش صاف کرنے کے لیے پاکیزہ مٹی کا استعمال کر لیا کرو۔

واؤ عاطفہ کی بحث میں قرآنی مثالوں کے ساتھ ثابت کیا جا چکا ہے کہ الفاظ کا عطف الفاظ پر جملوں کا جملوں پر خبر کا خبر پر، اور امر کا امر ہی پر پڑتا ہے۔ اب ''او'' عاطفہ کی بحث میں ملاحظہ فرمائیں کہ مثال کا عطف مثال ہی پر ہوتا ہے۔

سورۂ بقرہ یعنی ابتدائے قرآن مجید میں آنحضرت پر واضح کیا گیا ہے کہ سلسلہ تبلیغ میں آپ کو تین قسم کے افراد سے واسطہ پڑے گا۔ پہلے مومن، جو آپ پر اور قرآن پر ایمان لے آئیں گے۔ وہ آپ پر جان مال سب کچھ قربان کر دیں گے۔ دوسرے کافر، یعنی مطلقاً انکار کرنے والے۔ ان کے ساتھ مغز مارنے کی ضرورت نہیں۔ اور تیسرے منافق، جو کفر چھپا کر ایمان کا اظہار کریں گے۔۔۔ اسی سورۂ بقرہ میں ان تینوں گروہوں کی دو دو مثالیں لف نشر غیر مرتب کے انداز میں اس طرح بیان ہوئی ہیں کہ ۱۷ و ۲/۱۹ میں دو مثالیں منافقوں کی۔ ۱۷۱۔ و ۲/۲۵۹ میں دو مثالیں کافروں کی۔ اور ۲۶۱ و ۲/۲۶۵ میں دو مثالیں مومنوں کی بیان ہوئی ہیں۔ منافقوں کی دو مثالیں یہ ہیں:

مثلھم کمثل الذی استو قد نارا فلما اضاء ت ما حولہ ...... الخ ۲/۱۷۔ ان (منافقوں) کا حال اس شخص جیسا ہے جو (رات کو) آگ جلائے۔ جب وہ جل اٹھے تو اس کا

اردگرد روشن ہو جائے اور جب بجھ جائے تو پھر اندھیروں میں رہ جائے۔

دیکھئے! یہاں کمثل میں کاف حرف تشبیہ موجود ہے جو کسی وقوعہ کے لیے نہیں آتا بلکہ مثال کے لیے آتا ہے چنانچہ اس مثال پر مثال کا عطف پھر کاف تشبیہ کے ساتھ اس سے اگلی آیت ۲/۱۹ میں آیا ہے:

او کصیب من السماء فیه ظلمت و رعد و برق ۲/۱۹۔ یا ان کا حال اس شخص کے حال جیسا ہے کہ (رات کے وقت) آسمان سے بارش ہو رہی ہو اس میں رات، بارش اور بادلوں کے اندھیرے بھی ہوں، گرج بھی ہو اور بجلی کی چمک بھی ہو۔ تو جب بجلی چمکے تو انکا اردگرد روشن ہو جائے۔ اور جب بند ہو جائے تو وہ پھر اندھیروں میں پڑے رہیں۔ یعنی منافقوں کا حال یہ ہے کہ قرآن کریم سنا تو خیالات روشن ہو گئے۔ لیکن جب لوٹ کر کافروں میں گئے۔ تو پھر کفر کا اندھیرا چھا گیا۔ (ان آیات کی تفصیل اپنے مقام پر آگے آ رہی ہے)

اس سے آگے کافروں کی دو مثالوں میں سے پہلی مثال ۲/۱۷۱ میں مذکور ہے:

و مثل الذین کفروا کمثل الذی ینعق بمالا یسمع .... الخ، اور دوسری ۲/۲۵۹
او کالذی مر علی قریة .... الخ میں آئی ہے۔

واضح رہے کہ جس طرح ۲/۱۷ اور ۲/۱۹ باہم معطوف، معطوف علیہ ہیں۔ کیونکہ دونوں میں کاف تشبیہ موجود ہے اور مثال کا عطف مثال پر ہے۔ اسی طرح ۲/۱۷۱ اور ۲/۲۵۹ بھی باہم معطوف، معطوف علیہ ہیں دونوں میں کاف تشبیہ موجود ہے۔ اور مثال کا عطف مثال پر ہے۔ سابقہ تراجم اور تفاسیر نے مثال پر مثال کے عطف کے قرآنی اصول کو نظرانداز کر کے آیت مجیدہ او کالذی مر علی قریة ۲/۲۵۹ کے ساتھ حضرت عزیر علیہ السلام کی طرف منسوب کر کے ایک عجیب وغریب چیستانی واقعہ چسپاں کر رکھا ہے کہ آپ ایک اجڑی ہوئی بستی سے گزرے تو کہا کہ اسے اللہ کس طرح زندہ کرے گا۔ اللہ نے آپ کو سو سال کے لیے مار ڈالا پھر زندہ کیا وغیرہ۔ حالانکہ "مر" فعل ماضی پر "الذی" اسم موصول داخل ہوا ہے۔ جس نے "مر" ماضی کو مضارع بنا دیا ہے۔ اور مفہوم الفاظ یہ ہے کہ یا اس شخص کی مانند کہ جو کسی برباد بستی پر سے گزرے۔ اور کہے کہ اللہ اسے کس طرح دوبارہ زندہ کرے گا۔ اس پر خدا تعالیٰ اسے مار ڈالے۔ وہ سو برس مرا پڑا رہے۔

اتنے میں بستی آباد ہو جائے۔ اللہ اسے زندہ کرے۔ اس کا کھانا اور پانی خراب نہ ہوا ہو۔ مگر اس کے گدھے کی ہڈیاں بکھر گئی ہوں۔ اللہ اس کے دیکھتے دیکھتے ان ہڈیوں پر گوشت چڑھا کر گدھے کو زندہ کر دے۔ پھر وہ کہے میں نے جان لیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے یاد رہے کہ اس طرح کسی کو قیامت منوانا' خدا تعالیٰ کے قانون مشیت ہی سے خارج ہے۔ سابقہ تراجم نے اس مثال کو واقعہ بنا کر حضرت عزیر علیہ السلام کے ذمہ لگا رکھا ہے۔ حالانکہ انبیاء علیہ السلام تو لوگوں کو قیامت منوانے آتے تھے۔ ان کا اپنا ایمان اس قسم کا نہیں ہو سکتا۔ کہ جب تک اللہ تعالیٰ مردہ گدھے کو ان کے دیکھتے دیکھتے زندہ کر کے نہ دکھائے' اس وقت تک وہ نہ خدا تعالیٰ کو قادر ہی مانیں اور نہ قیامت پر ایمان لائیں۔ العیاذ باللہ!

المختصر! آیت مجیدہ ۲/۲۵۹' حرف عطف او سے شروع ہوتی ہے اور اس میں کـالـذی کا کاف تشبیہ موجود ہے اب او عاطفہ اپنے معطوف علیہ کو چاہتا ہے اور اس کا معطوف علیہ وہی ہو سکتا ہے جس میں کاف تشبیہ موجود ہو اور وہ ہے ۲/۱۷۱ میں۔ وہاں صاف صاف لفظاً مذکور ہے کہ کافروں کی مثال ایسی ہے: مثـل الـذین کفـروا اور یہاں آیت ماقبل ۲/۲۵۸ میں ایسے کافر بادشاہ کا ذکر ہے جسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے صفات خداوندی کی بحث میں لاجواب کر دیا لیکن وہ ایمان نہ لایا۔۔۔ لہذا ۲/۲۵۹ میں بتایا گیا ہے کہ ایک تو ذریعہ ہدایت یہ ہے کہ حقیقت حال کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح اس طرح علیٰ وجہ البصیرت سمجھا دیا جائے کہ مخاطب لاجواب ہو جائے۔ اس سے آگے مثال کے طور پر بیان ہوا ہے کہ جو کافر دلائل قاطعہ کے ساتھ نہ مانے' تو یا پھر ایسا ہو کہ اسے اللہ تعالیٰ اجڑی ہوئی بستی آباد کر کے دکھائے' مردہ ہڈیوں پر گوشت چڑھانے کا مشاہدہ کرائے تو پھر وہ مانے لیکن ایسا نہ کبھی ہوا ہے نہ ہو گا۔ کافروں کے متعلق سورۂ مجیدہ کی ابتداء ہی میں کہہ دیا گیا ہے:

ان الذین کفروا سواء علیهم ء انذرتهم ام لم تنذرهم لا یؤمنونo ۲/۶

اے رسول کافروں کو آپ کا سمجھانا اور نہ سمجھانا برابر ہے۔ وہ ایمان نہیں لائیں گے۔

اس سے آگے مومنوں کی دو مثالوں میں سے پہلی مثال بقرا ۲/۲۶۱ میں آئی ہے:

مثـل الـذیـن یـنـفقون اموالهم فی سبیل الله کمثل حبة ..... الخ ۔ مومنوں کا

حال جواللہ کی راہ میں مال خرچ کرتے ہیں ایک دانے کے حال جیسا ہے کہ ہر دانے سے سات بالیں پیدا ہوتی ہیں۔اور ہر بال میں سوسو دانہ پیدا ہوتا ہے۔۔۔غور فرمایئے گا کہ اس آیت میں **کمثل حبة** میں کاف تشبیہ وارد ہوا ہے۔اس کے بعد ۲/۲۶۵ میں واوَ عاطفہ اور کاف تشبیہ ہی کے ساتھ مومنوں کی دوسری مثال ان لفظوں میں بیان ہوئی ہے:

ومثل الذين ينفقون اموالهم ابتغاء مرضات الله و تثبيتا من انفسهم كمثل جنة بربوة .... الخ ۔اور مومن جواللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے اور اپنے معاشرہ کے کمزوروں کو قدموں پر کھڑا کرنے کے لیے اللہ کی راہ میں مال خرچ کرتے ہیں ان کا حال ایسا ہے جیسے کہ ایک زرخیز ٹیلے پر ایک باغ ہو۔اگر اسے بارش میسر آجائے تو کئی گنا پھل دے۔اور اگر بارش نہ بھی ہو اس کے لیے شبنم بھی کافی رہے۔۔۔اب غور فرمایئے گا کہ ہر دو آیات کریمات میں مثال کا عطف مثال ہی پر ہے۔

۲۔ او بمعنی بلکہ۔

۳۷/۱۴۷ میں حضرت یونس علیہ السلام کے متعلق ارشاد ہوا ہے: **وارسلنه الى مائة الف او يزيدون** ٥ اور ہم نے اسے ایک لاکھ افراد بلکہ اس سے بھی زیادہ لوگوں کی طرف رسول بنا کر بھیجا تھا۔دیکھئے! اگر اس آیت میں او بمعنی یا لیا جائے تو علم الٰہی پر زد پڑتی ہے کہ ہم نے اسے ایک لاکھ یا اس سے بھی زیادہ افراد کی طرف بھیجا تھا۔فلہذا ثابت ہوا کہ او بمعنی بلکہ بھی عربی ادب میں مسلم ہے۔

۳۔ او بمعنی حتیٰ کہ یہاں تک کہ۔

۴۸/۱۶ میں آیا ہے: **قل للمخلفين من الاعراب ستدعون الى قوم اولى باس شديد تقاتلونهم او يسلمون** ٥ اے رسول! دیہاتیوں میں سے پیچھے رہ جانے والوں سے (جو غنیمت کے طلب گار ہیں) کہہ دیجئے گا کہ تم عنقریب ایک سخت جنگجو قوم کے ساتھ لڑنے کے لیے بلائے جاؤ گے۔تم ان سے (ایسی سخت) جنگ کرو گے۔یہاں تک کہ وہ تمہاری اطاعت قبول کرلیں گے۔غور فرمایئے کہ یہاں بھی او بمعنی یا نہیں لگ سکتا۔کیونکہ یہ مفہوم بالکل بے معنی ہے کہ:

''یاتم ان سے لڑو گے یاوہ تمہاری اطاعت قبول کرلیں گے۔''

۴۔ او برائے انقسام مفہوم۔

۴/ ۷ میں آیا ہے کہ مجرموں پر: **فجاء ھا باسنا بیاتا اوھم قائلون ٥** ہمارا عذاب ان پر کبھی رات کے وقت آیا۔ اور کبھی دوپہر کے وقت' کہ جب وہ آرام کر رہے تھے۔

۵۔ او برائے نفی تام۔

۲۴/ ۷۶ میں آنحضور سلام علیہ کو مخاطب کر کے ارشاد ہوا ہے:

فاصبر لحکم ربک ولا تطع منھم اثما او کفورا ٥ اے رسول !اپنے ربوبیت کرنے والے کے حکم پر ثابت قدم رہیے گا۔ اور (مخالفین) بدکار و ناشکرے سے (جو کچھ بھی) ہیں۔ ان کی اطاعت ہرگز نہ کرنا۔

۶۔ او برائے شک واشتباہ۔

سورۂ مومنون میں آیا ہے کہ قیامت کے دن پوچھا جائے گا کہ تم زمین میں کتنا عرصہ رہے۔ اس کا جواب درج ہے: **قالوا لبثنا یوما او بعض یوم** ۲۳/۱۱۳ وہ کہیں گے کہ ہم ایک دن یا دن کا کچھ حصہ زمین میں رہے تھے۔

۷۔ او بمعنی واو تفسیر۔

۳/۱۶۷ میں آیا ہے کہ منافقوں سے کہا گیا: **وقیل لھم تعالوا قاتلوا فی سبیل اللہ او ادفعوا** ۔ اور انہیں کہا گیا کہ آؤ اللہ کی راہ میں جنگ کرو۔ یعنی ملک کا دفاع کرو۔ غور فرمایئے گا! کہ جنگ اور دفاع ایک ہی چیز ہے۔ اور یہاں او بمعنی واو تفسیر بمعنی یعنی آیا ہے۔ جیسے کہ آیت مجیدہ کے اگلے الفاظ' منافقوں کے جواب میں بھی قتال ہی کو دفاع ٹھہرایا گیا ہے۔

قالوا لو نعلم قتالا لا اتبعنکم۔ انہوں نے کہا کہ (ہم لڑنا نہیں جانتے) اگر لڑنا جانتے تو ضرور تمہاری پیروی کرتے۔

۴/۳۱ ''ب'' کے مختلف استعمالات۔

''ب'' کا معنی عموماً ساتھ لیا جاتا ہے لیکن قرآن کریم نے ذیل کے سولہ معنی بیان کئے ہیں:

۱۔ ''با'' برائے تعدیہ (لازم کو متعدی بنانے کے لیے):

ذھب اللہ بنورھم ۲/۱۷ اللہ ان کا نور لے گیا۔(لفظی ترجمہ)

۲۔ ''با'' اظہار سبب کے لیے: ☆ **فاخذھم اللہ بذنوبھم** ۳/۱۱ پس اللہ نے انہیں ان کے گناہوں کے سبب پکڑ لیا۔

۳۔ ''با'' بمعنی 'کے ساتھ': ☆ **ینوح اھبط بسلم** ۱۱/۴۸ اے نوح ؑ سلامتی کے ساتھ اتر جا۔

۴۔ ''با'' بمعنی 'کے پاس': ☆ **اذا مروا باللغو** ۲۵/۷۲ جب وہ لغو کے پاس سے گزرتے ہیں۔

۵۔ ''با'' بمعنی 'کے عوض': ☆ **وشروہ بثمن بخس** ۱۲/۲۰ اور انہوں نے اسے تھوڑی قیمت کے عوض بیچ دیا۔

۶۔ ''با'' بمعنی 'متعلق': ☆ **الرحمن فسئل بہ خبیرا** اس کے متعلق صاحب خبر رحمان سے پوچھ

۷۔ ''با'' بمعنی 'میں سے': ☆ **عینا یشرب بھا عباد اللہ** ۷۶/۶۔ ایک چشمہ ہے جس میں سے اللہ کے بندے پیئں گے۔

۸۔ ''با'' بمعنی 'کے وقت': ☆ **نجینھم بسحر** ۵۴/۳۴۔ ہم نے انہیں صبح کے وقت نجات دی۔

۹۔ ''با'' بمعنی 'کے مقام پر': ☆ **ولقد نصرکم اللہ ببدر** ۳/۱۲۳ اور بے شک اللہ نے بدر کے مقام پر تمہاری مدد فرمائی۔

۱۰۔ ''با'' بمعنی 'پر/اوپر': ☆ **لو تسوی بھم الارض** ۴/۴۲۔ کاش کہ ان کے اوپر زمین ہموار ہو جائے۔

۱۱۔ ''ب'' بمعنی 'کا': ☆ **وامسحوا برء وسکم** ۵/۶۔ اپنے سروں کا مسح کر لیا کرو۔

۱۲۔ ''با'' بمعنی 'کو' :☆ بل تکذبون بالدین ۸۲/۹۔ بلکہ تم دین کو جھٹلاتے ہو۔

۱۳۔ ''با'' بمعنی 'کے بارے میں': ☆ ماغرک بربک الکریم ۸۲/۶۔ تجھے تیرے نعمتیں دینے والے پروردگار کے بارے میں کس نے دھوکا دے دیا ہے۔

۱۴۔ ''با'' بمعنی کے ذریعہ: ☆ و بالنجم هم یهتدون ۱۶/۱۶۔ اور وہ ایک مخصوص (قطبی) ستارہ کے ذریعہ راستے معلوم کرتے ہیں۔

۱۵۔ ''با'' زائدہ: ☆ لست علیهم بمصیطر ۸۸/۲۲۔ اے رسول ! آپ لوگوں پر داروغے نہیں ہیں۔

۱۶۔ ''با'' برائے 'قسم' :☆ فبعزتک ۳۸/۸۲۔ تیری عزت کی قسم

۴/۳۱۔ ف کے مختلف استعمالات:

ف کا معنی عموماً لیا جاتا ہے 'پھر' لیکن قرآنی لغت سے ذیل کے متعدد معنی ثابت ہوتے ہیں۔

۱۔ فا بمعنی پھر۔ (برائے ترتیب وتعقیب) یعنی ایک کام کے بعد دوسرے کا بالترتیب انجام پذیر ہونا:

☆ ثم خلقنا النطفة علقة فخلقنا العلقة مضغة فخلقنا المضغة عظما فکسونا العظم لحما ۲۳/۱۴۔ پھر ہم نطفہ کو لوتھڑا بناتے ہیں۔ پھر لوتھڑے کو گوشت کا ٹکڑا، پھر گوشت کے ٹکڑے میں ہڈیاں پیدا کرتے ہیں پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھاتے ہیں۔ دیکھئے! یہاں ''فا'' کے ساتھ ہر کام کا یکے بعد دیگر بالترتیب واقع ہونا بتایا گیا ہے۔ لیکن یاد رہے کہ ''فا'' کے لیے لازم نہیں کہ ترتیب وتعقیب ہی کے لیے ہو۔ نیز ترتیب وتعقیب کی صورت میں ہر کام کے بعد دوسرے کام کا درمیانی وقفہ ہر مقام پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے وہی ہوگا جو اللہ تعالیٰ نے اپنے کائناتی قوانین میں خود مقرر کر کے رکھا ہے۔ قوانین کائنات کی مخالفت کبھی نہیں ہوگی۔

۲۔ ''فا'' برائے توضیح بمعنی 'سو'۔

وکم من قریة اهلکنها فجاء ها باسنا بیاتا اوهم قائلون ٥ ۷/۴ ۔ اور کتنی ہی

بستیاں تھیں جنہیں ہم نے ہلاک کر دیا۔ سو ہمارا عذاب ان پر رات کے وقت آیا یا جب وہ دوپہر کو آرام کر رہے تھے۔ دیکھئے! یہاں فا کے ساتھ بستیوں کی ہلاکت کے وقت کی وضاحت کی گئی ہے کہ ہمارا عذاب کسی پر رات کو آیا۔ اور کسی پر دوپہر کو آیا۔

۳۔ ''فا'' بمعنی 'تو' : (اگر 'ان' شرطیہ کے بعد آئے)

قل ان کنتم تحبون الله فاتبعونی ۳/۳۱۔ کہہ دیجئے گا! اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو۔

۴۔ ''فا'' بمعنی 'ورنہ'

هذه ناقة الله لكم اية فذروها تاكل فى ارض الله ولا تمسوها بسوء فياخذكم عذاب اليم ○ ۷/۷۳۔ (حضرت صالح علیہ السلام نے قوم سے کہا) یہ اللہ کی اونٹنی تمہارے لئے (ربوبیت عامہ کی رو سے اللہ کی) ایک نشانی ہے۔ پس اسے چھوڑ دو کہ یہ اللہ کی زمین میں سے کھائے۔ اور اسے ضرر نہ پہنچانا ورنہ تمہیں دردناک عذاب پکڑ لے گا۔

۵۔ ''فا'' بمعنی 'اس طرح'

فوكزه موسى فقضى عليه ۲۸/۱۵۔ پس اس (حضرت موسیٰ علیہ السلام) نے اسے مکا مارا۔ اس طرح اس کا کام تمام کر دیا۔

۶۔ ''فا'' بمعنی 'لیکن'

و اتل عليهم نبا الذى اتينه آتينا فانسلخ منها ۷/۱۷۵۔ اور اے رسول! آپ ان پر اس شخص کی خبر پڑھیئے۔ جسے ہم نے (اپنی کتاب کے ذریعہ) اپنی آیتیں عطا فرمائیں لیکن وہ ان کی حدود سے نکل گیا۔

۷۔ ''فا'' برائے 'اظہار حقیقت'

غیر اللہ کو مددگار ٹھہرانے والوں کے متعلق ارشاد ہوا ہے: ایبتغون عندهم العزة فان العزة لله جميعا ○ ۴/۱۳۹۔ کیا وہ غیر اللہ سے غلبہ طلب کرتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے

کہ غلبہ سارے کا سارا صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے۔

۸۔ ''فا'' زائدہ۔

بل اللہ فاعبد ۳۹/۶۶۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کر۔ یہاں فا زائدہ ہے۔ کیونکہ فا کے بغیر بھی یہی معنی بنتے ہیں۔

۳۱/۵۔س: ا۔''س'' برائے ''مستقبل قریب''

''س'' حرف تہجی ہے۔ جس کا عموی فائدہ یہ ہے کہ جب یہ مضارع پر داخل ہو تو اسے زمانہ مستقبل کے لیے مختص کر دیتا ہے۔ مثلاً:

☆ **قل من یرزقکم .... فیسقولون اللہ** ۱۰/۳۱۔ اے رسول! آپ ان سے پوچھئے گا کہ تمہیں رزق کون دیتا ہے؟۔۔۔۔ اس کے جواب میں وہ کہیں گے اللہ تعالیٰ ۔۔۔ دیکھئے گا! اس مثال میں **یقولون** فعل مضارع پر س داخل ہوا ہے۔ جس سے فعل مضارع نے مستقبل کا فائدہ دیا ہے لیکن یاد رہے کہ یہ قاعدہ کلیہ نہیں ہے کہ ''س'' داخل ہونے سے فعل مضارع ضروری مستقبل کے لیے مختص ہو جاتا ہو۔ کیونکہ قرآن کریم میں ایسی متعدد مثالیں موجود ہیں کہ س داخل ہونے سے مستقبل کا معنی لینا غلط ہے۔ مثلاً

۲۔ ''س'' برائے 'تاکید'۔

فسکفیکھم اللہ ۲/۱۳۷۔ کا یہ مفہوم ہرگز صحیح نہیں ہے کہ ''تیرے لیے تیرے مخالفوں کے مقابلے پر اللہ تعالیٰ زمانہ حال میں کافی نہیں مستقبل میں کافی ہوگا'' بلکہ صحیح مفہوم یہ ہے کہ ''تیرے لیے مخالفوں کے مقابلے پر اللہ تعالیٰ ضرور ضرور کافی ہے''۔ دیکھئے! یہاں زمانہ حال کا معنی لینا ہی درست ہے۔ نیز یاد رہے کہ حال میں استقبال از خود آ جاتا ہے۔ کیونکہ آج کا مستقبل کل کو حال بن کر آتا ہے۔ اور **فسیکفیکھم اللہ** کے مطابق کفایت خداوندی کے دوام کی دلیل بن کر آتا ہے۔ اس کے برعکس استقبال میں حال داخل نہیں ہو سکتا۔ اس لیے اگر آیت بالا ۲/۱۳۷ کا یہ معنی لیا جائے کہ اللہ کافی ہے نہیں' کافی ہوگا تو کفایت خداوندی مجروح ہو جاتی ہے۔ پس ثابت ہوا کہ یہاں مستقبل کا معنی لینا غلط ہے۔ فلہذا ثابت ہوا کہ یہ قاعدہ کلیہ نہیں ہے کہ

مضارع پر ''س'' داخل ہوتو ضرور ہی اسے مستقبل کے لیے مختص کر دیتا ہے بلکہ ثابت ہوا کہ مضارع پر ''س'' داخل ہوتو بعض اوقات حال کے معنوں میں تاکید پیدا کر دیتا ہے اسی عنوان کی ایک اور مثال ملاحظہ فرمائیں:

سنقرئک فلا تنسی ۶/۸۷۔ دیکھئے یہاں نقرء مضارع پر ''س'' داخل ہوا ہے۔ اگر اسے مستقبل کے لیے مختص کر دیا جائے۔ تو یہ مفہوم سامنے آتا ہے۔ ''ہم آپ کو پڑھائیں گے پھر آپ بھولیں گے نہیں''۔ یہ مفہوم مشاہدے کے خلاف ہے۔ کیونکہ جس وقت آپ کو سنقرئک کہا گیا تھا اس وقت تعلیم قرآنی دی جا رہی تھی۔ ہنوز دی جانے والی نہیں تھی۔ پس اس آیت کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ یقیناً یقیناً ہم آپ کو پڑھاتے ہیں پھر آپ ہرگز بھولتے نہیں''۔

پس ''س'' کے مضارع پر داخلہ کے خواص قرآن کریم کی رو سے یہ ہیں: ☆ کبھی فعل مضارع کو مستقبل کا فائدہ دیتا ہے اور کبھی حال کے معنوں میں تاکید پیدا کرتا ہے۔ یعنی یقیناً ایسا ہے یا ایسا ہوتا ہے۔

۶/۳۱ ''فی'' کے مختلف استعمالات:

''فی'' حرف جار کا عموماً معنی لیا جاتا ہے میں۔ لیکن قرآنی لغت سے ذیل کے متعدد معنی ثابت ہیں:

۱۔ ''فی'' بمعنی 'میں'

☆ ولله ما فی السموت وما فی الارض ۴/۱۳۱۔ اور جو کچھ آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے سب اللہ تعالیٰ ہی کی ملکیت ہے۔

۲۔ ''فی'' برائے 'اظہار سبب'

☆ قالت فذا لکن الذی لمتننی فیه ۱۲/۳۲۔ اس عورت (زن عزیز) نے زنان مصر سے مخاطب ہو کر (حضرت یوسف کی طرف اشارہ کر کے) کہا یہ ہے وہ جس کی وجہ سے تم مجھے ملامت کرتی تھیں۔

۳۔ ''فی'' بمعنی 'کے مقابلے پر'

☆ **فما متاع الحیوۃ الدنیا فی الاخرۃ الا قلیل** ۳۸/۹۔آخرت کی کامیابی کے مقابلے پر دنیا کا مال ہیچ ہے۔

۴۔ ''فی'' بمعنی 'کے لیے'

☆ **فاذا بلغن اجلھن فلا جناح علیکم فیما فعلن فی انفسھن بالمعروف** ۲/۳۴۔پھر جب بیوہ عورتوں کی عدت پوری ہوجائے تو تمہارے لیے اس کام میں کوئی حرج نہیں جو وہ اپنی جانوں کے لیے بطریق معروف کریں (یعنی نکاح ثانی کرلیں)

۵۔ فی بمعنی کے ذریعہ:

☆ **انما یرید الشیطن ان یوقع بینکم العداوۃ و البغضاء فی الخمر و المیسر** ۹۱/۵۔بلاشبہ شیطان (ضابطہ خداوندی کا منکر) ارادہ کرتا ہے کہ تمہارے درمیان خمر و میسر کے ذریعہ عداوت اور بغض پیدا کردے۔

۷/۳۱۔ ''من'' کے مختلف استعمالات:

عموماً ''من'' بمعنی ''سے'' لیا جاتا ہے لیکن قرآن کریم سے ذیل کے متعدد معنی ثابت ہیں:

۱۔ ''من'' ابتدائیہ بمعنی ''سے'': ☆ **من المسجد الحرام الی المسجد الاقصا** ۱/۱۷۔مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک۔

۲۔''من'' بیانیہ برائے ''استغراق'': ☆ **فاجتنبوا الرجس من الاوثان** ۲۲/۳۰۔سب کے سب بتوں کی نجاست سے بچتے رہو۔

۳۔''من'' بعضیہ: ☆ **ومنھا تاکلون** ۷۹/۴۰۔اور چارپایوں میں سے بعض کو تم کھاتے ہو۔

۴۔''من'' بمعنی کی طرف سے: ☆ **انی القی الی کتب کریمo انہ من سلیمن** ۲۹۔۲۷/۳۰۔بے شک میری طرف ایک معزز چٹھی بھیجی گئی ہے۔بلاشبہ وہ سلیمان کی طرف سے

ہے۔

۵۔ ''من'' بمعنی کی وجہ سے: ☆ مما خطیئتھم اغرقوا ۲۵/۷۱۔وہ اپنی خطاؤں کی وجہ سے غرق کیے گئے۔

۶۔ ''من'' بمعنی کی ''بجائے'': ☆ ارضیتم بالحیوۃ الدنیا من الاخرۃ ۳۸/۹۔ کیا تم آخرت (کی کامیابی) کی بجائے دنیا (کے مال) پر راضی ہو گئے ہو؟

۷۔''من'' بمعنی''میں سے'': ☆ ولقد خلقنا الانسان من صلصال من حما مسنون ۲۶/۱۵۔اور بے شک ہم نے انسان کو سڑی ہوئی مٹی کے بدبودار گارے میں سے پیدا کیا۔

۸۔ ''من'' بمعنی''کے ساتھ'': ☆ ینظرون من طرف خفی ۴۵/۴۲۔وہ کنکھیوں کے ساتھ دیکھتے ہیں۔

۹۔''من'' بمعنی''کے مقابلے پر'': ☆ ونصرنہ من القوم الذین کذبوا بایتنا ۷۷/۲۱۔اور ہم نے اس کی اس قوم کے مقابلے پر مدد کی جس نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا۔

۱۰۔من بمعنی کے ہاں: ☆ لن تغنی عنھم اموالھم ولا اولادھم من اللہ شیئا ۱۷/۵۷۔ اللہ کے ہاں ان کے مال اور اولاد کسی کام نہیں آئیں گے۔

۱۱۔ ''من'' بمعنی''کے'': ☆ اذا نودی للصلوۃ من یوم الجمعۃ ۹/۶۲۔جب وقت کے ذریعہ صلوٰۃ کے لیے ندا دی جائے جمعہ کے دن۔

۱۲۔ ''من'' برائے ''تمیز'': ☆ واللہ یعلم المفسد من المصلح ۲۰۰/۲۔اور اللہ اس مفسد کو جانتا ہے جو مصلح کے لبادے میں فساد کرتا ہے۔

۱۳۔ ''من'' بمعنی''کے بدلے'': ☆ ان الذین کفروا لو ان لھم ما فی الارض جمیعا و مثلہ معہ لیفتدوا بہ من عذاب یوم القیمۃ ماتقبل منھم ۳۶/۵۔ بے شک اگر منکرین ضابطہ خداوندی کے پاس زمین بھر کی پوری دولت ہو اور اتنی ہی اور بھی ہو۔اس لیے کہ وہ قیامت کے عذاب کے بدلے فدیہ دیں تو ان سے ہرگز قبول نہیں کی جائے گی۔

۱۴۔''من'' بمعنی''کوئی بھی'': ☆ ما تسقط من ورقۃ الا یعلمھا ۶/۵۹۔نہیں گرتا

کوئی بھی پتہ مگر اللہ اسے جانتا ہے۔

☆ وما من اله الا الله ۶۲/۳۔اور نہیں ہے کوئی بھی الٰہ سوائے اللہ کے۔

۱۵۔ ''من'' زائدہ اور مما بمعنی اس لیے کہ: ☆ و اذا سمعوا ما انزل الی الرسول تری اعینهم تفیض من الدمع مما عرفوا من الحق ۸۳/۵۔اور جب وہ(قرآن) سنتے ہیں جو رسول سلام علیہ کی طرف نازل ہوا ہے۔تو تو دیکھتا ہے ان کی آنکھوں کو کہ آنسو بہاتی ہیں۔ اس لیے کہ وہ حق کو پہچانتے ہیں۔

۳۱/۸۔ عن :

''عن'' حرف جار کا معنی عموماً لیا جاتا ہے ''سے''۔لیکن قرآن کریم میں ذیل کے متعدد معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

۱۔''عن'' بمعنی ''سے'': ☆ ما کان لاهل المدینة ومن حولهم من الاعراب ان یتخلفوا عن رسول الله ۱۲۰/۹۔ مدینہ والوں اور آس پاس کے دیہات والوں کو یہ لائق نہیں تھا کہ وہ اللہ کے رسول سے پیچھے رہ جائیں۔

۲۔ ''عن'' بمعنی ''پر'' :☆ رضی الله عنهم و رضوا عنه ۱۰۰/۹۔ اللہ ان پر راضی ہو گیا اور وہ اللہ پر راضی ہو گئے۔

۳۔ ''عن'' بمعنی کا' کے' کی': ☆ وهو الذی یقبل التوبة عن عباده ۲۵/۴۲۔ اور وہی ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے۔

۴۔ ''عن'' برائے ''الٰے معنی'': ☆ اراغب انت عن الهتی یا براهیم ۴۶/۱۹۔اے ابراہیم! کیا تو میرے معبودوں کے ساتھ رغبت رکھنے والا نہیں ہے۔

۵۔ ''عن'' بمعنی ''کے بعد'' : ☆ لترکبن طبقا عن طبق ۱۹/۸۴۔تم ایک طبقہ کے بعد دوسرے طبقہ پر ضرور چڑھو گے۔

۶۔ ''عن'' بمعنی میں آ کر: ☆ وما نحن بتارکی الهتنا عن قولک ۵۳/۱۱۔اور ہم تیری باتوں میں آ کر اپنے معبودوں کو چھوڑنے والے نہیں۔

۷۔ عن بمعنی کے مطابق: ☆ وما کان استغفار ابراهیم لابیه الا عن موعدة وعدها

ایاہ ۹/۱۱۴۔اورابراہیمؑ کا اپنے باپ کے لیے استغفار کرنا ایک وعدہ کے مطابق تھا' جو اس کے ساتھ انہوں کیا۔

۸۔ عن بمعنی کے ساتھ: ☆ وما ینطق عن الھوی ۵۳/۳۔اوروہ اپنی خواہش کے ساتھ نہیں بولتا۔

۹/۳۱۔ علیٰ کے مختلف استعمالات:

حرف جار علیٰ کا معنی عام طور پر لیا جاتا ہے پر۔لیکن قرآن کریم میں ذیل کے متعدد معنوں میں استعمال ہوا ہے:

۱۔ ''علیٰ'' بمعنی ''پر'': ☆ وعلى الفلک تحملون ۲۲/۱۳۔اورتم کشتیوں پر سوار کیے جاتے ہو۔

۲۔ ''علیٰ'' بمعنی سے: ☆ اذا کتالوا علی الناس ۸۳/۲۔جب وہ لوگوں سے ناپ کر لیتے ہیں۔

۳۔ علیٰ بمعنی ''میں'': ☆ ومن کان مریضا او علی سفر ۲/۱۸۵۔اور جو کوئی بیمار ہو یا سفر میں ہو۔

۴۔ علیٰ بمعنی ''کے مطابق'': ☆ لتکبروا الله علی ماعدکم ۲/۱۸۵۔تا کہ تم اللہ کی ہدایت کے مطابق اس کی بڑائی کا اظہار کرو۔

۵۔ علیٰ بمعنی ''کے باوجود'': ☆ واتی المال علی حبه ۲/۱۷۷۔اور مال کی محبت کے باوجود حاجت مندوں کو مال دیتا ہے۔

۶۔ علیٰ بمعنی ''کے متعلق'': ☆ ان لا اقول علی الله الا الحق ۷/۱۰۵۔یہ کہ میں اللہ کے متعلق حق کے سوا کچھ نہ کہوں۔

۷۔ علیٰ بمعنی ''تک'': ☆ ھذا صراط علی مستقیم ۱۵/۴۱۔یہ سیدھا راستہ مجھ تک پہنچتا ہے۔

۸۔ علیٰ بمعنی ''کے سامنے'': ☆ ولتصنع علی عینی ۲۰/۳۹۔اورتا کہ تیری پرورش میری نگاہ کے سامنے کی جائے۔

۹۔ علیٰ بمعنیٰ ''کے ذریعہ'': ☆ ماوعدتنا علی رسلک ۳/۱۹۴۔تونے ہمارے ساتھ جو اپنے رسولوں کے ذریعہ وعدہ کیا تھا۔

۱۰۔ علیٰ بمعنیٰ ''فرض ہے'': ☆ فانما علیک البلغ ۳/۲۰۔پس اے رسول سلام علیہ! سوائے اس کے اور کوئی بات نہیں کہ آپ پر ہمارا پیغام پہنچانا فرض ہے۔

۱۱۔ علیٰ بمعنیٰ ''کے پاس'': ☆ او اجد علی النار هدی ۲۰/۱۰۔یا میں آگ کے پاس کوئی رہبر پاؤں۔

۱۲۔ علیٰ بمعنیٰ ''کے مقابلے پر'': ☆ فایدنا الذین امنوا علی عدوهم ۱۴/۱۶۔پس ہم نے ان کے دشمنوں کے مقابلے پر مومنوں کی مدد فرمائی۔

۱۰/۳۱۔الیٰ کے مختلف استعملات۔

الیٰ حرف جار قرآنِ کریم میں ذیل کے متعدد مختلف معنوں میں آیا ہے:

۱۔ الیٰ بمعنیٰ تک (زمان کے لئے): ☆ من المسجد الحرام الی المسجد الاقصا ۱۷/۱ – مسجد حرام سے مسجد حرام اقصیٰ تک

۲۔ الیٰ بمعنیٰ ''سمیت'': ☆ فاغسلو اوجوهکم وایدیکم الی المرافق ۵/۶– اپنے چہرے اور کہنیوں سمیت ہاتھ دھولیا کرو–

۳۔ الیٰ بمعنیٰ ''کے ساتھ'': ☆ ولاتاکلوا اموالهم الی اموالکم ۴/۲– اور اپنے مالوں کے ساتھ ان یتیموں کے مال نہ کھا جانا۔

۴۔ الیٰ بمعنیٰ ''کو'': ☆ لیجمعنکم الی یوم القیمة ۵/۱۲– وہ قیامت کے دن کو تمہیں ضرور اکٹھا کرے گا۔

۵۔ الیٰ بمعنیٰ ''میں'': ☆ لیجمعنکم الی یوم القیمة ۵/۱۲– وہ قیامت کے دن میں تمہیں ضرور اکٹھا کرے گا۔

۶۔ الیٰ زائدہ: ☆ اس ۲/۱۲ کا مفہوم الیٰ کے بغیر بھی صحیح برآمد ہوتا ہے کہ وہ قیامت کے دن تمہیں ضرور اکٹھا کرے گا۔

۷۔ الیٰ بمعنیٰ ''کے نزدیک'': ☆ رب السجن احب الی ۱۲/۳۳۔اے میرے پروردگار

میرے نزدیک قید خانہ اس سے پسندیدہ ہے۔

۸۔ الیٰ بمعنی کے متعلق: ☆ **وقضینا الی بنی اسرائیل** ۴/۱۷۔اور ہم نے بنی اسرائیل کے متعلق فیصلہ کر دیا۔

۹۔ الیٰ بمعنی کے لئے: ☆ **والامر الیک** ۳۳/۲۷ اور حکم تیرے لئے ہے۔

۱۰۔ الیٰ بمعنی کی طرف: ☆ **وان اللہ لھاد الذین امنوا الی صراط مستقیم ٥** ۲۲/۵۴۔اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ مومنوں کی صراطِ مستقیم کی طرف رہنمائی کرنے والا ہے۔

۱۱/۳۱۔ کلا:

حرف ردع ہے۔اس کا عمومی معنی ہے ہرگز نہیں لیکن قرآنِ کریم میں اس کے متعدد استعمال موجود ہیں:

۱۔ کلا بمعنی "بات یوں نہیں ہے": ☆ **اذا تتلی علیہ ایتنا قال اساطیر الاولین ٥ کلا بل ران علی قلوبھم ما کانوا یکسبون ٥** ۱۳/۱۴/۸۳۔جب اس پر ہماری آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو وہ کہتا ہے یہ قرآن پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں بات یوں نہیں' یہ قرآن کہانیاں نہیں بلکہ یہ لوگ جو کسب کرتے رہے تھے اس نے ان کے دلوں کو زنگ آلود کر دیا ہے۔

۲۔ کلا بمعنی "ہرگز نہیں": ☆ **قال اصحب موسی انا لمدرکون ٥ قال کلا ج ان معی ربی سیھدین ٥** ۶۱۔۶۲/۲۶۔(جب فرعون بنی اسرائیل کا تعاقب کرتا ہوا قریب پہنچ گیا) تو اصحاب موسیٰ نے کہا بیشک ہم پکڑے جانے والے ہیں۔موسیٰ نے فرمایا ہرگز نہیں میرا پروردگار ضرور میری رہنمائی کرے گا۔(فرعون کی گرفت سے ضرور بچا لے گا۔)

۳۔ کلا بمعنی "وہ ایسا نہیں کر سکیں گے": ☆ **ولھم علی ذنب فاخاف ان یقتلون ٥ قال کلا** ۱۴۔۱۵/۲۶۔(حضرتِ موسیٰ نے کہا کہ) فرعونیوں کا میرے ذمہ ایک جرم ہے (کہ مجھ سے ان کا ایک آدمی قتل ہو گیا تھا) اس لیے میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے قتل نہ کر دیں۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وہ ایسا نہیں کر سکیں گے۔

۴۔ کلا بمعنی "حقیقت": ☆ **کلا ان الانسان لیطغی** ۶/۹۶۔ حقیقت یہ ہے کہ بلاشبہ انسان اپنے پروردگار کی نافرمانی کرتا ہے۔

۵۔ کلا بمعنی "ضرور ضرور": ☆ کلا سوف تعلمون ٥ ثم کلا سوف تعلمون ٥ ۳-۴/۱۰۲۔ضرور ضرور تم عنقریب جان لو گے۔ پھر سن لو کہ۔ضرور ضرور تم عنقریب جان لو گے۔

۱۲/۳۱-بل:

حرف استدراک ہے۔ کبھی کلام ماسبق کی تردید وانکار کے لئے کبھی تائید وتصدیق کے لئے اور کبھی وضاحت واضافہ کے لئے آتا ہے نیز کبھی کلام ماسبق کی تردید کے بغیر کلام مابعد کی تائید کے لئے آتا ہے۔

۱۔ بل برائے تردید وانکار: ☆ وقالوا اتخذ الرحمن ولد اسبحنه بل عباد مکرمون ٥ ۲۱/۲٦۔اور وہ (انبیاء میں سے بعض کے متعلق) کہتے ہیں کہ رحمان نے انہیں بیٹا بنایا ہے وہ بیٹے سے پاک ہے۔ (اس نے کسی نبی کو بیٹا نہیں بنایا) بلکہ وہ اس کے واجب الکریم بندے تھے۔

۲۔ بل برائے "تائید وتوثیق": ☆ قالوء انت فعلت هذا بالهتنا یا براهیم ٥ قال بل فعله کبیرهم هذا فسئلو هم ان کانوا ینطقون٥ ۶۲۔۶۳/۲۱۔سابقہ تفسیر وں نے اس آیت میں آمدہ "بل" کو برائے تردید وانکار قرار دیکر حضرت ابراہیمؑ کو دروغ گو بنا دیا ہے۔ حالانکہ انه کان صدیقا نبیا ۴۱/۹۱ کی قرآنی خبر کے مطابق آنحضور ہرگز ہرگز جھوٹ بولنے والے نہیں تھے نہ دروغ مصلحت آمیز نہ دروغ شرانگیز۔اس لئے ۲۱/۶۳ میں آمدہ "بل" تردید وانکار کا نہیں ہوسکتا کہ جب بت پرستوں نے کہا کہ اے ابراہیم کیا ہمارے بتوں کو تو نے توڑا ہے۔ تو آنحضور نے جھوٹ بولا کہ میں نے نہیں بلکہ بڑے بت نے انہیں توڑ ڈالا ہے۔فلہذا یہ بل تائید وتصدیق کا ہے۔تردید انکار نہیں۔اور آیت مجیدہ کا عین قرآنی مفہوم یہ ہے۔

☆ بت پرستوں نے کہا کہ اے ابراہیم! کیا ہمارے معبودوں کے ساتھ تو نے ایسا کیا ہے آپ نے فرمایا اسی نے کیا ہے (جس کا تم ذکر کر رہے تھے) یہ بڑا بت (صحیح سالم موجود ہے) اگر یہ بول سکتے ہیں تو انہی سے پوچھ لو کہ تمہیں کس نے توڑا ہے۔

قال بل فعله کے فعل' فعل کی ھو ضمیر مستتر آیت ماقبل ۲۱/۶۰ کے لفظ ابراہیم کی طرف پھرتی ہے کہ جب انہوں نے بتوں کو ٹوٹا ہوا پایا تو ایک دوسرے سے پوچھا: ٥ قالوا من فعل

هذا بالهتنا- انہوں نے کہا ہمارے معبودوں کے ساتھ ایسا کس نے کیا ہے۔دوسروں نے جواب دیا:ہ قالوا سمعنا فتی یذکر هم یقال له ابراهیم ٥ ٦٠/٢١-انہوں نے کہا کہ ہم نے ایک نوجوان کے متعلق سنا ہے کہ وہ ان کے ساتھ ایسی تجویز کرنے کا ذکر کرتا تھا۔اس نوجوان کو ابراہیم کہتے ہیں۔حضرت ابراہیم نے جبکہ خود اعلان کر رکھا تھا وتاللہ لا کیدن اصنامکم ۵۷/۲۱۔اللہ کی قسم میں ضرور تمہارے بتوں کے ساتھ ایک تجویز کروں گا۔اس لئے ابراہیم صدیقا نبیا ۴۱/۱۹ کی طرف دروغ مصلحت آمیز بھی منسوب نہیں ہو سکتا۔ پس ۶۳/۲۱ میں آمدہ بل برائے تردید وانکار نہیں۔ برائے تائید اقرار ہے(کبیر هم هذا مرکب ناقص مبتدا اور سالم خبر محذوف ہے قرینہ موجود ہو تو خبر محذوف ہو سکتی ہے پس تقدیر کلام یہ کبیر هم هذا سالم یہ انکار بڑا صحیح ہے۔اگر یہ بولتے ہیں تو انہی سے پوچھ لو کہ ان کے ساتھ توڑ پھوڑ کس نے کی ہے-)

۳۔ بل برائے وضاحت واضافہ: ☆ بل قالوا اضغاث احلام بل افتراه بل هو شاعر ۵/۲۱۔بلکہ (ہماری آیتوں کے متعلق) لوگوں نے کہا کہ یہ پریشاں خیالات ہیں بلکہ یہ کہا کہ اس نے اپنی طرف سے بنالی ہیں بلکہ یہ کہا کہ یہ رسول تو ایک شاعر ہے۔

۴۔ بل برائے تائید کلام بعد بلا تردید کلام ماسبق: ☆ ولدینا کتب ینطق بالحق وهم لا یظلمون ٥ بل قلوبهم فی غمرة من هذا ۶۲/۶۳/۲۳۔اور ہمارے پاس ایسی کتاب ہے جو سچ بولتی ہے اور وہ ظلم نہیں کئے جائیں گے لیکن ان کے اذہان اس کی طرف سے غفلت میں ہیں۔

۱۳/۳۱ ''من دون'' کے مختلف استعمالات:

''من دون'' کا معنی عموماً لیا جاتا ہے ''کے سوا''۔لیکن قرآنی لغت میں اس کا معنی ''کے ساتھ'' بھی ہے:

و اذ قال اللہ یعیسی ابن مریم ء انت قلت للناس اتخذونی و امی الهین من دون الله ۱۱۶/۵۔اور وہ وقت قابل ذکر ہے جب اللہ تعالیٰ کہے گا کہ اے مریم کے بیٹے عیسیٰ ! کیا تو نے لوگوں کو کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو اللہ کے ساتھ دو الٰہ اور ٹھہرالو۔۔۔۔۔ دیکھئے گا!

یہاں من دون اللہ کا معنی اللہ کے سوا نہیں بلکہ اللہ کے ساتھ ہے۔ کیونکہ ۷۳/۵ میں نصاریٰ کا عقیدہ اللہ کے ساتھ دو اور الٰہ ٹھہرانا بتایا گیا ہے۔ اللہ کے سوا دو الٰہ ٹھہرانا نہیں بتایا: ☆ لقد کفر الذین قالوا ان اللہ ثالث ثلثۃ ۔ بے شک وہ لوگ کافر ہوئے جو کہتے ہیں اللہ تین الاہوں کا تیسرا ہے۔ پس ''من دون'' کا معنی ''کے ساتھ'' بھی قرآن کریم سے ثابت ہے۔

۱۴/۳۱۔ اِلّا کے مختلف استعمالات:

یہ حرف استثنیٰ ہے۔ جو عموماً ''سوائے'' کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے لیکن قرآن کریم میں اس کے متعدد معنی موجود ہے:

۱۔ الا بمعنی ''سوائے'' : ☆ لا الہ الا اللہ ۱۹/۴۷۔ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔

۲۔ الا بمعنی ''ہاں البتہ'': ☆ فلولا کانت قریۃ امنت فنفعھا ایمانھا الا قوم یونس ۹۸/۱۰۔ پس کیوں نہ ہوئی کوئی ایسی بستی کہ ایمان لاتی تو اس کا ایمان اسے نفع دیتا۔ ہاں البتہ قوم یونس ایسی تھی کہ ایمان لائی اور اسے اس کے ایمان نے فائدہ دیا۔ (یعنی اس سے عذاب خداوندی ٹل گیا)

۳۔ الا عاطفہ بمعنی ''اور'': ☆ انی لا یخاف لدی المرسلون ۞ الا من ظلم ثم بدل حسنا بعد سوء ۱۱۰/۲۷۔ بے شک میرے رسول ہرگز میرے ہاں نہیں ڈرتے۔ اور وہ شخص بھی نہیں ڈرتا جس نے کوئی زیادتی کی۔ پھر اعمالِ صالحہ کے ساتھ برائی کو نیکی کے ساتھ بدل دیا۔

۴۔ الا برائے ''استغراق'': ☆ ان کل الا کذب الرسل ۱۴/۳۸۔ بلاشبہ سب نے ہمارے رسولوں کو جھٹلایا۔

۵۔ الا بمعنی ''ان لا'' (اگر نہیں): ☆ الا تنصروہ فقد نصرہ اللہ اذا اخرجہ الذین کفروا ۴۰/۹۔ اگر تم اس کی مدد نہ کرو تو کوئی بات نہیں۔ اللہ نے اس کی مدد اس وقت بھی کی تھی جب اسے کافروں نے نکال دیا تھا۔ (اور آئندہ بھی کرتا رہے گا)

۶۔ الا برائے ''تاکید و تائید'': ☆ خالدین فیھا مادامت السموت والارض الا ماشاء ربک ۱۰۸/۱۱۔ اہل جہنم اس میں اس وقت تک رہیں گے جب تک کہ آسمان اور زمین موجود ہیں۔ یقیناً تیرے پروردگار نے جو چاہا ہے وہی ہوگا۔ یعنی اس نے ایسا ہی چاہا ہے کہ جب

تک آسمان وزمین موجود ہیں وہ جہنم میں رہیں۔دیکھئے! یہاں الا کلام ماسبق کی تاکید وتائید کے لئے آیا ہے۔تردید کے لئے نہیں آیا۔اسی طرح ۔۶۔۷/۸۷ میں بھی آیا ہے: **سنقرک فلا تنسی ○ الا ماشاء الله** ۶۔۷/۸۷۔اب رسول! بلاشبہ ہم آپکو پڑھاتے ہیں پھرآپ ہرگز بھولتے نہیں۔اس آیت مجیدہ کے اس ٹکرے سے ثابت ہوتا ہے کہ نزول وحی کے ساتھ ہی آنحضور کو قرآن مجید حفظ ہوتا چلا جاتا تھا۔ایسا حفظ جو آپ کے ذہنِ مبارک سے کبھی محو نہیں ہوتا تھا۔اب اس سے آگے آیا ہے الا ماشاء الله۔اگر یہاں الا کو استثنائیہ قرار دیا جائے تو معنی بنتا ہے کہ "ہم آپ کو پڑھاتے ہیں پھر وہ آپ کو حفظ ہو جاتا ہے آپ ہرگز نہیں بھولتے۔سوائے اس کے جسے اللہ بھلا دینا چاہے"۔ظاہر ہے کہ الا ماشا اللہ کا یہ مفہوم سیاق کلام کے خلاف ہے کیونکہ قرآنِ کریم کے جس حصے کو بھلا دینا ہو اس کا نازل کرنا کارِ عبث اور محض ڈرامائی کردار ثابت ہوتا ہے۔اب چونکہ ایسے کردار سے ذات خداوندی پاک ومنزہ ہے۔پس ظاہر ہے کہ نزولِ قرآن کو آنحضور سلام علیہ کے ذہن میں محفوظ کرنے کی جو کیفیت آیت مجیدہ کے پہلے جملے میں بتائی گئی ہے **سنقرنک فلا تنسی**۔یقیناً ہم آپ کو قرآن کی تعلیم دیتے ہیں۔پس وہ آپ کے ذہن مبارک میں محفوظ ہوتی چلی جاتی ہے۔اس پر جملہ ما شاء اللہ سکی تائید وتاکید کے لئے ہی ہوسکتا ہے۔تردید کے لئے نہیں پس سیاقِ کلام کے مطابق الا ماشا اللہ کا مفہوم یہ ہے۔"یقیناً جو چاہا اللہ نے یعنی اللہ تعالی نے چاہا ہی یہ ہے کہ آپ کو قرآن کی جو تعلیم دی جائے وہ آپ کو ایسی حفظ ہوتی چلی جائے کہ آپ ہرگز ہرگز نہ بھولیں"۔

"س" بمعنی یقیناً کے لئے عنوان ۵/۲۹ میں حرف س کی بحث ملاحظہ فرمائیں۔

۱۵/۳۱۔ اِنَّ کے مختلف استعمالات-

اِنَّ حرف تاکید ہے عموماً ابتداء کلام میں آتا ہے: **ان الذین کفر واسواء علیھم....** ۲/۶۔بے شک جو لوگ ضابطہ خداوندی کا انکار کرتے ہیں۔انہیں آخرت کے عذاب سے ڈرانا یا نہ ڈرانا برابر ہے۔

انما: ان ما کا مرکب ہے۔کلمہ حصر ہے بمعنی سوائے اس کے اور کوئی بات نہیں۔

انا: "ان" اور "نا" کا مرکب ہے۔قرآنِ کریم میں انا اور اننا دونوں صورتوں میں آیا ہے

بمعنی بے شک ہم۔

انی' ان اوری کا مرکب ہے۔انی اور اننی دونوں صورتوں میں آیا ہے۔بمعنی بیشک میں۔

انک : انکم وغیرہ ایک ہی صورت میں آئے ہیں۔بمعنی بے شک تو۔ بے شک تم۔

۱۶/۳۱۔انّٰی کے مختلف استعمالات:

یہ حرف استفہام ہے۔متعدد معنوں میں استعمال ہوتا ہے:۔

۱۔ انی بمعنی "کس طرح:" ☆ انی یکون له ولد ولم تکن له صاحبه ۶/۱۰۱۔اللہ کا بیٹا کس طرح ہوسکتا ہے۔جبکہ اس بیوی ہی کوئی نہیں۔

۲۔ انی بمعنی "کہاں سے": ☆ انی لک ھذا ۳/۳۷۔(اے مریم!) تجھے یہ رزق کہاں سے ملا ہے۔

۳۔ انی بمعنی "کدھر کو": ☆ فانی توفکون ۶/۹۵۔پھر تم کدھر کو الٹے پھر رہے ہو۔

۴۔ انی بمعنی "جب": ☆ نساؤکم حرث لکم فاتوا حرثکم انی شئتم ۲/۲۲۳۔ تمہاری بیویاں تمہاری کھیتیاں ہیں۔ممنوعہ اوقات یعنی حمل' حیض' بیماری' زچگی کے علاوہ' اپنی کھیتیوں کو جب چاہو آؤ۔

۱۷/۳۱۔استفہام اقراری اور انکاری:

حروف استفہام کے متعلق یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ اگر ان میں انکار مذکور ہو تو اقرار مقصود ہوتا ہے۔اور اگر اقرار مذکور ہو تو انکار مقصود ہوتا ہے۔

۱۔ استفہام انکاری: ☆ ھل تری من فطور ۳/۶۷۔اے مخاطب کیا تو کائنات میں کوئی کمی دیکھتا ہے۔دیکھے گا!! اگرچہ یہاں "دیکھتا ہے" کے مثبت الفاظ آئے ہیں۔لیکن متکلم کی غرض یہ بتانا ہے کہ تو کائنات میں ہرگز کوئی کمی نہیں دیکھتا۔"

۲۔ استفہام اقراری : ☆ الیس اللہ باحکم الحکمین ۸/۹۵۔کیا اللہ تعالیٰ حاکموں کا حاکم نہیں ہے۔اس جملہ میں اگر "نہیں ہے" کہ منفی الفاظ آئے ہیں لیکن متکلم کی غرض یہ بتانا ہے کہ اللہ تعالیٰ حاکموں کا حاکم ہے۔

یادرہے کہ سورہ تحریم ۶۶/۱ میں یا یھا النبی لم تحرم ما احل اللہ لک میں استفہام انکاری ہے۔ جس سے سابقہ تفاسیر تراجم نے آنحضور کی طرف اللہ کے حلال کو حرام کرنا منسوب کر رکھا ہے۔ حالانکہ یہاں کہا گیا ہے کہ تو کیوں اللہ کے حلال کو حرام کرے گا۔ یعنی تو کبھی نہیں کریگا۔

۱۸/۳۱۔ان کے مختلف استعمالات:

اہل قواعد نے اسے شرطیہ ماننے کے علاوہ نافیہ اس شرط پر مانا ہے کہ اس کے بعد الا ہو اور اسے تاکید یہ اس شرط کے ساتھ تسلیم کیا ہے کہ اگر اس کا صلہ لام آئے۔ لیکن قرآن کریم میں ان نافیہ بلا ورود الا بھی آیا ہے۔ اور ان تاکید یہ بمعنی إنَّ بلا صلہ لام بھی آیا ہے۔ بالترتیب مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

۱۔ ''ان'' شرطیہ: ☆ انی اخاف ان عصیت ربی عذاب یوم عظیم ۱۰/۱۵ O۔ اگر میں اپنے پروردگار کی نافرمانی کروں تو بلاشبہ میں بھی بڑے دن کے عذاب سے خوف کھاتا ہوں۔

۲۔ ''ان'' نافیہ باورود ''الا'': ☆ ان الحکم الا للہ ۶/۵۷۔ اللہ کے سوا کسی کا حکم ہے ہی نہیں۔

۳۔ ''ان'' نافیہ بلاورود ''الا'': ☆ ان عندکم من سلطن بھذا ۱۰/۶۸۔ تمہارے پاس اس کی کوئی دلیل نہیں ہے۔

۴۔ ''ان'' تاکید یہ بمعنی بیشک صلہ لام کے ساتھ: ☆ وان کنت من قبلہ لمن الغفلین ۱۲/۳۔ اور بے شک تو اس سے پہلے بے خبروں میں سے تھا۔ اس آیت میں لمن کی لام حرف ان کے صلہ کی لام ہے۔

۵۔ ''ان'' تاکید یہ بمعنی بے شک بغیر صلہ لام: ☆ ولا تکرھوا فتیٰتکم علی البغاء ان اردن تحصنا لتبتغوا عرض الحیوۃ الدنیا ۲۴/۳۳۔ اور تم اپنی خادمہ عورتوں کو بدکاری پر مجبور نہ کرو تاکہ تم دینوی زندگی کا مال حاصل کرو۔ بے شک وہ اس سے بچنے کا ارادہ رکھتی ہیں۔ یہ تو ہے اس آیت مجیدہ کا معنی ''ان اردن تحصنا میں ان تاکید یہ بمعنی ان بے شک کی صورت میں لیکن جونکہ اس آیت میں حرف ان کا لام صلہ موجود نہیں۔ اس لئے جملہ تراجم میں اس آیت کا

معنی اسے ان شرطیہ قرار دے کر یہ لکھا ہے:

اگر تمہاری خادمائیں عصمت کو بچانے کا ارادہ کریں تو انہیں دنیا کا مال حاصل کرنے کے لئے بدکاری پر مجبور نہ کرو۔ اس ترجمے پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر وہ عصمت کو بچانے کا ارادہ نہ کریں تو کیا پھر ان کی عصمت فروشی کا کاروبار کھول لینے کے اجازت دیدی گئی ہے؟ معاذ اللہ استغفر اللہ! فلہٰذا ان دلائل قاطعہ کی رو سے ثابت ہوا کہ **ان اردن تحصنا** ۲۴/۳۳ میں ان بمعنی اِذْ ہے۔ اور یہ جملہ معترضہ کی صورت میں عورتوں کی عام جبلت کے اظہار کے لئے آیا ہے کہ وہ تو بلاشبہ عصمت فروشی سے بچنا چاہتی ہیں تم دنیوی مال کے لئے انہیں عصمت فروشی کے لئے مجبور نہ کرو۔ چنانچہ آیت مجیدہ کے اگلے الفاظ میں کہا گیا ہے: **ومن یکرھھن فان اللہ من بعد اکراھھن غفور رحیم** ۵ ۲۴/۳۳۔ اور جو کوئی انہیں بدکاری پر مجبور کرے۔ تو ان کے مجبور کئے جانے کے بعد (اس گناہ کا بوجھ مجبور کرنے والوں پر ہوگا) مجبور کی گئی عصمت فروشوں کے لئے اللہ بخشنے والا مہربان ہے فلہٰذا مہر نیمروز کی طرح ثابت ہوا کہ ان تاکید یہ کا جب قرینہ موجود ہو اس کا لام حذف ہوتا ہے۔

۱۹/۳۱ ام کے مختلف استعمالات:

۱۔ "ام" بمعنی "یا": ☆ **ء انتم اشد خلقا ام السماء** ۷۹/۲۷۔ کیا پیدائش کی رو سے تم زیادہ سخت ہو۔ یا فضائی کرہ جات۔

۲۔ "ام" بمعنی "نیز": ☆ **قل ھل یستوی الاعمی والبصیر ام ھل تستوی الظلمت والنور** ۱۳/۱۶۔ کہہ دے اے رسول! کیا اندھا اور دیکھنے والا برابر ہوتے ہیں۔ نیز کیا اندھیرے اور روشنی برابر ہو سکتے ہیں۔

۳۔ "ام" زائدہ: ☆ **ام انا خیر من ھذا** ..... ۴۳/۵۲۔ میں اس سے بہتر ہوں۔

۲۰/۳۱ "اما" کے مختلف استعمالات:

یہ "ان" اور "ما" کا مرکب ہے۔ استیناف کا فائدہ دیتا ہے جو جس اور یا کے معنوں میں آیا ہے:

۱۔ ''اما'' بمعنی جو،جس: ☆ اما السفینۃ ..... واما الغلام ..... واما لجدار ۷۹تا۸۲/ ۱۸۔ جو کشتی ہے اس کا قصہ یہ ہے.....اور جو لڑکا ہے اس کی حقیقت یہ ہے..اور جو دیوار تھی اس کا واقعہ یہ ہے۔

۲۔ ''اما'' بمعنی یا: ☆ اما اشتملت علیہ ارحام الانثیین ۱۴۴/ ۶۔ یا وہ جو دونوں مونثوں کے رحموں میں ہے۔

۱۲/ ۱۳۱ ''ما'' کے مختلف استعمالات:

دراصل یہ ''ان'' اور ''ما'' کا مرکب ہے بتکرار وارد ہوا ہے اس کے متعدد مفاہیم قرآن کریم میں آئے ہیں:

۱۔ اِما بمعنی یا: ☆ فاما منا بعد و اِمّا فداء ۴/ ۴۷۔ جنگی قیدیوں کو یا تو احسان کر کے آزاد کرنا ہے اور یا فدیہ لے کر آزاد کرنا ہے۔

۲۔ ''اما'' بمعنی خواہ: ☆ اما شاکرا واما کفورا ۳/ ۷۶۔ خواہ شکر کرنے والا ہو اور خواہ انکار کرنے والا ہو جائے۔

۳۔ ''اما'' بمعنی اگر: ☆ فاما ترین من البشر احدا ۲۶/ ۱۹۔ پھر اگر تو کسی بشر کو دیکھے۔

۲۲/ ۱۳ بعد کے مختلف استعمالات:

یہ مادہ ب۔ع۔د سے مشتق ہے۔ بمعنی دوری اور دور ہو لیکن بطور حرف جار بھی استعمال ہوتا ہے بمعنی کے بعد۔ قرآن مجید میں بصورت حرف ذیل کے متعدد معنوں میں استعمال ہوا ہے:

۱۔ بعد بمعنی کے بعد: ☆ انہ من عمل منکم سوءا بجہالۃ ثم تاب من بعدہ واصلح فانہ غفور رحیم ۵۴/ ۶۔ حقیقت یہ ہے کہ تم میں سے جو شخص نادانی کے ساتھ کوئی ناروا کام کر بیٹھے پھر اس کے بعد اگر وہ توبہ کر کے اپنی اصلاح کر لے تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

۲۔ بعد بمعنی سوا: ☆ فمن یہدیہ من بعد اللہ ۲۳/ ۴۵۔ پھر اللہ کے سوا اس کی کون رہنمائی کر سکتا ہے۔

۳۔ بعد بمعنی اس کے باوجود: ☆ ذلک تخفیف من ربکم ورحمۃ فمن اعتدی

بعد ذلک فله عذاب الیم ٥ ۲/۱۷۸۔ مذکورہ رعایتیں تیرے پروردگار کی طرف سے بطور تخفیف و رحمت ہیں۔ پھر اس کے باوجود کوئی سرکشی کرے گا اس کے لئے دردناک عذاب ہوگا۔

۳۱/۲۳ ذلک کا قرآنی استعمال:

یہ اسم اشارہ واحد مذکر ہے۔ سلسلہ کلام میں آئے تو کسی دور کی چیز کی طرف اشارہ کرنے کے لئے آتا ہے۔ مثلاً نزدیک پڑے ہوئے قلم کے لئے کہیں گے ھذا القلم اور دور پڑے ہوئے رجسٹر کے لئے کہا جاتا ہے: ذالک الدفتر۔ لیکن جب ذلک سلسلہ تحریر میں آتا ہے تو اس سے مراد ہوتی ہے۔ مذکورہ بالا جیسے قرآن کریم میں ذیل کی متعدد مثالیں موجود ہیں۔ بنی اسرائیل کے متعلق آیا ہے:

وضربت علیهم الذلة والمسکنة وباء و ابغضب من الله ذلک بانهم کانوا یکفرون بایت الله ۲/۶۱۔ اور ان پر ذلت و مسکنت مسلط کر دی گئی اور غضب الٰہی کے مستحق ہو گئے۔ مذکورہ بالا عذاب ان پر اس لئے واجب ہوا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی آیتوں کا انکار کرتے تھے۔

سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۲۲۵ تا ۲۳۱ میں طلاق کے مسائل کی وضاحت کے بعد ارشاد ہوا ہے: ذلک یو عظ بہ ۲/۲۳۲۔ اللہ تعالیٰ مذکورہ بالا ہدایتوں کی نصیحت کرتا ہے اس کے لئے جو اللہ اور روز مکافات پر ایمان رکھتا ہے۔

نیز آیت نمبر ۲۴۳ تا ۲۴۸ میں حضرت طالوت کا جالوت کے ساتھ جہاد کا ذکر کرنے کے بعد ارشاد ہوا ہے: ان فی ذلک لآیة لکم ان کنتم مومنین ٥ ۲/۲۴۸۔ بلاشبہ مذکورہ بالا بیان میں اگر تم مومن ہو تمہارے لئے ایک واضح نشان موجود ہے۔

۳۲- قواعد کی بحث

۱/۳۲ افعال ثلاثی مجرد کا خاصہ وجدان:

قواعد کی رو سے عربی افعال کی دو قسمیں ہیں' مجرد اور مزید فیہ۔ اہل قواعد نے مزید فیہ کے بعض ابواب کا خاصہ وجدان تسلیم کیا ہے۔ لیکن مجرد افعال کا خاصہ وجدان تسلیم نہیں کیا گیا۔ لیکن واضح رہے کہ ترتیب قواعد محض بشری کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اور بشری کوششیں سہو وخطا سے منزہ نہیں ہوسکتیں۔ سہو وخطا سے پاک خدا تعالیٰ اور اس کی مقدس کتاب قرآن کریم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہل قواعد اپنے مرتب کردہ صرفی نحوی کلیات کی صحت کی دلیل کے لئے قرآنی آیات ہی لاتے ہیں۔ اور ہونا بھی ایسا ہی چاہیے کہ قواعد کی صحت کی دلیل آیات قرانیہ ہوں فلہذا اہل قواعد کے اپنے تسلیم کردہ نظریہ کے مطابق کہ گریمر کا ہر وہ کلیہ صحیح ہے جس کی تائید قرآنی آیات کریمات کرتی ہوں۔ اور ہر وہ کلیہ غلط ہے جو قرآنِ کریم کے خلاف جاتا ہو اس سلسلے میں ہم حروف کی بحث عنوان نمبر ۱۸/۳۱ میں لـــــن نافیہ اور ان تاکیدیہ کے متعلق عرض کر چکے ہیں کہ قرآن مجید میں میں ان نافیہ بلا ورود الا بھی آیا ہے۔ اور بلا صلہ لام ان بمعنی ان بھی آیا ہے اس طرح واضح رہے کہ:

قرآنِ کریم کی آیات مقدسات سے ثابت ہوتا ہے کہ افعال ثلاثی مجرد کا خاصہ وجدان تسلیم کرنا لازم ہے۔ کیونکہ اگر ثلاثی مجرد کا خاصہ وجدان تسلیم نہ کیا جائے تو قرآنِ کریم میں تضاد وتخالف پایا جاتا ہے۔ اس کا بتایا ہوا مکافاتِ عمل کا نظریہ بیکار محض ٹھہرتا ہے اور خدا تعالیٰ ظالم اور غیر عادل ثابت ہوتا ہے۔ مثلاً سورہ یس میں ضابطہ خداوندی کا انکار کرنے والوں کے متعلق ارشاد ہوا ہے:

لقد حق القول علی اکثر ھم فھم لا یومنون ○ انا جعلنا فی اعناقھم اغللا فھی الی الاذقان فھم مقمحون○ وجعلنا من بین ایدھم سدا و من خلفہ سدا فاغشینھم فھم لا یبصرون ○ ۷تا۹/۳۶ ان آیات مقدسات کا مفہوم ہر ترجمہ اور تفسیر میں افعال ثلاثی مجرد کو خاصہ وجدان سے تہی دامن مان کر یہ لکھا ہے:

بے شک ان میں سے اکثر پر عذاب کی بات واجب ہو چکی ہے پس وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ ہم نے ان کی گردنوں میں طوق ڈال دیے ہیں۔ پھر وہ طوق ٹھوڑیوں تک ہیں پس وہ اپنے

سراوپر کو اٹھائے ہوئے ہیں۔ اور ہم نے ان کے آگے بھی دیوار بنادی ہے۔ اور ان کے پیچھے بھی دیوار بنادی ہے۔ پھر ہم نے انہیں ڈھانپ دیا ہے پس وہ نہیں دیکھتے۔

اب غور فرمایئے گا! کہ اس ترجمہ کی روسے جن کے گلے میں اللہ تعالیٰ خود ایسا طوق ڈال دے جو ٹھوڑی تک پہنچکر اس کو اوپر کا اوپر اٹھارکھے مزید براں ان کے آگے بھی دیوار کھینچ دی گئی ہو۔ اور پیچھے بھی دیوار کھینچ کر اوپر سے ڈھانپ دیا گیا ہو۔ اگر انہیں راہِ ہدایت نظر نہ آئے تو ان بیچاروں کا کیا قصور؟ اور مروجہ ترجمہ کی روسے سب کچھ خود کر چکنے کے بعد اگلی آیت کریم میں ارشاد ہوتا ہے:

وسواء علیه انذرتهم ام لم تنذرهم لا یو منون ○ ۳۶/۱۰۔ اور اے رسول! آپ ان کو برے اعمال کے برے نتائج سے ڈرائیں یا نہ ڈرائیں وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ اس پر سورہ بقرہ میں ذیل کا مزید اضافہ موجود ہے:

ختم الله علی قلوبهم وعلی سمعهم وعلی ابصارهم غشاوة ولهم عذاب عظیم ○ ۲/۷۔ ہم نے ان کے ذہنوں پر اور ان کے کانوں پر مہر لگادی ہے۔ اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے اور ان کے لئے بہت بڑا عذاب ہے۔

ان بیچاروں کا قصور کیا ہے؟

اب غور طلب امر یہ ہے کہ جب خدا تعالیٰ نے خود ہی ذہنوں اور کانوں پر مہر کردی ہو۔ آگے پیچھے دیواریں کھینچ کر اوپر سے ڈھانپ دیا ہو۔ تو اس صورت میں اگر وہ نہ سن سکنے اور نہ سوچ سکنے کے باعث راہِ ہدایت کو قبول نہ کریں تو ان کا کیا قصور؟ اور ہدایت سے خود محروم کردہ افراد کے لئے **ولهم عذاب الیم** کا فیصلہ کہاں کا انصاف ہے؟ یہ وہ آیات کریمات ہیں جن کے رو سے بڑے بڑے جید علماء برمرمنبر کہہ دیتے ہیں کہ جسے اللہ تعالیٰ محروم ہدایت کردے۔ اسے کوئی ہدایت نہیں دے سکتا۔ **ومن یضلل الله فماله من هاد** ۳۹/۳۶ کا مفہوم بھی یہی لیا جاتا ہے کہ جسے اللہ گمراہ کردے اسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں۔ یاد رہے کہ خدا تعالیٰ کو گمراہ کرنے والا اور خود گمراہ کردہ کو عذاب دینے والا قرار دے کر ظالم ٹھہرانے میں صرف اس بشری سہو کا ہاتھ ہے جو مجرد افعال کا خاصہ وجدان تسلیم نہیں کیا گیا ہے۔ آیات بالا پر اگر معمولی سا غور کیا جائے تو بات نکھر کر سامنے آرہی ہے کہ جس طرح ابواب مزید فیہ کا خاصہ وجدان تسلیم کیا گیا ہے اسی طرح افعال

مجرد میں بھی خاصہ وجدان موجود ہے ذیل میں آیات بالا کا ترجمہ بصورت خاصہ وجدان ملاحظہ فرمائیں۔ آپ دیکھیں گے کہ کس طرح ہر الجھن کی گرہ کشائی ہو جاتی ہے اور ذات باری اس عظیم اعتراض سے بری ثابت ہوتی ہے جو مروجہ تراجم کی رو سے عائد ہوتا ہے اور اسے انتہائی ظالم ٹھہراتا ہے یہ ہے آیات کریمات کا متن معہ قرآنی مفہوم:

لقد حق القول علی اکثر هم فهم لایومنون ○ انا جعلنا فی اعنا قهم اغللا فهی الی الاذقان فهم مقمحون ○ وجعلنا من بین ایدیهم سدا و من خلفهم سدا فاغشینهم فهم لا یبصرون ○ وسواء علیهم ء انذرتهم ام لم تنذر هم لا یومنون ○

۷تا۱۰/۳۶۔ بے شک ان کی اکثریت پر عذاب کا حکم وارد ہو چکا' کیونکہ وہ ایمان نہیں لائے بے شک ہم نے ان کی گردنوں میں (غیر اللہ کی تقلید و اطاعت [۱] کے) طوق پڑے ہوئے پائے ہیں۔ [۲] (انہیں وہ خود اتارتے نہیں) پھر وہ طوق ان کی ٹھوڑیوں تک پہنچے ہوئے ہیں۔ اس لئے [۳] وہ سروں کو اوپر اٹھائے ہوئے ہیں۔ (یعنی ذاتی منفعت کوشیوں پر مشتمل غیر اللہ کی اطاعت کے طوق انہیں ربوبیت عامہ سے محروم افراد یعنی نچلی سطح کے لوگوں کے طرف دیکھنے ہی نہیں دیتے) اور ہم نے ان کے سامنے بھی (عوام کش نظریات کی) ایک دیوار کھینچی ہوئی پائی ہے اور ان کے پیچھے بھی ایک دیوار کھینچی ہوئی پائی ہے۔ [۴] اور انہیں (انفرادی منفعت کوشیوں کے دبیز) پردوں میں ڈھکا ہوا پایا ہے۔ [۵] اس لئے [۶] وہ نہیں دیکھتے۔ (اے رسول! ان حالات

---

[۱] ۱۵۷/۷ میں آیا ہے کہ رسول کریم یہی غیر اللہ کی تقلید و اطاعت کے طوق اتارتے تھے: **ویضع عنهم اصرهم والا غلال التی کانت علیهم** وہ رسول عربی لوگوں کے وہ بوجھ یعنی وہ طوق اتارتے ہیں جو ان پر پڑے ہوئے ہیں قرآن کریم اپنے **الحمد لله رب العلمین** کے اولین درس کے مطابق ربوبیت عامہ کا ایک ہی خدائی طوق پہناتا ہے۔ اس کے برعکس انفرادی منفعت کوشیوں کے غیر اللہ کی اطاعت کے طوق لوگ خود پہن لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہرگز نہیں پہناتا۔

[۲] ''ہم نے ان کی گردنوں میں طوق پڑے ہوئے پائے ہیں'' یہ الفاظ فعل ثلاثی مجرد کے خاصہ وجدان کی رو سے متن میں آمدہ لفظ جعلنا کا معنی ہیں۔

[۳و۶] واؤ کا معنی ہے اس لئے دلیل کے لئے دیکھئے حروف کی بحث عنوان نمبر ا ۳۱ کی شق نمبر ۸

میں) ان کے لئے برابر ہے کہ آپ انہیں ان کے اعمال کے خطرناک نتائج سے ڈرائیں یا نہ ڈرائیں' ایسے لوگ ایمان نہیں لائیں گے۔

اس سے آگے آیت مجیدہ ۲/۶ کا مفہوم افعال مجرد کے خاصہ وجدان کے قرآنی کلیہ کے مطابق ملاحظہ فرمائیں۔ آیت مجیدہ یہ ہے **ختم اللہ علی قلوبھم وعلی سمعھم وعلی ابصارھم غشاوۃ ولھم عذاب عظیم ○** ۲/۷۔ اللہ نے ان کے قلوب اور کانوں پر (ربوبیت کش نظریات کی) مہریں لگی ہوئی پائی ہیں۔ ۱ اور ان کی آنکھوں پر (ربوبیت کش عقائد کا) پردہ پڑا ہوا ۲ ہے۔ اس لئے وہ ضابطہ ربوبیت پر ایمان نہیں لاتے ان کے لئے بہت بڑا عذاب ہے۔

دیکھا آپ نے کہ:

قرآنی رہنمائی کے مطابق مجرد افعال کا خاصہ وجدان تسلیم کرنے سے اس خاصہ کے ترک کی بدولت ذاتِ باری پر وارد شدہ بڑے بڑے اعتراضات کے کوہِ گراں کس طرح چشم زدن میں پاش پاش ہو چکے ہیں۔ اب نہ خدا تعالیٰ ظالم ٹھہرتا ہے کہ خود ہی آگے پیچھے کی دیواریں بھی کھینچتا

(گزشتہ سے پیوستہ) ۴ "ہم نے دیوار کھڑی ہوئی پائی ہے"۔ خط کشیدہ الفاظ ثلاثی مجرد کے قرآنی خاصہ وجدان کی رو سے متن میں آمدہ لفظ جعلنا کا معنی ہیں۔

۵ اسی خاصہ کی رو سے "پس ہم نے انہیں ڈھکا ہوا پایا ہے"۔ یہ متن میں آمدہ فاغشیھم کا معنی ہیں یہاں اغشی کا فعل مزید فیہ باب افعال سے ہے جس کا خاصہ نسبت بماخذ اہل قواعد نے پہلے ہی تسلیم کیا ہوا ہے کہ جو وجدان ہی کے مترادف ہے۔

۱ "اللہ نے ..... مہریں لگی ہوئی پائی ہیں"۔ یہ ختم فعل ثلاثی مجرد کے خاصہ وجدان کی رو سے متن میں آمدہ الفاظ ختم اللہ کا معنی ہے۔

۲ "اور ان کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا ہے"۔ یہ معنی ہے "وعلی ابصارھم غشاوۃ" کا۔ یہ جملہ اسمیہ یہ خبر ہے اس کا جو معنی ہم نے لکھا ہے ترکیب نحوی کے مطابق سو فیصد صحیح ہے اور اللہ تعالیٰ سابقہ تراجم کے اس الزام سے سو فیصد بری ہے کہ خود ہی لوگوں کے قلوب واذہان اور کانوں پر مہریں لگا کر ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال کر ان کے آگے پیچھے دیواریں کھینچ کر خود گمراہ کرتا ہے اور خود ہی انہیں عذاب الیم کی وعید سناتا ہے۔

ہے اور عذاب عظیم کی وعید بھی سناتا ہے اور نہ قرآن کریم میں تضاد وتخالف ثابت ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ ایک طرف تو لا یظلم الناس کا اعلان کرتا ہے۔ کہ اللہ بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔ اور دوسری طرف خود قلوب واذہان پر مہریں لگا دیتا ہے کہ وہ ضابطہ خداوندی پر ایمان نہ لاسکیں اور عذاب الٰہی کے مستحق ٹھہریں۔ العیاذ باللہ!

۳۲/۲ فعل ماضی، مضارع کے معنوں میں:

اہل قواعد نے تسلیم کیا ہے کہ گیارہ صورتوں میں ماضی مضارع کا فائدہ دیتی ہے۔ اور اس پر قرآنی آیات مقدسات ہی کو بطور دلیل پیش کیا ہے:

۱۔ عطف ماضی بر مضارع: ☆ ویوم یعض الظالم علی یدیہ یقول یلیتنی اتخذت مع الرسول سبیلا ۲۵/۲۷۔ اور ظالم ہاتھ کاٹ کھائے گا۔ کہے گا کاش کہ میں اللہ کے رسول کے ساتھ اپنا راستہ بنا تا یہاں یقول فعل مضارع ہے جس پر قال ماضی کا عطف آیا ہے۔ اور وہ مضارع بن گیا ہے: وقال الرسول یرب ان قومی اتخذوا ھذا القران مھجورا ٥ ۲۵/۳۰۔ اور رسول مقبول کہیں گے کہ اے میرے پروردگار میری اس قوم نے قرآن کو اس طرح پکڑا ہوا تھا جس طرح چھوڑا ہوا ہوتا ہے۔

۲۔ ابتدائے کلام میں: ☆ ضرب اللہ مثلا رجلین ۱۶/۷۶۔ ضرب فعل ماضی ابتدائے کلام میں آکر مضارع بن گئی ہے۔ اللہ دو مردوں کا حال بیان کرتا ہے۔

۳۔ اسم موصول کے بعد آئے: ☆ ان الذین فرقوا دینھم وکانوا شیعا لست منھم فی شئی ۶/۱۵۹۔ الذین اسم موصول کے بعد فرقوا فعل ماضی آیا ہے۔ اس لئے مضارع بن گیا ہے۔ بیشک جو لوگ اپنے دین میں تفریق پیدا کر کے فرقے فرقے ہو جائیں گے۔ اے رسول! آپ کا ان کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔

۴۔ ندا کے بعد: ☆ یایھا الناس ضرب مثل ۲۲/۷۳۔ ضرب فعل ماضی یاایّھا حرف ندا کے بعد آیا ہے اس لئے مضارع بن گیا ہے: لوگو! ایک مثال بیان کی جاتی ہے۔ اسے غور کے ساتھ سننا۔

۵۔ لفظ حیث کے بعد: ☆ **واقتلوھم حیث ثقفتموھم** ۱۹۱/۲۔ **ثقفتموا** فعل ماضی حیث کے بعد آیا ہے اس لئے مضارع کا فائدہ دیتا ہے۔ بمعنی۔ تم ملک کے باغیوں کو جہاں پاؤ انہیں قتل کر دو۔

۶۔ لفظ **کلما** کے بعد: ☆ **کلما دخلت امة لعنت اختها** ۳۸/۷۔ جب بھی کوئی جماعت جہنم میں داخل ہوگی اپنے جیسی جہنمی جماعت پر لعنت کرے گی۔

۷-۸-۹-۱۰ شرط جزا اور ہر دو پر عطف: ☆ **ولو ان اھل الکتب آمنوا واتقوا لکفرنا عنھم سیاتھم ولا دخلنھم جنت النعیم** ۶۵/۵۔ اس آیت مجیدہ میں **امنوا، اتقوا، کفرنا** اور **دخلنا** چاروں فعل ماضی ہیں۔ پہلا اور تیسرا چونکہ حرف شرط لو کی بالترتیب شرط اور جزا ہیں۔ اور دوسرا، چوتھا چونکہ بالترتیب ان کے معطوف ہیں اس لئے مضارع کا فائدہ دیتے ہیں۔ اور آیت مجیدہ کا معنی یہ ہے کہ: اگر اہل کتاب ایمان لے آئیں اور قانونِ خداوندی کی مخالفت سے بچیں تو ان کی بدحالیاں دور کر دیں گے اور نعمتوں والے باغات میں داخل کر دیں گے۔

۱۱۔ جملہ دعائیہ میں: ☆ **وسیق الذین اتقوا ربھم الی الجنة زمرا حتی اذا جاء وھا وفتحت ابوابھا وقال لھم خزنتھا سلم علیکم طبتم** ۷۳/۳۹۔ جو لوگ اپنے ربوبیت کرنے والے کے ضابطہ ربوبیت کی مخالفت سے بچتے ہیں، قیامت کے دن جنت کی طرف گروہ در گروہ بھیجے جائیں گے جب وہ جنت پر پہنچیں گے۔ اور ان کے لئے اس کے دروازے کھولے جائیں گے تو جنت کا خازن کہے گا کہ تم پر سلامتی ہو۔ تم خوش رہو۔ **طبتم** فعل ماضی ہے جو دعائیہ انداز میں آ کر مضارع بن گیا ہے۔

۳۲/۳ فعل مضارع ماضی کے معنوں میں۔

جس طرح فعل ماضی بعض صورتوں میں مضارع کا فائدہ دیتا ہے اسی طرح فعل مضارع بعض صورتوں میں ماضی کا فائدہ دیتا ہے:

۱۔ ماضی کا قصہ بیان کرتے ہوئے: ☆ **وکذالک مکنا لیوسف فی الارض یتبوا منھا حیث یشاء** ۵۶/۱۲۔ اور مذکورہ بالا طریقے سے ہم نے یوسف کو سرزمین مصر میں اقتدار

ماضی عطا فرمایا وہ جہاں چاہتا تھا قیام کرتا تھا۔ دیکھئے یہاں **یتبوا** اور **یشاء** دونوں فعل مضارع ہیں۔ لیکن چونکہ زمانہ ماضی کا قصہ یوسف بیان کرنے میں وارد ہوئے ہیں۔ اس لئے ماضی کا فائدہ دیتے ہیں۔ ایسے افعال مضارع کو مضارع حکائی کہتے ہیں۔

۲۔ مضارع کا عطف ماضی پر: ☆ **وما کنت لدیھم اذا جمعوا امرھم وھم یمکرون** ٥ ۱۲/۱۰۲۔ اے رسول! جس وقت یوسف کے بھائی اس کے خلاف اپنی مہم پر اکٹھے ہوئے اور وہ بری تجویز کر رہے تھے اس وقت آپ ان کے پاس موجود نہیں تھے۔ **یمکرون** فعل مضارع کا عطف چونکہ **اجمعوا** فعل ماضی پر آیا ہے۔ اس لئے ماضی بن گیا ہے۔ نیز اگر مضارع فعل ماضی کے ماتحت آئے تو بھی ماضی کا فائدہ دیتا ہے۔ خواہ عطف مذکور ہو خواہ نہ ہو۔

۳۔ مضارع پر **لم** داخل ہو: ☆ **لم یتخذ ولدا** ۱۷/۱۱۱۔ اللہ تعالیٰ نے بیٹا نہیں بنایا۔ **یتخذ** فعل مضارع پر **لم** داخل ہونے سے مضارع ماضی منفی بن گیا ہے۔

۴/۳۲۔ خدا تعالیٰ قیدِ مکان و زمان سے منزہ ہے۔

عربی سمیت ہر زبان کی گریمر میں ماضی، حال اور استقبال تین زمانے تسلیم کئے گئے اور سلسلہ کلام میں متکلم حاضر اور غائب کا لحاظ لازم قرار دیا گیا ہے۔ لیکن قواعد کی بحث میں قرآن فہمی کے لئے اس امر کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ خدا تعالیٰ چونکہ قیدِ مکان و زمان سے آزاد ہے۔ اس لئے ایک ہی آیت مجیدہ میں اپنے لئے بانداز ذیل متکلم کے صیغے بھی لاتا ہے اور غائب کے بھی:

وھوا لذی انزل من السماء ماء فاخرجنابه نبات کل شئی ۶/۹۹۔ وہ اللہ ہی ہے جو بلندی سے پانی نازل کرتا ہے پھر ہم اس کے ساتھ ہر چیز کی نباتات نکالتے ہیں۔ دیکھئے یہاں اپنے لئے غائب کا صیغہ استعمال کیا ہے انزل اور متصل ہی متکلم کا صیغہ لایا گیا ہے اخرجنا۔

اسی طرح ایک ہی آیت میں اپنے لئے بانداز ذیل مخاطب کا صیغہ بھی لایا جاتا ہے اور غائب کا بھی: **ربنا انک جامع الناس لیوم لاریب فیه ان اللہ لا یخلف المیعاد** ٥ ۳/۹۔ دیکھئے! یہ راسخون فی العلم کی دعا ہے جسے اپنے الفاظ میں بیان فرمایا ہے اس میں پہلے اپنے لئے

انک ضمیر مخاطب لائی گئی ہے۔اور پھر غائب کا صیغہ آیا ہے ان اللہ لا یخلف المیعاد حالانکہ اندازِ کلام کے مطابق ہونا چاہیے انک لا تخلف المیعاد۔پس قرآن فہمی کے لیئے اسلوب قرآنیہ کے ضمن میں یاد رکھیے گا چونکہ اللہ تعالیٰ قیدِ زمان و مکان میں مقید نہیں ہے۔اس لئے اپنے لئے حاضر غائب اور متکلم تینوں صیغے لائے جاتے ہیں۔

۳۲/۵۔کلماتِ حصر:

قرآنِ کریم میں حصر کے متعدد طریقے مذکور ہیں:

ا۔ حصر بذریعہ نفی اثبات:☆ لا اله الا الله ۱۹/۴۷۔نہیں ہے کوئی بھی الٰہ موجود سوائے اللہ کے۔ ان الحکم الا الله ۶/۵۷+۱۲/۴۰۔نہیں ہے حکم کسی کا سوائے حکم اللہ کے قرآنِ کریم میں یہ چوٹی کا حصر ہے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اپنی وحدت کی وضاحت فرمائی ہے کہ شرک فی الحکم بھی شرک فی الذات ہی کے برابر ہے چنانچہ شرک کے متعلق فیصلہ دیدیا ہے کہ ہرگز ہرگز معاف نہیں کیا جائے گا: ان اللہ لا یغفر ان یشرک به و یغفر مادون ذلک لمن یشاء ۴/۴۸+۴/۱۱۶۔

۲۔ حصر بذریعہ انما و انما:☆ قل انما انا بشر مثلکم ۱۸/۱۱۰۔اے رسول کہہ دیجیے گا اِسوائے اس کے اور کوئی بات نہیں (یعنی سو فیصد امر یہ ہے) کہ میں تمہارے جیسا ہی ایک بشر ہوں قرآنی قواعد میں یہ حصر بھی انتہائی محکم مانا گیا ہے۔لیکن افسوس ہے کہ اہل اسلام کے بعض گروہوں کا آنحضور کو بشر تسلیم نہ کرنا انما کے محکم حصر کو بیکار کر کے حرف آنحضور کے حصارِ بشریت ہی کو نہیں توڑ دیتا' بلکہ اس سے خدا تعالیٰ کی الوہیت بھی معاذ اللہ مشکوک ہو کر رہ جاتی ہے کیونکہ اس آیت کے اگلے الفاظ میں ارشاد ہوا ہے: انما الهکم اله واحد ۱۸/۱۱۰۔سوائے اس کے اور کوئی بات نہیں کہ تمہارا الٰہ واحد ہے۔دیکھیے! جس حصر کے ساتھ آنحضور کی بشریت کا اعلان کیا گیا ہے۔اسی کے ساتھ خدا تعالیٰ کی الوہیت بیان ہوئی ہے پس جبکہ خدا تعالیٰ کا حصارِ الوہیت ہرگز ہرگز نہیں ٹوٹ سکتا اس لئے آنحضور کے حصارِ بشریت میں بھی شگاف ممکن نہیں۔

۳۔ حصر بذریعہ ضمیر مقدم:☆ ایاک نعبد و ایاک نستعین ۱/۴۔اے اللہ! ہم صرف

تیری ہی فرمانبرداری کرتے ہیں اور صرف تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔ قرآنی قواعد میں ضمیر مقدم کے حصر کو بھی نفی اثبات اور انما کے برابر کا درجہ حاصل ہے یہ اس لئے:

کیونکہ جس طرح ان الحکم الا اللہ میں اطاعت و فرمانبرداری کو نفی اثبات کے ذریعہ صرف خدا تعالیٰ کے لئے مختص کر دیا گیا ہے اسی طرح ضمیر مقدم کے حصر ایاک نعبد میں بھی اکیلے خدا تعالیٰ کی فرمانبرداری کا اقرار لیا گیا ہے۔ اسی طرح ضمیر مقدم ھو اللہ احد ۱۱۲/۱ میں احدیت کو صرف اللہ ہی کے لئے مختص کیا گیا ہے۔

۴۔ حصر بذریعہ جار مجرور مقدم: ☆ للّٰہ ما فی سموت و ما فی الارض ۱۳۱۔۱۳۲/۴۔ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ بھی ہے وہ سب اللہ تعالیٰ ہی کی ملکیت ہے۔ یہ حقیقت کسی فرد و بشر سے مخفی نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی اس ملکیت میں غیر اللہ کا ہرگز ہرگز اشتراک نہیں ہے افسوس ہے کہ اس حصر ہی کو نظر انداز کرنے کا نتیجہ ہے کہ غیر متوازن تقسیم رزق کو خدائی تقسیم تسلیم کر لیا گیا ہے۔ حالانکہ جب خدا تعالیٰ نے حصر کے ساتھ اعلان کر رکھا ہے کہ زمین و آسمان کی ہر چیز میری ہے تو اس کی ملکیت پر ضروریات سے زائد انسانی ملکیت کا تصور کس طرح پیدا ہو سکتا ہے؟

۶/۳۲ تنوین عہدی ذکری' اور تنوین مضاف' یا عوض مضاف الیہ۔

عربی قواعد میں الف لام عہدی ذکری' اور بدل الاضافت کے علاوہ اگرچہ تنوین عہد ذکری اور بدل الاضافت بھی مسلم ہے لیکن عام تراجم میں تنوین کے ان اوصاف کا لحاظ بہت کم رکھا گیا ہے۔ قرآن فہمی کے لئے جس طرح الف لام کے مذکورہ اوصاف کا لحاظ رکھنا لازم ہے' اسی طرح تنوین کے مذکورہ اوصاف کو بھی ذہن نشین کرنا ضروری ہے۔ یعنی جس طرح ۱۲/۵۰ میں فلما جاءہ الرسول میں الرسول کا الف لام عوض مضاف الیہ ہے۔ مضاف الیہ الملک ہے اور الرسول سے مراد رسول الملک ہے رسول اللہ نہیں۔ اسی طرح ۶۱/۶ میں مبشرا برسول کے لفظ رسول کی تنوین عوض مضاف الیہ ہے۔ اور رسول سے مراد رسول اللہ ہے۔

نیز جس طرح فمن شھد منکم الشھر فلیصمہ ۲/۱۸۵ میں الشھر لام عہدی ذکری' اور اس سے مراد رمضان کا مہینہ ہے کیونکہ اسی آیت میں الشھر کا نام ماقبل مذکور ہے شھر

رمضان اسی طرح تنوین عہدی ذکری بھی ہوتی ہے۲/۵ میں اس قوم کا ذکر کر کے جس نے مسلمانوں کو مسجد حرام سے روک دیا تھا صحابہ کو حکم دیا گیا کہ اقتدار میسر آنے پر ان کی دشمنی تمہیں اس چیز کا مجرم نہ بنادے کہ تم ان سے انصاف نہ کرو: **ولا یجرمنکم شنان قوم ان صدوکم عن المسجد الحرام** ... الخ ۲/۵۔ اور ۸/۵ میں اسی قوم کے لئے تاکیدی طور پر ارشاد ہوا ہے: **ولا یجرمنکم شنان قوم علی الا تعدلوا** یہاں قوم کی تنوین عہدی ذکری ہے یعنی وہ قوم جس نے مسجد حرام سے روک دیا تھا۔

۷/۳۲۔ بسم اللہ شریف بھی قرآن کریم کی آیت ہے۔

بسم اللہ شریف کے متعلق یہ تصور غلط ہے کہ یہ قرآنِ مجید کی آیت نہیں۔ بلکہ ۱۵/۹ **انا لہ لحفظون** کے خداوندی دعویٰ کے مطابق بسم اللہ شریف بھی قرآن کریم کا حصہ ہے نزولی ہے اضافی نہیں۔ اور قرآنِ کریم کی آیت مجیدہ ہے۔

بسم اللہ شریف بظاہر جملہ ناقص ہے تام نہیں۔

غیر مسلموں کا قرآنِ کریم پر اعتراض ہے کہ اس کا بالکل ابتدائی جملہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ نامکمل فقرہ ہے۔ کیونکہ جملہ ہوتا ہے فاعل، فعل اور مفعول کے ساتھ۔ لیکن اس میں فعل ہی غائب ہے غور فرمائیں بسم اللہ شریف کے پانچ لفظ ہیں۔ ب، اسم، اللہ، رحمان اور رحیم ب حرف جار ہے۔ اسم، اسم نکرہ ہے۔ اللہ اسم علم ہے۔ رحمان اور رحیم دونوں اسم صفت ہیں۔ اب چونکہ اس جملے میں فعل کوئی نہیں۔ اس لئے گریمر کی رو سے یہ جملہ ناقص ہے تام نہیں لیکن ترکیب نحوی اور قواعد عرب کا قاعدہ کلیہ ہے کہ جہاں فعل مذکور نہ ہو وہاں جار مجرور، فعل محذوف کے متعلق ہوتا ہے۔ اور قرآن کی رو سے فعل محذوف خود بخود نکھر کر عیاں ہو جاتا ہے۔ جملہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا فعل محذوف ترکیب نحوی میں ملاحظہ فرمائیں۔

☆ ب حرف جار ہے۔ ☆ اسم مجرور ہے اپنے ماقبل مذکور حرف جا ''ب'' کا۔ اور مضاف اپنے مابعد مذکور لفظ اللہ کا۔ ☆ اللہ مضاف الیہ ہے اپنے ماقبل مذکور لفظ اسم ''جا'' اور موصوف ہے

اپنے مابعد مذکور پر دو الفاظ' رحمان اور رحیم کا- رحمان اور رحیم دونوں صفتیں ہیں' اپنے موصوف اللہ کی اللہ موصوف اپنی ہر دو صفات رحمان اور رحیم کے ساتھ مل کر مضاف اسم کا۔ مضاف مضاف الیہ مل کر مجرور ہوئے ب کے۔ اور جار مجرور مل کر متعلق ہوئے فعل محذوف۔ اب قرآن کریم کی ابتدا ہی میں بسم اللہ شریف میں فعل محذوف کے بعد چونکہ مذکور ہے" الحمد الله رب العلمين " ۔ اور چونکہ جملہ الحمد الله رب العلمين صرف کہنے یا پڑھنے کی چیز ہے۔ اس لئے یہاں فعل محذوف قل یا اقرار روز روشن کی طرح نکھر کر عیاں ہو رہا ہے۔ یعنی پڑھ تو اے رسول! یا کہہ تو اے رسول! اعلان کر دے تو اے رسول! کہ پوری کی پوری حمد و ستائش اللہ تعالی کے لئے ہے جو جملہ عالمین کے لئے سامان ربوبیت پیدا کرنے والا ہے۔

اس سے آگے اس حکمتِ بالغہ کی طرف غور فرمائیں کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم میں فعل مذکور کیوں نہیں لایا گیا' محذوف کیوں رکھا گیا ہے؟ یاد رہے کہ بسم اللہ شریف وہ پاکیزہ جملہ ہے کہ ہر کام اس کے ساتھ شروع کیا جاتا ہے لہذا اس میں فعل محذوف اس لئے رکھا گیا ہے کہ ہر موقعہ اور مقام پر الگ الگ افعال محذوف خود بخود متصور ہوتے چلے جائیں مثلاً آنحضور سلام علیہ پر جب یہ جملہ نازل ہوا تو مفہوم تھا' پڑھ یا کہہ الحمد رب العلمین۔ اور جب حضور نے اس حکم کی تعمیل فرمائی تو محذوف نکلا میں پڑھتا ہوں میں کہتا ہوں میں اعلان کرتا ہوں "الحمد لله رب العلمين"۔

اب چونکہ ہر کام کی ابتداء بسم اللہ شریف سے ہوتی ہے اس لئے جب ہم کھانا کھاتے وقت بسم اللہ پڑھتے ہیں تو مفہوم ہوتا ہے" پیتا ہوں اللہ رحمان و رحیم کے نام کے ساتھ" جب عورتیں بسم اللہ پڑھ کر مختلف کام کرتی ہیں یعنی آٹا گوندھتی ہیں' دودھ بلوتی ہیں' مکھن نکالتی ہیں' روٹیاں پکاتی ہیں' تو ہر مقام پر الگ الگ مفہوم ہوتے ہیں۔ کہ آٹا گوندھتی ہوں اللہ رحمان رحیم کے نام کے ساتھ' دودھ بلوتی ہوں اللہ رحمان رحیم کے نام کے ساتھ مکھن نکالتی ہوں اللہ رحمان رحیم کے نام کے ساتھ۔

۳۳۔جمع القرآن

۱/۳۳ جمع قرآن تفاسیر کے آئینے میں۔

قرآن فہمی کے راستے میں ایک بڑی رکاوٹ یہ عقیدہ بھی ہے جو قرآن کریم کے متعلق مسلمانوں کو وراثتاً ملتا چلا آ رہا ہے کہ جب رسول اکرم کی وفات ہوئی تو قرآن کریم ابھی کتابی شکل میں نہیں آیا تھا۔ بلاترتیب پراگندہ صورت میں ہڈیوں پتوں اور چمڑے کے ٹکڑوں پر لکھی ہوئی کچھ آیتیں کسی صحابی کے پاس تھیں اور کچھ آیتیں کسی کے پاس آخر[1] جب جنگ یمامہ میں بہت سے حافظ شہید ہو گئے۔ تو حضرتِ ابوبکرؓ نے حکم دیا قرآن کو جمع کیا جائے۔

چنانچہ حضرتِ عثمانؓ کو قرآن کریم کے جمع وترتیب کی خدمت سپرد کی گئی۔ انہوں نے اپنی نگرانی میں یہ کام حضرتِ زیدؓ سے کروایا۔ جنہوں نے انتہائی عرق ریزی کے ساتھ آیت آیت کر کے جمع کیا۔ لیکن جب اس طرح تلاشِ بسیار کے بعد قرآنِ کریم جمع ہو گیا تو حضرتِ زیدؓ کا کہنا ہے کہ دو آیتیں کم تھیں ایک آیت سورہ توبہ کی اور ایک سورہ احزاب کی جو مزید تلاش کے بعد حضرت خزیمہ بن ثابت انصاری کے گھر سے ملیں۔[2]

---

[1] ہمارے اس بیان میں قرآن محل کراچی کی مطبوعہ مترجم بخاری شریف جلد دوم صفحہ ۹۸۹ سطر ۲۷۔۲۸ پر حضرت زید صحابیؓ کی طرف منسوب کردہ یہ الفاظ شاہد ہیں کہ: "حضرت ابوبکرؓ نے مجھ سے کہا کہ تم ایک جوان آدمی ہو۔ تم کو متہم بھی نہیں کر سکتے اور اور تم رسول اللہ سلام علیہ کے لئے وحی لکھتے تھے۔ اس لئے قرآن کو تلاش کر کے جمع کرو"۔

[2] اس بیان کی تصدیق مذکورہ بخاری شریف جلد دوم کے صفحہ ۹۹۰ پر موجود ہے۔

حضرت زیدؓ کہتے ہیں: میں قرآن کو کھجور کے پتوں، پتھر کے ٹکڑوں اور لوگوں کے سینوں سے جمع کرنا شروع کیا۔ یہاں تک سورہ توبہ کی آخری آیت میں نے ابوخزیمہ انصاری کے پاس پائی۔ صفحہ ۹۹۱ پر حضرت زیدؓ ہی کی طرف سے منسوب کردہ الفاظ ہیں: میں مصاحف کو نقل کرتے وقت سورہ احزاب کی ایک آیت نہ پائی ہم نے اسے تلاش کیا تو وہ آیت مجھے حضرت خزیمہؓ بن ثابت انصاری کے پاس ملی۔

۳۳/۲۔ قرات کے اختلافات تفاسیر کی رو سے۔

یہ تو ہوئی روایات کی رو سے جمع القرآن کی صورت! اب اس کی قرات کی حالت ملاحظہ فرمائیں:

قرآنِ کریم کی قرات کے متعلق یہ تصور دیا گیا ہے کہ رسول اکرم سلامٌ علیہ کے زمانے میں قبیلے قبیلے کی قرات قرآن میں بھی اختلافات موجود تھے۔ چنانچہ جب اپنے دور خلافت میں حضرت عثمانؓ صحیفہ حفصہؓ سے نقل کروانے لگے۔ تو حضرت زید بن ثابتؓ ' عبداللہ بن زبیرؓ سعید بن عاص اور عبدالرحمٰن بن حارث بن ہشام کو حکم دیا تو ان لوگوں نے اس کو مصاحف میں نقل کیا۔ اور حضرت عثمانؓ نے ان تینوں قریشیوں کو کہا کہ جب تم میں اور زید بن ثابتؓ میں کہیں (قرات) قرآن میں اختلاف ہو تو اس کو قریش کی زبان میں لکھو"۔ (بخاری شریف مترجم مطبوعہ قرآن محل کراچی جلد دوم صفحہ ۹۹ ـ ۹۹۱)

۳۳/۳-اعراب کا اختلاف:

محترم مودودی صاحب نے ترجمان القران جون ۱۹۵۹ء کے صفحہ ۴۵ پر لکھا ہے کہ: ''جس رسم الخط میں ابتدا نبی صلعم نے وحی کی کتاب کرائی تھی اور جس میں حضرت ابو بکرؓ نے پہلا مصحف مرتب کرایا اور حضرت عثمانؓ نے جس کی نقل بعد میں شائع کرائی اس کے اندر نہ صرف یہ کہ اعراب نہ تھے۔ بلکہ نقطے بھی نہیں تھے کیونکہ اس وقت یہ علامات ایجاد نہ ہوئی تھیں''۔ آپ نے لکھا ہے کہ اعراب اور نقطے دورِ بنوامیہ میں حجاج بن یوسف نے لگوائے تھے۔ بالفاظ دیگر تاثر یہ دیا گیا ہے کہ زمانہ رسالت وخلافت میں ہر قبیلہ اپنی اپنی منشاء کے اعراب اور ان کے نقطے پڑھا کرتا تھا العیاذ باللہ! لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب اعراب اور نقطے' جو قرات کے اختلافات کو ختم کرنے کا واحد ذریعہ ہیں' حضرت عثمانؓ نے ان کے بغیر قراتِ کے اس مشہور معروف اختلاف جس کی بنا پر آج بھی ایک فرقہ وضو میں پیروں کو دھوتا ہے اور ایک مسح کرتا ہے قریش کی زبان میں ارجلکم لکھوایا تھا یا ارجلکم بلکہ اعراب ونقاط کے بغیر اس لفظ کی شکل یہ ہے" ارحلکم"

المختصر! اقتباسات بالا سے واضح ہوا کہ مروجہ تفاسیر کی رو سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول اکرم

نے قرآنِ کریم کو کتابی شکل نہیں دی تھی- آپ نے اپنے زمانے میں کچھ کاتبوں سے وحی کی کتابت کروائی تھی- لیکن اس کی شکل یہ تھی کہ وہ ہڈیوں پتوں اور پتھروں پر لکھی ہوئی تھی پراگندہ صورت میں مختلف صحابہؓ کے ہاں پڑی ہوئی تھی- جسے حضرت عثمانؓ نے زیدؓ بن ثابت کے ذریعہ تلاش کروا کر جمع کیا- لیکن قرآنِ کریم اس نظریے کا مطلقاً حامل نہیں- وہ نہیں مانتا کہ وہ زمانہ رسالت میں ہڈیوں پتوں اور پتھروں پر لکھا ہوا پراگندہ اور بے ترتیب صورت میں پڑا ہوا تھا-

۴/۳۳- قرآن کہتا ہے کہ وہ زمانہ رسالت میں صحیح کتابی صورت میں باریک جھلی کے کاغذوں پر سطروار لکھا ہوا تھا-

ارشاد باری ہے:

والطور ہ وکتب مسطور ہ فی رق منشور ہ ۱ تا ۳/ ۵۲-

(مفہوم) اس کتاب کی شہادت ہے جو طور پر الواح میں لکھی گئی تھی ۱۴۵/ ۷- اور اس کتاب کی شہادت ہے جو جھلی کے کشادہ کاغذوں پر سطروار لکھی ہوئی ہے- اب بتایئے! قرآنِ کریم کی اس واضح شہادت کے بعد کیا یہ چیز تسلیم کی جا سکتی ہے کہ سرورِ عالم سلامٌ علیہ کے زمانے میں قرآنِ کریم ہڈیوں اور پتوں پر لکھا جاتا تھا- اور کیا ہڈیوں یا پتوں کے بھرے ہوئے ٹوکرے یا بوری کو کتاب کہا جا سکتا ہے؟

۵/۳۳- قرآنِ کریم کو خود رسول سلامٌ علیہ اکرم اپنے دستِ مبارک سے لکھا کرتے تھے-

ارشادی باری ہے:

وما کنت تتلوا من قبلہ من کتب ولا تخطہ بیمینک اذا لا رتاب المبطلون ہ ۴۸/ ۲۹-

(مفہوم) اے رسول! آپ اس کتاب قرآن کریم کے نزول سے پہلے نہ کسی کتاب کو پڑھا کرتے تھے- اور نہ کسی کتاب کو اپنے داہنے ہاتھ سے لکھا کرتے تھے-

غور فرمایئے گا! کہ اس آیت مجیدہ میں آپ کے متعلق عدم تلاوت اور عدم کتابت دونوں چیزوں کی تصور معطوف ' معطوف علیہ کی صورت میں نزولِ قرآنِ کریم سے پہلے کے متعلق دیا گیا ہے جس سے بالصراحت ثابت ہوا کہ رسولِ اکرم اس کتاب قرآنِ کریم کے نزول کے بعد اس کو پڑھا بھی کرتے تھے اور داہنے ہاتھ سے بھی لکھا کرتے تھے۔

۶/۳۳-قرآنِ کریم کا نسخہ امام۔

اور حضور سلام علیہ کے اپنے دستِ مبارک کا لکھا ہوا قرآنِ کریم ہی وہ نسخہ امام تھا' جو ہر وقت آپ کے پاس موجود رہتا تھا اور جس کی طرف اشارہ کر کے حضور سلام علیہ ارشاد فرمایا کرتے تھے:

واوحی الی ھذا القران ۱۹/۲۔

اور میری طرف یہ القرآن وحی کیا گیا ہے۔

غور فرمایئے گا! کہ ہذا اسم اشارہ قریب ہے جو موجود شے کے لئے آتا ہے۔ اگر قرآنِ کریم کتابی شکل میں موجود نہ ہوتا تو ہذا القرآن کے الفاظ کبھی نہ آتے۔ کیونکہ جب آپ یہ فرمایا کرتے تھے کہ میری طرف یہ قرآن وحی کیا گیا ہے۔ تو اگر قرآنِ کریم کا مکتوب نسخہ کتابی شکل میں آپ کے پاس موجود نہیں تھا تو مخاطب کہہ سکتے تھے کہ بتایئے گا وہ کون سا قرآن ہے جو آپ پر نازل ہوا ہے۔ تو اس وقت آپ کا جواب انتہائی مضحکہ خیز ہوتا اگر آپ ہڈیوں پتوں کے ٹوکرے کی طرف اشارہ فرماتے کہ میری طرف وحی کیا گیا ہے۔

۷/۳۳- قرآنِ کریم کے متعدد نسخے اس نسخہ امام سے روزانہ آپ کی نگرانی میں نقل ہوا کرتے تھے۔

قرآنِ کریم کی روزانہ کتابت کے متعلق خداوند تعالیٰ نے خود مخالفین رسول سلام علیہ کی شہادت پیش کی ہے:

وقالوا اساطیر الاولین اکتتبھا فھی تملی علیه بکرة واصیلا٥

۲۵/۵-

(مفہوم) اور مخالفین رسول کہتے ہیں کہ یہ قرآن پرانے لوگوں کی کہانیاں ہیں۔ جنہیں محمد

نے دل سے گھڑ کر خود لکھ لیا ہے- اور پھر یہ اس کی نگرانی میں صبح شام (یعنی روزانہ بدستور) املا کرایا جاتا ہے-

اس آیت مجیدہ میں رسول اکرم سلام علیہ کے متعلق مصدر اکتتاب کی خبر دی گئی ہے- عربی دان حضرات خوب جانتے ہیں کہ اس اکتتاب کا معنی ہے اپنے دل سے گھڑ کر اپنے ہاتھ سے لکھنا ہے یہ ہے آنحضور سلام علیہ کے نسخہ امام کے متعلق قرآنی شہادت کہ اسے تو آپ اپنے دستِ مبارک سے لکھا کرتے تھے- اور اس کے بعد اس نسخہ سے روزانہ آپ کی نگرانی میں املا کرائی جاتی تھی-[1] املا کا قاعدہ یہ ہے کہ ایک شخص بولتا جاتا تھا اور بہت سے لکھنے والے لکھتے جاتے تھے- نیز تملی علیہ کے الفاظ سے بالوضاحت ثابت ہے کہ یہ املا کا کام رسولِ اکرم کی نگرانی میں کیا جاتا تھا- یعنی املا کئے ہوئے نسخوں کی تحریر کو حضور خود ملاحظہ فرما کر ان کی تصحیح فرمایا کرتے تھے-[2]

الختصر! قرآنِ کریم کی اپنی شہادت کے مطابق وحی کی کتابت کا کام اس طرح ہوا کرتا تھا کہ جس قدر وحی نازل ہوتی اسے رسولِ اکرم خود دستِ مبارک سے نسخہ امام میں لکھا کرتے تھے- اور اس کے بعد اس نسخہ امام سے قرآنِ کریم کے متعدد نسخوں کی روزانہ املا جاری رہتی تھی- اس طرح خود رسولِ اکرم کی زندگی ہی میں آنحضرت کے امام نسخے کے علاوہ متعدد مزید نسخے تیار ہو چکے تھے- جنہیں آنحضرت نے اپنی سلطنت کے جملہ مراکز کے علاوہ بیرونِ سلطنت بھی بہت سے نسخے بھیج کر " یایھا الناس انی رسول اللہ الیکم جمیعا " ۱۵۸/۷ کے مقدس اعلان کی عملی تصدیق فرما کر ثابت کر دیا تھا کہ لوگو میں پوری نوعِ انسانی کی طرف رسول ہو کر آیا ہوں- ۸/۳۳

---

[1] اسی املا کی شہادت سورہ قلم میں موجود ہے: والقلم وما یسطرون ۱/۶۸- اے نبی! قلم اور قرآن کی شہادت سے جسے کاتب سطروار لکھتے ہیں-

[2] روایات کا کہنا ہے کہ حضور سلام علیہ ان پڑھ یعنی معاذ اللہ جاہل تھے لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے- حالانکہ ۳-۴/۹۶ میں حضور ہی کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے اقرا و ربک الاکرم ۰ الذی علم بالقلم- اے رسول! پڑھیئے گا! حقیقت یہ ہے کہ آپ کا رب کرم وہ ہے جس نے آپ کو قلم کے ساتھ تعلیم دی ہے- اب ظاہر ہے قلم کے ساتھ لکھنا ہی سکھایا جاتا ہے- قلم کے ساتھ گھڑ دوڑ یا تیر اندازی نہیں سکھائی جاتی-

آنحضرت سلام علیہ خود بھی حافظ قرآن تھے اور آپ نے متعدد مزید حافظ قرآن بنائے بھی تھے۔رسول اکرم کے حافظے کی یہ کیفیت تھی کہ نزول وحی کے ساتھ ہی قران کریم آپ کو حفظ ہو جاتا تھا جیسا کہ ارشاد باری ہے: سنقرئک فلا تنسی ۸۷/۶ "یقیناً ہم ہی آپ کو پڑھاتے ہیں پھر آپ ہرگز نہیں بھولتے" اس آیت مجیدہ کی شہادت کے مطابق حضور خود بھی حافظِ قرآن تھے۔اور مزید مومن حفاظ کی خبر آیت ذیل میں دی گئی ہے:

بل ھوایت بینت فی صدور الذین اوتوا العلم ۲۹/۴۹۔

(مفہوم) یہ قرآنِ کریم جو واضح آیات مجیدہ پر مشتمل ہے ان مومنوں کے صدورِ مبارک میں موجود و محفوظ ہے جنہیں علم (قرآنِ کریم) دیا گیا ہے۔[1] پس آیاتِ بالا سے ثابت ہوا کہ رسولِ اکرم نے قرآنِ کریم کو کتابی شکل میں محفوظ کر دیا تھا۔اسکے خود بھی حافظ تھے اور صحابہؓ کی اکثریت کو بھی حافظِ قرآن بنا دیا تھا۔

فلہٰذا ترجمہ و تفسیر زیرِ نظر میں اس قرآنی مسلمہ کو بھی سامنے رکھا گیا ہے کہ قرآنِ کریم زمانہ رسالت ہی میں موجودہ کتابی شکل میں محفوظ تھا۔اس کا متن اعراب' نقطے' وقفے اور ترتیب جو رسولِ اکرم کے دستِ مبارک کے لکھے ہوئے قرآنِ کریم کے نسخہ امام کی تھی۔اور جو خود رسولِ اکرم سلامؑ علیہ کے صدورِ پرنور میں موجود تھا۔

۹/۳۳۔ ترتیب قرآنِ کریم۔

مروجہ تفاسیر کا کہنا ہے کہ قرآن کریم کی موجودہ ترتیب حضرت عثمانؓ کی دی ہوئی ہے لیکن قرآنِ کریم اس نظریے کو بھی قبول نہیں کرتا سابقہ صفحات میں آیات قرآنی کی رو سے ثابت کیا جا چکا ہے کہ قرآن کریم کو خود رسول اکرم اس کے نزول کے ساتھ ہی ساتھ کتابی شکل میں لکھ لیا کرتے تھے' تو اس طرح حضرت عثمانؓ کے متعلق قرآنِ کریم کے جمع کرنے کا نظریہ ہی سرے سے غلط ہے۔کیونکہ آنحضرت نے قرآنِ کریم کو ایک سیکنڈ کے لئے بھی پراگندہ صورت میں نہیں چھوڑا

---

[1] زمانہ رسالت کے سارے مومن اولین اوتوا العلم تھے۔لیکن سب کے سب حافظِ قرآن نہیں تھے۔ان کے لئے بلا استثنیٰ جمع کا صیغہ آنا' صحابہ کرام میں حفاظ کی اکثریت کی خبر دیتا ہے۔

تھا-تو اس طرح جب قرآنِ کریم منتشر اور پراگندہ تھا ہی نہیں تو حضرت عثمانؓ یا کسی اور صحابیؓ کے جمع کرنے کا تصور تک ختم ہو جاتا ہے-

تو اب جبکہ ثابت ہو چکا کہ اسے خود رسولِ اکرم سلامٌ علیہ نے کتابی صورت دی تھی-تو اس کے بعد یہ سوال سامنے آتا ہے-کہ آنحضرت سلامٌ علیہ نے اسے کس ترتیب کے ساتھ لکھا تھا؟ اس کا جواب بھی نہایت آسان ہے کہ آپ نے اسے بالکل اسی ترتیب سے لکھا تھا جس ترتیب کے ساتھ خود آپ کے صدرِ مبارک میں محفوظ تھا اور جس ترتیب سے آپ نے صحابہؓ کے کثیر التعداد حفاظ کو حفظ کروا رکھا تھا-

یاد رہے کہ ترتیب کے بغیر کسی چھوٹی سی کتاب کو بھی حفظ نہیں کیا جا سکتا- چہ جائیکہ مروجہ تفاسیر کا دیا ہوا یہ تصور قبول کر لیا جائے قرآن کریم رسول اکرم اور کثیر التعداد صحابہؓ کو حفظ بھی تھا اور بے ترتیب بھی تھا-العجب ثم العجب-

۱۰/۳۳- حفظ ترتیب کا چولی دامن کا ساتھ ہے:

جس حالت میں یہ امر مسلم ہے کہ ترتیب کے بغیر حفظ ممکن نہیں-اور یہ امر بھی مسلم ہے کہ رسولِ اکرم اور متعدد صحابہؓ حافظ بھی تھے-تو بالصراحت ثابت ہو چکا کہ قرآنِ کریم کی ترتیب اس کے اولین حافظ خود رسول اکرم کے صدر مبارک میں بصورت حفظ موجود تھی اسی ترتیب کو آپ نے کتابی صورت میں بشکل مشہود لکھ کر محفوظ کر لیا-(حضور کے صدرِ مبارک میں قرآن کی ترتیب کس نے دی تھی-اس کا جواب عنوان ۱۱/۳۳ میں ملاحظہ فرمائیں-قرآنِ کریم آنحضور کی لکھی ہوئی کتاب ہے جس میں کوئی بڑے سے بڑا دشمن بھی زیر زبر تک میں تغیر و تبدل نہیں کر سکا کیونکہ اس کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لے رکھا ہے:

انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحفظون ۱۵/۹ -

تحفظِ ناموسِ رسالت و صحابہؓ:

روایات کا دیا ہوا یہ تصور کہ رسولِ مقبول نے اپنی زندگی میں قرآنِ کریم کو مرتب نہیں فرمایا تھا بلکہ اسے آیات کی صورت میں پراگندہ حالت میں چھوڑ گئے تھے' ناموسِ رسالت کو بہت بری

طرح داغدار کرتا ہے- کہ آپ کو جو ضابطہ حیات قیامت تک پوری نوع انسانی کے لئے دیا گیا تھا' آپ اس ضابطے کو اس پراگندہ حالت میں چھوڑ گئے- کہ معاذ اللہ! اسے آپکے بعد صحابہ رضی اللہ عنہ کو مرتب کرنا پڑا اور اس کے بعد پھر اس نظریہ کی بدولت ناموسِ صحابہؓ بھی محفوظ نہیں کیونکہ بقولِ روایات انہوں نے قرآنِ کریم کو اس طرح الٹ پلٹ کر رکھ دیا کہ جو آیت سب سے پہلے نازل ہوئی تھی اسے تیسویں پارہ میں رکھا اور جو سب سے اخیر پر اتری تھی' اسے کتاب کے ابتدائی میں رکھا- یا پھر معاذ اللہ معاذ اللہ نہ اعراب نہ نقطے یعنی صحابہؓ کے مرتب کردہ نسخہ ہائے قرآن کے الفاظ پر نہ صرف یہ کہ زیریں' زبریں نہیں تھیں بلکہ نقطے بھی نہیں تھے- دوسری طرف بخاری شریف میں مذکور ہے کہ آنحضور سلام علیہ کا ارشاد ہے قرآن کریم سات قراءتوں پر نازل ہوا ہے یعنی اس کی سات قسم کی زیریں' زبریں نازل ہوئی تھیں العیاذ باللہ!

۱۱/۳۳-قرآنِ کریم کی ابتدا کہاں سے ہوئی؟

روایات کا کہنا ہے کہ سب سے پہلے سورہ علق کی ابتدائی آیات کریمات کا نزول ہوا تھا- چنانچہ بخاری شریف مطبوعہ قرآن محل کراچی جلد اول کی کتاب الوحی صفحہ ۱۸ پر حضرت حارث بن ہشامؓ کی روایت درج ہے کہ انہوں نے رسول سلامؑ علیہ سے دریافت کیا کہ آپ کے پاس وحی کس طرح آتی ہے تو رسول اللہ نے فرمایا کہ کبھی میرے پاس گھنٹی کی آواز کی طرح آتی ہے اور وہ مجھ پر بہت سخت ہوتی ہے- اور جب میں اسے یاد کر لیتا ہوں جو اس نے کہا تو وہ حالت مجھ سے دور ہو جاتی ہے حضرت عائشہؓ نے بیان کیا کہ میں نے سخت سردی کے دنوں میں آپ پر وحی نازل ہوتے ہوئے دیکھا پھر جب وحی موقوف ہو جاتی تو آپ کی پیشانی سے پسینہ بہنے لگتا-

آگے بڑھنے سے پہلے روایت بالا پر قرآنِ کریم کی روشنی میں غور فرمالیں:

۱- ۲/۹۷ میں ارشاد ہوا ہے: ☆ فانہ نزلہ علی قلبک -پس بلاشبہ (جبریل............ایک مخصوص ملک جو انبیاء سلام علیہم پر صحفِ ربانی پہنچانے کے لئے مقرر کیا گیا تھا) قرآنِ کریم کو آپ کے قلبِ اطہر پر نازل کرتا تھا لیکن گھنٹی کی آواز کانوں سے سنی جاسکتی ہے قلب سے نہیں- فلہٰذا وحی الٰہی کے گھنٹی اور گھڑیال کی صورت میں نازل ہونے کا تصور قرآن کریم کے خلاف ہے-

۲- دوسرے نمبر پر سورہ طٰہٰ میں ارشاد ہوا: ☆ ما انزلنا علیک القرآن لتشقی ٥ ۲۰/۲- ہم نے آپ پر قرآن اس لئے نازل نہیں کیا کہ آپ سختی یا تکلیف پڑ جائیں فلہٰذا آپ کے لئے نزولِ وحی کا موجب تکلیف ہونا بھی قرآنِ کریم کے خلاف ہے۔

۳- تیسرے نمبر پر خدا تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: سنقرئک فلا تنسیٰ ۸۷/۶- بے شک ہم آپ کو پڑھاتے ہیں پھر آپ بھولتے نہیں۔ اس آیت مجیدہ کی رو سے آنحضور وحی نازل ہوتے ہی حافظ ہو جایا کرتے تھے فلہٰذا آپ کے لئے قرآنِ کریم حفظ کرنے کی تکلیف و مشقت کے نظریہ کا بھی قرآنِ کریم حامل نہیں۔

۴- چوتھے نمبر پر وحی کے وقت زور سردی کے دنوں میں پسینہ کا آ جانے کا تصور بھی ۲۰/۲ کے خلاف ہے۔ جس میں کہا گیا ہے کہ ہم نے قرآن کریم کو اس لئے نازل نہیں کیا کہ آپ کے لئے موجبِ تکلیف ہو۔ حالانکہ ظاہر ہے کہ زور سردیوں میں پسینہ معمولی مشقت میں نہیں آتا۔ بلکہ انتہائی جانکاہ مشقت کے بعد ہی آتا ہے اب آگے بڑھیے:

حضرت عائشہؓ ہی کی روایت سے صفحہ نمبر ۸۲ پر منقول ہے کہ: سب سے پہلی وحی جو رسول اللہ پر اترنی شروع ہوئی وہ اچھے خواب تھے جو بحالتِ نیند آپ دیکھتے تھے۔ چنانچہ جب بھی آپ خواب دیکھتے تو صبح کی روشنی میں ظاہر ہو جاتا۔ پھر تنہائی سے آپ کو محبت ہو گئی۔[۱] اور غارِ حرا میں تنہا رہنے لگے۔[۲] اور قبل اس کے گھر والوں کے پاس آنے کا شوق ہو۔ وہاں تحنث کیا کرتے۔

۱-۲ اس روایت سے غارِ حرا میں خلوت گزینی کا نظریہ حضور کی طرف رہبانیت پسندی کا انتساب کرتا ہے۔ جو آپ پر بہتان محض ہے کیونکہ آنحضور کی قبل نبوت کی زندگی کے متعلق سورہ نجم میں بتایا گیا ہے: ما ضل صاحبکم وما غوی ۵۳/۲- لوگو! آپ کا ساتھی نہ گمراہ ہوا ہے نہ بہک گیا ہے۔ اس آیت سے ثابت ہوتا کہ آپ نوعِ انسانی کے دکھ سکھ کے ساتھی تھے۔ اور یہ ساتھ کنجِ تنہائی میں بیٹھنے کا نام نہیں۔ معاشرہ کے دکھیا انسانوں کی خدمت کرنے کا نام ہے۔ آپ کی صحیح تعریف تو روایت بالا کے الفاظ میں بھی موجود ہے کہ آپ کنجِ تنہائی میں رہبانیت کے عامل نہیں تھے بلکہ صلہ رحمی فرماتے تھے ناتوانوں کے بوجھ اٹھاتے تھے۔ محتاجوں کے لئے کماتے تھے اور مہمانوں کی مہمان نوازی کرتے تھے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ اعمال کسی کنجِ تنہائی میں سرانجام نہیں دیئے جا سکتے بلکہ معاشرہ میں ناتوانوں اور محتاجوں کی شبانہ روز خدمت کرنے سے انجام پذیر ہوتے ہیں۔

تحنث سے مراد ہے کئی راتیں عبادت کرنی - اوراس کے لئے توشہ لیتے - یہاں تک کہ جب وہ غار حرا میں تھے حق آیا - چنانچہ ان کے پاس فرشتہ آیا اور کہا پڑھ آپ نے فرمایا کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں - ۳؎ آپ بیان کرتے ہیں کہ مجھے فرشتے نے پکڑا - اور مجھے زور سے دبایا - یہاں تک کہ مجھے تکلیف محسوس ہوئی پھر مجھ کو چھوڑ دیا اور کہا پڑھ - میں نے کہا پڑھا ہوا نہیں ہوں - پھر دوسری بار مجھے پکڑا زور سے دبایا - یہاں تک کہ میری طاقت جواب دینے لگی - پھر مجھے چھوڑا اور کہا پڑھ - میں نے کہا میں پڑھا ہوا نہیں ہوں آپ فرماتے ہیں پھر تیسری بار پکڑ کر مجھے زور سے دبایا پھر چھوڑ دیا اور کہا پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے انسان کو بستہ خون سے پیدا کیا - پڑھ اور تیرا رب سب سے بزرگ ہے - رسول اللہ سلام علیہ نے اس کو دہرایا - اس حال میں آپ کا دل کانپ رہا تھا - چنانچہ حضرت خدیجہؓ بنت خویلد کے پاس آئے اور فرمایا مجھے کمبل اوڑھا دو مجھے کمبل اڑھا دو تو لوگوں نے کمبل اڑھا دیا - یہاں تک کہ آپ کا ڈر جاتا رہا - حضرت خدیجہؓ سے سارا واقعہ بیان کیا - مجھے اپنی جان کا ڈر ہے حضرت خدیجہؓ نے کہا کہ ہرگز نہیں - خدا کی قسم اللہ تعالیٰ آپ کو کبھی بھی رسوا نہیں کرے گا - آپ صلہ رحمی کرتے ہیں - ناتوانوں کا بوجھ اپنے اوپر لیتے ہیں - محتاجوں کے لئے کماتے ہیں - مہمان کی مہمان نوازی کرتے ہیں - اور حق کی راہ میں مصیبتیں اٹھاتے ہیں - پھر حضرت خدیجہؓ آپ کو لیکر ورقہ بن نوفل بن اسد بن عبدالعزیٰ کے پاس لے گئیں - جو حضرت خدیجہؓ کے چچازاد بھائی تھے .... الخ

قرآنِ کریم قیامت تک کی پوری نوعِ انسانی کے لیے مکمل ہدایت ہے-

افغیر الله ابتغی حکما وھوا لذی انزل الیکم الکتب مفصلا ۱۱۴/۶-۱ اے رسول کہہ دیجیے گا! کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور حاکم تلاش کروں حالانکہ اس لئے اپنا حکم نامہ تمہاری طرف ایک مفصل کتاب کی صورت میں نازل کر دیا ہے - ونزلنا علیک الکتب تبیانا لکل شی وھدی ورحمة وبشری للمسلمین ۞ ۱۶/۸۹-۱ اے رسول! ہم نے آپ پر اپنی کتاب نازل فرمائی ہے جو ہر چیز کھول کھول کر بیان کرنے والی ہے اور فرمانبرداروں کے لئے ہدایت و رحمت اور بشارت ہے-

اولم یکفھم انا انزلنا علیک الکتب یتلی علیھم ان فی ذلک لرحمة

وذکری لقوم یومنون ٥ ٥١/ ٢٩-اور اے رسول! کیا لوگوں کے لئے یہ کافی نہیں کہ ہم نے آپ پر اپنی کتاب نازل کردی ہے جو ان پر پڑھی جاتی ہے بے شک اس میں ماننے والوں کے لئے رحمت اور نصیحت موجود ہے-

آیات بالا میں صراحتاً بتا دیا گیا ہے کہ قرآنِ کریم مکمل تبیان' ہدایت' رحمت' بشارت' نصیحت اور کافی ہونے کے ساتھ ساتھ قیامت تک کے لوگوں کے لئے ضابطہ حیات بھی یہی ہے- جب تک آنحضور بنفس نفیس زندہ رہے لوگوں کو صرف اس قرآن کے ساتھ ہی ان کے فرائض منصبی سے آگاہ کرتے رہے- اور آپ کے بعد ہر اس مبلغ پر قرآن ہی کے ساتھ لوگوں کو ان کے فرائض سے آگاہ کرنا فرض ٹھہرایا گیا ہے جس تک یہ پہنچا رہے- اب چونکہ اس کی حفاظت کو خود خدا تعالیٰ نے اپنے ذمہ لے رکھا ہے انا نحن نزلنا الذکر و انا لہ لحفظون ٥ اس لیے یہ امر ممکن ہی نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں قرآنِ کریم مرورِ زمانہ کے ہاتھوں ضائع یا کم ہو جائے پس ظاہر ہے کہ یہ قیامت تک کے لئے اسی طرح محفوظ رہے گا- جس طرح چودہ سو سال سے آج تک محفوظ ہے کہ مخالف قومیں اس کی زیر زبر تک کو نہ ضائع کر سکی ہیں اور نہ ان میں کوئی معمولی سی تبدیلی لا سکی ہے-

باقی انبیاء اپنی اپنی قوم کی طرف مبعوث کئے گئے تھے لیکن صاحب قرآن کو پوری نوعِ انسانی کی طرف بھیجا گیا تھا-

ولقد ارسلنا نوحا الی قومہ ٥٩/ ٧ بلاشبہ ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف (رسول بنا کر) بھیجا-

والی ثمود اخاھم صلحا ٧٣/ ٧ اور قوم ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح کو بھیجا-

والی مدین اخاھم شعیبا ٨٥/ ٧- اور اہل مدین کی طرف ان کے بھائی شعیب کو بھیجا-

ثم بعثنا من بعدھم موسی با اتینا الی فرعون و ملائہ-

پھر ان کے بعد ہم نے موسیٰ کو اپنی آیتوں کے ساتھ فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف

مبعوث فرمایا۔

واذقال عیسی ابن مریم یبنی اسرائیل انی رسول اللہ الیکم۶/ ۶۱ – اور وقت قابل ذکر ہے جب مریمؑ کے بیٹے عیسیٰؑ نے بنی اسرائیل کو کہا کہ میں تمہاری طرف اللہ کا رسول ہو کر آیا ہوں۔

آیات بالا میں میں متعدد انبیاء سلام علیہم کے اسماء گرامی بیان کر کے واضح کیا گیا ہے کہ وہ اپنی قوم کی طرف بھیجے گئے تھے۔

لیکن آنحضور سلام علیہ کے متعلق خود ارشاد باری ہے:

قل یا یھا الناس انی رسول اللہ الیکم جمیعا ۱۵۸/۷۔اے رسول! کہہ دیجئے گا کہ اے نوع انسانی میں تم سب کی طرف سے اللہ کا رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں۔

اس آیت مجیدہ سے بالصراحت ثابت ہے کہ آنحضور سلام علیہم پوری نوع انسانی کے رسول تھے۔تو اس طرح جو کتاب آپ کو دی گئی تھی۔یعنی جس کتاب کے آپ رسول تھے اور جس کتاب کا بلاغ آپ کا فریضہ رسالت تھا وہ کتاب خود پوری نوع انسانی کے لئے خدا تعالیٰ کا نازل کردہ ہدایت نامہ اور مکمل ضابطہ حیات ہے۔

آنحضور خاتم النبین تھے آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا نہ نیا نہ پرانا۔

اب چونکہ قرآنِ کریم قیامت تک کی نوع انسانی کے لئے مکمل ضابطہ حیات اور کامل واکمل ہدایت نامہ ہے۔نیز چونکہ رسولِ مقبول سلام علیہ قیامت تک نوع انسانی کے لئے رسول تھے اس لئے خدا تعالیٰ نے قرآنِ کریم کی حفاظت اپنے ذمہ لے کر ۹/۱۵، آئندہ کے لئے نبیوں کا سلسلہ بند کر دیا ہے:

ما کان محمد ابا احد من رجالکم ولکن رسول اللہ وخاتم النبین ۳۳/۴۰۔ محمد تمہارے مردوں سے کسی کے باپ نہیں۔اور لیکن (وہ اس جہت سے پوری امت کے دینی باپ ہیں کہ) وہ اللہ کے رسولوں اور نبیوں کو ختم کرنے والے ہیں اس آیت مجیدہ کی رو سے ثابت ہے کہ آپ کے بعد آپ کی کتاب کو قیامت تک کے لئے محفوظ کر کے نبیوں کی آمد کا سلسلہ بند کر دیا گیا ہے۔پس اب کوئی بھی نبی نہیں آئے گا۔نیا اس لئے نہیں کہ ضابطہ خداوندی میں اس سلسلہ کو

بند کر دیا گیا ہے۔اور پرانا اس لئے نہیں کہ پرانے نبیوں سے نہ کوئی زندہ ہے نہ آئے گا۔سب وفات پاچکے ہیں:

ما المسیح ابن مریم الا رسول قد خلت من قبله الرسل ۵/۷۵۔نہیں ہیں مریم کے بیٹے مسیح مگر ایک رسول آپ سے پہلے سب رسول گزر چکے ہیں۔

ان آیات کریمات کے تقابل سے ثابت ہوتا ہے کہ جس طرح مسیح سلام علیہ سے پہلے جملہ رسولوں کے متعلق کہا گیا ہے۔ **قد خلت من قبله الرسل** ۔اسی طرح آنحضور سلام علیہ کے متعلق ارشاد ہوا **قد خلت من قبله الرسل** ۔تو اب جس طرح قد خلت کی خداوندی خبر کے مطابق حضرت مسیح سے پہلے رسولوں میں سے کوئی زندہ نہیں' اسی طرح آنحضور سے پہلے رسولوں میں سے بھی بمعہ مسیح سلام علیہ نہ کوئی زندہ ہے اور نہ کوئی آئے گا۔حضرت مسیح کے متعلق روایات کی یہ خبر کہ آپ دوسرے یا چوتھے آسمان پر زندہ ہیں اور نازل ہونگے آیات بالا کے خلاف ہے۔

۲/۳۳۔ آنحضور سلام علیہ ہدایت کے متلاشی تھے' قرآنِ کریم' معاشرہ کے دکھوں کا مداوا ہے۔

سورہ والضحیٰ میں ارشاد ہوا ہے: **ووجدک ضالا فهدی** ۹۳/۷۔اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو تلاش ہدایت میں سرگرداں پایا' پس آپ کی ہدایت فرمائی اس آیت کی تفسیر کے لئے زمانہ رسالت سے ماقبل زمانہ جہالت کو نگاہوں کے سامنے لائیے۔ جب ہر طرف ظلم واستبداد کے اندھیروں نے پوری کائنات کو یکسر تاریک کر رکھا تھا۔ جب زیردست انسان بالا دستوں کے ظلم وستم کی چکی میں شبانہ روز پس رہے تھے اور کوئی دل ان کی بے پناہ مظلومیت کے لئے پسیج نہ پاتا تھا۔ بے گناہ چھوٹی بچیوں کو گڑھا کھود کر زندہ دبا دیا جاتا۔لیکن کوئی آنکھ ان ناکردہ گناہ مظلوموں کے لئے ایک آنسو تک نہیں بہاتی تھی۔ نہ سفر محفوظ نہ حضر مامون۔ نہ عزت محفوظ تھی نہ عصمت مصون۔ پوری دنیا کی زیردست انسانیت بالا دستوں کی زرخرید ملکیت بنی ہوئی تھی۔نوع انسانی کی خرید وفروخت کے لئے سرِ بازار منڈیاں لگائی جاتی تھیں۔اور اس افضل ترین نوع کے مرد وعورتیں بھیڑ بکریوں کی طرح دن دہاڑے پکارتے تھے ہر خریدار منڈی کی اس جنس مرد وعورت کو خریدنے

سے پہلے اس طرح کھینچ داب اور مسل دمسل کر پرکھتا ہوا پایا جاتا جس طرح بھیڑ بکری کے ایک ایک عضو کے متعلق تسلی کی جاتی ہے عورت کا معاشرہ میں کوئی مقام ہی نہ تھا۔ متوفی کے مال متروکہ کی طرح عورت بھی وراثت کا مال ہی سمجھا جاتا تھا۔ جنسی بے راہ روی کی یہ حالت کہ لونڈیاں آپس میں چند دنوں کے لئے رعایۃً بھی دی جایا کرتی تھیں۔

اس انتہائی ظلم وظلمت کے زمانے میں ایک فردِ محترم پیدا ہوئے جن کا خاندانی نام رکھا گیا احمد ۶۱/۶۔

لیکن یہ احمد (اللہ کی بے حد تعریف کرنے والا) اس بے پناہ ظلم وتاریکی کے زمانے میں گونا گوں خوبیوں' صداقتوں اور راستبازیوں کے بدولت تھوڑے ہی عرصے میں محمد ہو گیا (حمد در حمد کیا ہوا) ہر چہار طرف سے اس مردِ کامل کی تعریفوں کے پل بندھ گئے اور حالت یہ ہو گئی کہ آپ کو اس بدترین معاشرہ میں محمد کے نام سے پکارا جانے لگا۔ آپ کی تعریفیں ہو رہی ہیں۔ ہر مقام پر آپ کی عزت کی جاتی ہے۔ ہر معاملے میں آپ کو حاکم ومنصف مانا جاتا ہے۔ صادق وامین کے بہترین القاب آپ کے لئے مختص کر دیئے گئے ہیں۔ لیکن آپ خوش نہیں تھے یعنی ان گونا گوں سعادتوں کے باوجود غمگین رہتے تھے۔

کیوں؟ ۔۔۔۔۔۔۔۔ اس لئے آپ صرف اپنے لئے عزت ووقار کے متمنی نہیں تھے۔ بلکہ پوری نوع انسانی کو بالکل مساوی انداز میں باعزت وباوقار دیکھنا چاہتے تھے آپ دکھی انسانیت کے مداوا کے طلب گار تھے۔ آپ نوع انسانی کے ان افراد کو جو منڈی کی جنس بن کر سرِ بازار بکا کرتے تھے انکا اصلی مقام دلانا چاہتے تھے صنفِ نازک کے کھوئے ہوئے وقار کی واپسی کے متمنی تھے۔ زندہ دبائی جانے والی لڑکیوں کے جینے کا حق دلانے کے لئے مغموم ومضطرب رہتے تھے۔ مزدور کے گاڑھے پسینے کی کمائی پر سے سرمایہ دار کا غاصبانہ حق زائل کر کے مزدور اور اس کے بیگناہ بچوں کے لبوں کو بھی تبسم آشنا دیکھنے کے طلب گار تھے۔ اعلٰی وادنیٰ' عربی وعجمی' قریشی وغیر قریشی' ہاشمی واموی' کالا گورا' اسود واحمر' مزدور سرمایہ دار' مالک ومزارع' آقا وغلام اور بندہ وصاحب کے جملہ انسانیت سوز امتیازات کو یک قلم موقوف کر کے پوری کی پوری نوع انسانی کے ایک ایک فرد کو صرف اور صرف نوع انسانی کے ہموار اور فرحت افزا مقام پر فائز دیکھنا چاہتے تھے جہاں ہر

طرف مسرتیں رقص کرتی دکھائی دیں۔ اور پورے معاشرے کے ایک ایک فرد کی لبوں پر ہر آن ایک جیسی مسکراہٹیں کھلتی ہوئی پائی جائیں۔

آپ کو ان حسین تمناؤں اور جنت بدوش حسرتوں کی تکمیل کے لئے ایک لازوال رہنمائی کی ضرورت تھی۔ اسی ہدایت کے لئے آپ حیران و سرگردان تھے کہ ایک ایسی تحریک کا آغاز کیا جائے جس کا انجام مذکورہ بالا تمناؤں کی فردوسِ مشہود ہو۔ آپ اپنے گردوپیش کے انسانوں کو ایک منشور بطور بنیاد دینا چاہتے تھے جس پر دکھیا انسانیت کے مداوا کی عمارت اٹھائی جائے۔ چنانچہ رحمتِ باری جوش میں آئی اور آپ پر نزولِ وحی کی ابتدا ہوئی یہ رمضان کا مہینہ تھا۔ ۲/۱۸۵ رات کا وقت مکمل تنہائی اور سکوت ۱/۷۱ بستی سے باہر مسجد اور باغ/ ۱۷+ ۵۳/۱۵۔ بہار کا موسم ۵۳/۱۶ جب ہر طرف نئی جوانی کا آغاز ہوتا ہے مردہ دلوں میں بھی نئی زندگی کی لہریں دوڑتی ہیں۔ ایسے پر فضا مقام اور سہانے وقت میں اس طلب گارِ ہدایت کو جو مذکورہ بالا فردوسِ نگاہ و گوش تمناؤں اور حسرتوں کی تکمیل کے لئے ایک عظیم الشان مہم کی ابتدا کرنا چاہتا تھا باری تعالیٰ نے خود اسی اندازِ تکلم میں یعنی اسی کو متکلم بنا کر ارشاد فرمایا (اے غم خوارِ انسانیت) اللہ صاحب بخشش عامہ اور رحمتِ خاصہ کے نام کے ساتھ اقرار و اعلان فرمایئے: الحمد الله پوری کی پوری حمد وستائش اللہ تعالیٰ کے لئے ہے۔ جو جملہ جہانوں کی جملہ مخلوق کا رب' روزی رساں سب کے لئے یکساں طور پر سامانِ ربوبیت مہیا کرنے والا ہے۔ حقوقِ ربوبیت کے لحاظ سے اس کے ہاں نوع انسانی کے ایک ایک فرد کا حق ربوبیت مسلم ہے۔ وہ رب العلمین ہے صرف رب المترفین یا رب المسلمین نہیں وہ سب کا رب ہے: الحمد الله رب العلمین ۝ ۱/۱

رسول اکرم! قبل نبوت کے پر اضطراب دور میں جب دکھی انسانیت کے مداوا کی تلاش میں طلب گارِ ہدایت تھے' اس وقت آپ یہ نہیں جانتے تھے کہ مجھ پر کتاب اترنے والی ہے وما كنت ترجوا ان يلقى اليك الكتب الا رحمة من ربك ۲۸/۸۶۔ چنانچہ عالمین کے پروردگار نے طلب گارِ ہدایت کو ہی متکلم بنا کر آپ ہی کی زبانِ فیض ترجمان سے گوہر افشانی فرماتے ہوئے کتابِ مجید کی افتتاحی سورت مجیدہ نازل فرمائی۔ جو آنحضرت کی حسین آرزوؤں اور مسرت بدوش حسرتوں کا آئینہ بھی ہے ۹۳/۷۔ قرآنِ کریم کی فہرست بھی ہے۔ پورے قرآن میں

دہرائے ہوئے سات عنوانات پر مشتمل بھی ہے۔ ۱۵/۸۷۔ اوراس مبارک تحریک کا سات نکاتی نکاتی منشور بھی ہے جس تحریک کا افتتاح آپ نے نوع انسانی کو اس کے گونا گوں مصائب ومشکلات سے نجات دلانے کے لئے قرآن کریم کے نزولِ اول کے ساتھ ہی خدا تعالیٰ کی طرف سے ابتدائی ہدایات اور نوع انسانی کے تمام احکامات اور قوم کے سوالوں کے ضروری جوابات مل چکنے کے فوراً بعد فرمایا۔ اور سورہ فاتحہ کے سات عنوانات' اوراپنے سات نکاتی منشور کے اعلان ہی میں' قوم پر واضح کر دیا کہ آپ کیا لے کر آئے ہیں۔ کس بحرِ عمیق کے شناور اور کس میدان کے شاہسوار ہیں۔ آپ کی مقدس تحریک کی ابتدا کیا ہے اور انتہا کیا ہوگی۔

المختصر! سورہ فاتحہ پورے قرآن کریم کا نچوڑ' پورے قرآن کا جمال ہے پورا قرآن اس اجمال کی تفصیل ہے سورہ بقر کی ابتدائی بیس آیتوں میں آنحضور سلام علیہ کو ہدایات دی گئی ہیں آپ کی پاکیزہ مہم اور مبارک تحریک کے سلسلے میں آپ کو تین قسم کے لوگوں کے ساتھ واسطہ پڑے گا۔

۱۔ مومن ۲۔ کافر ۳۔ منافق

مومن وہ ہونگے' جو آپ پر' قرآنِ کریم پر سابقہ کتابوں اور آخرت پر ایمان لائیں گے۔ نظام ربوبیت کے قیام میں آپ کا ساتھ دیں گے۔ اور اس کے لئے اپنے مال خرچ کریں گے ۳۔۴/۲

کافر وہ ہونگے جو آپ کی نبوت کا' قرآنِ کریم اور آخرت کا مطلقاً انکار کر دیں گے۔ انہیں سمجھانا یا نہ سمجھانا برابر ہوگا۔ ان کے ذہنوں اور کانوں پر نہ سننے اور نہ سمجھنے کی مہر ہوگی۔ اور ان کی آنکھوں پر باپ دادا کی تقلید کرے پردے پڑے ہوئے ہوں گے۔ ۶۔۲/۷ وہ ایمان لانے والے نہیں ہوں گے۔ ان کے ساتھ مغز ماری نہ فرمایئے گا۔

منافق وہ ہونگے جو زبان سے ایمان کا اقرار کریں گے۔ لیکن دراصل مومن نہیں ہوں گے۔ وہ در پردہ کافروں کے ساتھ ملے ہوں گے۔ آپ کے پاس آئیں گے تو ایمان کا اظہار کریں گے۔ اور جب اپنے خلوت نشین پیشواؤں کے پاس جائیں گے تو ان سے کہیں گے کہ ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ مومنوں سے تو ہم محض مذاق کرنے جاتے ہیں۔ ۸تا۲/۱۴۔ یعنی ایسے لوگوں کے متعلق آنحضور سلام علیہ کو ہدایت دی گئی ہے کہ ایسے لوگ انتہائی خطرناک ہوں گے۔

ان سے پوری طرح بچ کر رہنا ہوگا۔

اس طرح پہلی بیس آیتوں میں مذکورہ بالا تینوں قسم کے لوگوں کے متعلق مختصر ہدایات دے چکنے کے بعد آیت نمبر ۲۱۔۲۲ میں پوری نوعِ انسانی کی طرف قرآنِ کریم کا پہلا خطاب ہے:

یایھاالناس اعبدوا ربکم الذی خلقکم والذین من قبلکم لعلکم تتقون o الذی جعل لکم الارض فراشا والسماء بناء وانزل من السماء ماء فاخرج به من الثمرات رزقا لکم فلا تجعلوا الله انداداوانتم تعلمون o

(مفہوم) اے پوری نوعِ انسانی! اپنے پروردگار کی عبودیت (فرمانبرداری) کرو جو تمہارا بھی رب ہے اور ان لوگوں کا بھی رب ہے جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں۔ (یہ خالصاً رب تعالیٰ کی فرمانبرداری کا حکم اس لئے دیا گیا ہے) تاکہ تم زندگی کی جملہ مشکلات اور معاشرہ کے ہر قسم کے خطرات ومصائب سے بچ جاؤ۔ تمہارا رب وہ جس نے تم سب کے سب کے لئے زمین کو فرش اور آسمان کو بناء (ربوبیت) بنایا ہے۔ یعنی وہ بلندی سے پانی نازل کرتا ہے پھر اس پانی کے ساتھ تم سب کے سب کے لئے ہر قسم کے میوہ جات پیدا کرتا ہے پس تم اللہ کے لئے (اس کی ربوبیت میں) غیر اللہ کو شریک نہ ٹھہراتا۔ کیونکہ (کائنات اور اسبابِ ربوبیت میں غیر اللہ کی عدم شرکت اس طرح نمایاں ہے کہ اس حقیقت کو) تم سب جانتے ہو۔

اس کے بعد آیت نمبر ۲۳ تا ۲۸ معترضہ جملے ہیں۔ اور آیت نمبر ۲۹ میں ربوبیتِ عالمینی الحمد للہ رب العلمین ۱/۱ کا تائیدی اور تاکیدی اعلان ہے:

ھو الذی خلق لکم مافی الارض جمیعا ۲/۲۹

(مفہوم) اے نوعِ انسانی! اللہ ہی وہ عظیم الشان ذات ہے جس نے جو کچھ بھی زمین میں پیدا کیا ہے وہ سب کا سب تم سب کے لئے پیدا کیا ہے۔

بالفاظِ دیگر:

قرآن کریم ناہموار تقسیمِ رزق کے جملہ نظاموں کے خلاف ہموار ومتوازن تقسیمِ رزق کا نظام پیش کرتا ہے اور اسی نقطہ ماسکہ کے گرد اس کی پوری تعلیم گردش کرتی ہے۔

حاصل کلام:

برادران اسلام

یہ ہے زیرِ نظر ترجمہ وتفسیر کا تعارف۔ جو خود قرآنِ کریم کے آئینے میں اس طرح عام فہم انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ مشکل الفاظ اور قواعد وگریمر کی مشکل اصطلاحوں سے عمداً پرہیز کر کے آسان اصطلاحیں پیش کی گئی ہیں۔ تاکہ کم علم اصحاب بھی سمجھ سکیں۔ اس پورے مضمون کا خلاصہ یہ ہے:

☆ قرآنِ کریم کا ترجمہ اور تفسیر قرآن فہمی کے ان اصولوں پر مبنی ہے۔ جو خود قرآنِ کریم نے پیش کئے ہیں۔

☆ پوری تفسیر کا محوری نقطہ قرآنِ کریم کے ابتدائی اور انتہائی اعلان' الحمدالله رب العلمین ۱/۱ اور قل اعوذ برب الناس ۱/۱۱۴ کے مطابق ربوبیت عالمینی ہے۔

یاد رہے کہ خود قرآنی تعلیم کی روشنی میں۔

قرآنِ کریم کی غرضِ نزول یہ ہے:

قرآن کریم کے نزول کی غرض یہ ہے

کہ پورے کرہ ارض پر پوری نوعِ انسانی کا ایک عالم گیر ہموار ومتوازن نظامِ ربوبیت عامہ قائم ہو۔ نسلی' لسانی' جغرافیائی' امیر وغریب' مالک وملازم' زمیندار ومزارع' کارخانہ دار ومزدور کے جملہ امتیازات ختم ہو جائیں اور پوری زمین الحمدا لله رب العلمین کی عملی تفسیر بن جائے۔ جس میں:

☆ نہ کوئی بھوکا ہو نہ ننگا ☆ نہ بے مکان ہو نہ بے علاج۔

☆ نہ کوئی ساہوکار ہو نہ قرضدار ☆ نہ کوئی کرایہ خواہ ہو نہ کرایہ دار۔

ہر فردِ انسانی ضروریاتِ زندگی سے سوفیصد بہرہ یاب ہو پورا کرہ ارض ایک گھر بن جائے اور پوری نوعِ انسانی ایک کنبہ۔

☆ نہ کہیں توپیں اور ٹینک آگ اگلتے ہوئے پائے جائیں۔

☆ نہ کہیں نیپام بموں کا خوف ہو نہ ہائیڈ روجن اور ایٹم بموں کا خطرہ۔

پس زیر نظر ترجمہ و تفسیر کے اس تعارف' اور قرآن کریم کے محوری نقطہ ربوبیت عامہ کو نگاہ میں رکھئے اور اب اللہ کا نام لے کر سورہ فاتحہ کا ترجمہ و تفسیر ملاحظہ فرمایئے۔

ربنا لا توء اخذنا ان نسینا او اخطانا ۲/۲۸۶

رب اعوذبک من ھمزت الشیطن ٥

واعوذبک رب ان یحضرون ٥ ۲۳/۹۸.۹۷

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وحی کی خصوصیات

چونکہ انسان کی ہدایت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لی اس لیے مسلسل انبیاء کرام مبعوث ہوتے رہے اور ان کے ذریعہ نوع انسان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت ملتی رہی۔علم خداوندی اور ہدایت ربانی جو انبیائے کرام کو خدا تعالیٰ کی طرف سے ملتی رہی اسے اصطلاح شریعت میں وحی کے نام سے موسوم کیا گیا چونکہ نبوت حضور پر ختم کردی گئی اس لیے آخری مرتبہ جو وحی خدا تعالیٰ کو دینی تھی وہ حضور کو دے دی گئی اور اس کے بعد وحی خداوندی کا سلسلہ بند کردیا تھا اور حضور کو جو وحی دی گئی وہ قرآن میں محفوظ کردی گئی جس کی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لی۔لیکن مسلمانوں میں ایک عام نظریہ رواج پذیر ہوا کہ وحی خداوندی کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وحی متلو یا وحی جلی اور دوسری وحی غیر متلو یا وحی خفی۔وحی متلو قرآن کریم میں ہے اور وحی غیر متلو قرآن کے باہر ہے اور وہ احادیث رسول ہیں۔

لیکن قرآن کریم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مروجہ عقیدہ مسلمانوں کے دور آمریت کی پیداوار ہے اور خود قرآن کریم کے بالکل خلاف ہے۔قرآن کریم میں تفحص کرنے سے وحی کی چند بنیادی اور نمایاں خصوصیات ابھر کے سامنے آجاتی ہیں۔مضمون ہذا میں وہ خصوصیات مرقوم کی جاتی ہیں اور قارئین کرام سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ خود ان خصوصیات کو سامنے رکھ کر غور فرمائیں کہ وحی صرف قرآن ہے یا قرآن کے باہر (روایات) بھی وحی ہوسکتی ہے۔

وحی ساری متلو ہے:

قرآن کریم نے وحی کی جو بنیادی خصوصیت بیان فرمائی ہے وہ یہ ہے کہ وہی صرف متلو ہے اور وحی غیر متلو ہو ہی نہیں سکتی۔چنانچہ ارشاد باری ہے۔

کذالک ارسلنک فی امۃ قد خلت من قبلھا امم لتتلوا علیھم الذی

اوحینا الیک وھم یکفرون بالرحمن ط (۱۳:۳۰)

اسی طرح (اے محمد) ہم نے تم کو اس امت میں جس سے پہلے بہت امتیں گزر چکی ہیں بھیجا تا کہ تم پر وہ (کتاب) جو ہم نے تمہاری طرف بھیجی ہے تلاوت کر دو۔

اس آیت کریمہ سے بالکل واضح ہے کہ مطلق ماپوحی متلو ہے جس کی تلاوت حضور امت کے سامنے فرمایا کرتے تھے اور وحی ساری کی ساری متلو ہے جو قرآن میں محفوظ ہے۔ اس آیت کے پیش نظر غیر متلو وحی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

وحی صرف جلی ہے:

وحی کی ایک قسم کو خفی ماننا اور اس کو قران کے باہر تسلیم کرنا بھی غلط ہے۔ کیونکہ وحی صرف جلی ہے جبکہ حضور کو حکم تھا کہ وحی کو امت تک ضرور پہنچادیں اور اس کو مخفی نہ رکھیں تو وحی خفی کس طرح ہو سکتی ہے حضور کو حکم خداوندی تھا:

یاایھا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک ط و ان لم تفعل فما بلغت رسالتہ ط (٦٧ : ٥)

اے رسول جو ارشادات خدا کی طرف سے تم پر نازل ہوئے ہیں سب لوگوں کو پہنچا دو۔ اور اگر ایسا نہ کیا تو تم خدا کا پیغام پہنچانے میں قاصر رہے۔

وحی الٰہی کی تبلیغ حضور پر ایسی فرض تھی کہ کسی حال میں بھی اسے روکا نہیں جا سکتا تھا۔ لیکن حدیثیں صرف حیا یا دل جوئی کے خیال سے روکی جا سکتی تھیں۔ رسول کریم کے گھر میں غریب لوگ کھانا کھانے آتے تھے۔ وہ کھانا تیار ہونے سے کافی عرصہ پہلے ہی آ جاتے تھے اور کھانا ختم کرنے کے بعد بھی حضور کے خانہ محترم میں بیٹھے رہتے تھے۔ جو اگر چہ حضور کو گراں گزرتا تھا۔ اگر آپ انہیں اپنے حدیثی بیان سے منع فرما دیتے تو کوئی مضائقہ نہیں تھا لیکن آپ شرم و حیا کی وجہ سے ایسی سچی حدیث بھی بیان نہیں فرماتے تھے لیکن جب یہی بات قرآن کریم میں نازل ہوگئی تو اس وقت اس بات کے بیان میں حیا آپ کو ہرگز مانع نہ ہو سکی۔ اس سے ثابت ہے کہ وحی کو تو حضور کسی حال میں خفیہ رکھ ہی نہیں سکتے تھے۔ فوری طور پر آپ اس وحی کو امت میں پہنچا دیتے تھے۔ وحی خفی کا تصور ہی باطل اور غلط ہے۔

وحی سابقہ وحی کی مصدق ہوتی ہے:

انبیاء کرام علیہم السلام کو مختلف ادوار اور مختلف مقامات میں جو وحی اللہ تعالی کی طرف سے ملتی رہی اس میں کسی قسم کا کوئی اختلاف نہیں تھا بلکہ ایک ہی تعلیم تھی جو اللہ تعالی کی طرف سے امم سابقہ کو ملتی رہی یہی وجہ ہے کہ حضور کو بھی ملت ابراہیمی کے اتباع کا حکم دیا گیا تھا- وحی الہی ہمیشہ سابقہ وحی کی مصدق رہی ہے اور یہ وحی کی صداقت کی ایک نشانی تھی کہ وہ وحی سابقہ انبیاء کی وحی کی تصدیق کرتی تھی- چنانچہ ارشاد ربانی ہے:

و امنوا بما انزلت مصدقا لما معکم (۲:۴۱)

(ترجمہ) اور ایمان لاؤ اس کتاب پر جو میں نے نازل کی ہے ایسی حالت میں کہ وہ سچ بتلانے والی ہے اس کتاب کو جو تمہارے پاس ہے-

اسی مضمون کو دوسری جگہ بیان فرمایا:

یاایھا الذین اوتو الکتاب امنوا بما نزلنا مصدقا لما معکم-

(۴:۴۷)

اے کتاب والو ہماری نازل کی ہوئی کتاب پر جو تمہاری کتاب کی تصدیق کرتی ہے ایمان لے آؤ-

نزل علیک الکتاب بالحق مصدقا لما بین یدیہ (۳:۳)

(ترجمہ) اور اتاری ہم نے تیری طرف کتاب حق کے ساتھ سچا کرنے والی اس چیز کو کہ آگے اس کے ہے کتاب سے-

وانزلنا الیک الکتاب باالحق مصدقا لما بین یدیہ من الکتب

(۵:۴۸)

(ترجمہ) اور اتاری ہم نے تیری طرف کتاب حق کے ساتھ سچا کرنے والی اس چیز کو کہ آگے اس کے ہے کتاب-

ان چار آیات کریمات سے واضح ہے کہ وحی سابقہ وحی کی مصدق ہوتی ہے نیز ان چار آیات

میں سے پہلی دو آیات میں بما انزلت اور مما نزلنا کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں اور آخری دونوں آیات میں کتاب کا لفظ استعمال ہوا ہے جس سے بخوبی واضح ہے کہ ماانزل اور کتاب ایک ہی چیز ہے اور ماانزل صرف کتاب کے اندر محفوظ ہے کتاب کے باہر ہرگز نہیں ہے۔

وحی ہمیشہ غالب رہتی ہے:

عقل انسانی کے تفکر وتعقل کا طریقہ تجرباتی ہوتا ہے۔ بسااوقات عقل انسانی صحیح نتائج تک پہنچ جاتی ہے اور بسااوقات درست نتائج نہیں نکال سکتی اور راہ میں ہی ٹھوکریں کھاتی پھرتی ہے لیکن وحی کا طریقہ قطعی اور حتمی ہوتا ہے اور وحی سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ ہمیشہ درست ہونے کی وجہ سے انسانی فکر سے آگے رہتا ہے۔ جہاں عقل انسانی کسی معاملہ میں حیران وسرگرداں ہو وہاں وحی الٰہی مسئلہ کی پختہ گرفت کرا دیتی ہے یہی وجہ ہے کہ وحی ہمیشہ انسانی عقل کی راہنما اور عقل انسانی پر غالب رہی ہے۔ نزول قرآن کے وقت عقل انسانی' ملوکیت' پیشوائیت' سرمایہ داری' وطنیت' ذاتی ملکیت' نسل پرستی اور اسی قسم کے مروجہ نظریات کے نقائص ومعائب کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتی تھی لیکن قرآن کریم کیونکہ وحی الٰہی تھا اس لیے اس تاریک دور میں بھی قرآن کریم نے روشنی وعلمی نور فراہم کیا اور ان تمام چیزوں کی تردید فرمائی۔ اگرچہ آہستہ آہستہ عقل انسانی بھی انہیں نتائج پر پہنچی جن پر وحی چودہ سو سال پیشتر پہنچ چکی تھی اور اس طرح وحی عقل انسانی کی راہنما اور اس پر غالب رہی چنانچہ ارشاد قرآنی ہے:

> ان الذین کفروا بالذکر لما جآء ھم و انہ لکتب عزیز (۴۱:۴۱)
>
> (ترجمہ) جو لوگ اس قرآن کا جب کہ وہ ان کے پاس پہنچتا ہے انکار کرتے ہیں' اور یہ قرآن بڑی باوقعت کتاب ہے۔

اس آیت سے ثابت ہوا کہ وحی اپنے علوم ونظریات میں ہمیشہ عقل انسانی سے آگے اور اس پر غالب رہے گی۔ یہ قرآن حکیم کا حتمی چیلنج ہے۔ کتنے ہی علوم انسانی ترقی کر جائیں وحی ہمیشہ ان سے آگے رہے گی اور عقل کی راہنمائی کرتی رہے گی۔ اس اعتبار سے قرآن حکیم کے غالب رہنے سے کوئی مسلمان انکار نہیں کرسکتا۔ لیکن روایات جنہیں وحی خارج از قرآن شمار کیا جاتا ہے وہ اس

معیار پر نہیں اتر تیں۔نمونے کے طور پر محض چند روایات پیش خدمت ہیں۔

(۱) قرآن کریم نے اللہ تعالیٰ کی صفت ان الفاظ میں بیان فرمائی ہے کہ:

لیس کمثله شیی دنیا کی کوئی چیز اللہ تعالیٰ کی مثل نہیں ہے۔اب اگر اللہ تعالیٰ کو کائنات کی افضل ترین مخلوق یعنی انسان کی مثل بھی ٹھہرایا جائے تو پھر بھی قرآن کی مخالفت ہوگی اور واضح رہے کہ وحی اور وحی باہم مخالف نہیں ہوسکتیں۔لیکن یہ نام نہاد وحی کہتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ایک تخت ہے جس پر وہ بیٹھتا ہے اور وہ تخت اتنا پرانا اور بوسیدہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اس پر تشریف فرما ہوتا ہے تو وہ چر چر کرتا ہے۔ چنانچہ روایت ہے۔

حضور نے فرمایا۔افسوس ہے تجھ پر۔کیا تو جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کیا ہے۔ بلاشبہ اس کا تخت اس کے آسمانوں کے اوپر ہے۔ آپ نے اپنی انگلیوں سے قبہ کی شکل بنا کر بتایا (کہ وہ) اس طرح کا ہے اور فرمایا کہ بے شک وہ (تخت) (اللہ کے بیٹھنے سے) اس طرح چر چراتا ہے جیسے اونٹ کا کجا وہ اپنے سوار کے بوجھ سے چر چر کرتا ہے۔ (مشکوۃ شریف مطبوعہ امرتسر۔طبع چہارم ص ۲۲۱)

(۲) جب آفتاب کا کنارہ طلوع ہو تو نماز ترک کر دو یہاں تک کہ پورا طلوع ہو جائے اور جب آفتاب کا کنارہ غروب ہو تو نماز ترک کر دو۔ یہاں تک کہ پورا غروب ہو جائے اور تم اپنی نماز آفتاب کے طلوع و غریب کے وقت نہ پڑھا کرو۔ کیونکہ وہ شیطان کے دونوں سینگوں کے درمیان طلوع و غروب ہوتا ہے۔

(بخاری شریف مطبوعہ قرآن محل۔کراچی۔جلد دوم ص ۲۳۶)

جس شیطان کے سینگوں کا درمیانی فاصلہ ہزار ہا میل کا ہے اس کی جسامت اور طول و عرض کا اندازہ آپ خود لگالیں۔لیکن اسی شیطان کے متعلق دوسری جگہ روایت مندرج ہے:

(۳) حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضور نے فرمایا کہ جب کوئی نیند سے بیدار ہو اور وضو کرے تو تین مرتبہ ناک میں پانی ڈال کر جھاڑنا چاہیے۔ کیونکہ شیطان رات اس کی ناک کے بانسہ میں گزارتا ہے۔"

(بخاری شریف مذکورہ بالا۔جلد دوم ص ۲۴۳)

(۴) حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ حضور نے فرمایا۔ بخار جہنم کی تیزی سے ہے لہذا اسے پانی سے ٹھنڈا کیا کرو۔
(بخاری شریف مترجم مطبوعہ قرآن محل۔ کراچی جلد دوم ص ۲۳۳)

(۵) تفسیر برہان میں جابر سے منقول ہے کہ میری عمار سے ملاقات ہوئی۔ اس نے بیان کیا کہ حضور نے صبح کی نماز پڑھائی اور بیٹھ گئے اور کافی لوگ وہاں موجود تھے۔ اتنے میں دن نکل آیا۔ پس حضرت علیؓ تشریف لائے تو حضور نے کھڑے ہو کر علی کی پیشانی پر بوسہ دیا اور اپنے پہلو میں ان کو بٹھایا کہ ان کے زانوں آپ کے زانو سے ٹکرا رہے تھے۔ پس آپ نے فرمایا یا علی! اٹھ کر سورج سے بات کرو کیونکہ وہ تم سے بات کرے گا۔ لوگ بھی کھڑے ہو گئے کہ دیکھیں سورج کس طرح حضرت علیؓ سے باتیں کرتا ہے۔ بعض تو یہ بھی کہنے لگے کہ حضور خواہ مخواہ اپنے بھائی کی عزت افزائی کرتے ہیں۔ پس حضرت علیؓ نے باہر نکل کر سورج سے خطاب کیا۔ اے سورج کیسے ہو؟ اس نے فوراً جواب دیا۔ خیر سے ہوں۔ اے برادر رسول۔ اے اول اے آخر۔ اے ظاہر اے باطن۔ اے وہ جو ہر شے کا جاننے والا ہے۔

جب حضرت علیؓ پلٹے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ تم بتاؤ گے یا میں خود بتاؤں کہ اس نے کیا کہا۔ حضرت علیؓ نے عرض کیا کہ حضور کا فرمانا ہی بہتر ہے۔ تو آپ نے فرمایا کہ سورج کا کہنا کہ تو اول ہے۔ اس کا یہ معنی ہے کہ تو سابق الایمان ہے اور اس کا یہ کہنا تو آخر ہے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ تو سب سے آخر میرے غسل وغیرہ کے وقت موجود ہوگا۔ اور ظاہر کا معنی یہ ہے کہ میرے پوشیدہ رازوں پر مطلع ہوگا اور باطن کا معنی یہ ہے کہ تو میرے علم کا صحیح وارث ہوگا۔ (تفسیر انوار النجف جلد ۱۳، ص ۲۱۲)

(۶) حضرت امام رضاؑ سے منقول ہے کہ مائدہ کے نزول کے بعد بنی اسرائیل کے لوگ کفر کی وجہ سے مسخ ہو گئے، وہ دو گروہ تھے۔ ایک گروہ بے چھلکا مچھلی (اسے ملی کہتے ہیں) کی شکل میں مسخ ہوا اور دریا میں چلا گیا اور دوسرا فرقہ سوسمار کی شکل میں مسخ ہو کر جنگلوں

میں پھیل گیا۔ (تفسیر قرآن جلد۵ص۱۸۵)

(مصنفہ حجۃ الاسلام علامہ حسین بخش صاحب)

وحی کی مثل نہیں بن سکتی:

وحی کی ایک بنیادی خصوصیت جو متفقہ طور پر تسلیم کی جاتی ہے یہ ہے کہ اس کی مثل نہیں بن سکتی کیونکہ اس بارے میں قرآن کریم کی واضح نص موجود ہے کہ وحی کی مثل لائی ہی نہیں جا سکتی۔ ارشاد خداوندی ہے:

و ان کنتم فی ریب مما نزلنا علی عبدنا فاتوا بسورۃ من مثلہ

(۲:۲۳)

(ترجمہ) اور اگر تم ہو شک میں اس چیز سے کہ اتاری ہے ہم نے اوپر اپنے بندے کے۔ پس لے آؤ ایک سورۃ مانند اس کے۔

اس آیت کریمہ میں قرآن کریم نے واضح طور پر وحی کا معیار (Criterion) مقرر فرما دیا ہے کہ وحی کی مثل نہیں بن سکی۔ اس آیت میں توجہ طلب اور قابل غور نکتہ یہ ہے کہ آیت میں معارضہ صرف قرآن کریم کا نہیں کیا گیا ہے کہ کفار قرآن کا مثل نہیں لا سکتے۔ بلکہ آیت ہذا میں معارضہ مما نزلنا کا کیا گیا ہے چونکہ یہاں ما تعیم کا ہے جس کے معنی ہیں کہ معارضہ ہر اس چیز کا کیا گیا ہے جو کچھ بھی نازل کی گئی ہے اور صرف قرآن کا معارضہ نہیں کیا گیا۔ اس نکتہ کو پیش نظر رکھ کر غور کرنے کے بعد ہر شخص بآسانی اس نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے کہ وحی صرف قرآن میں ہے جس کا مثل و نظیر نہیں ہے۔ قرآن کے علاوہ کوئی چیز بے مثل نہیں ہے۔ حتیٰ کہ روایات بھی بے مثل نہیں ہیں اور ہر قسم کی روایات کتب معتبرہ میں چلی آ رہی ہیں اور واضعین نے ان کی مثل بنا کر کتب معتبرہ میں داخل کر دیا ہے۔

وحی قطعی ہوتی ہے ظنی نہیں ہو سکتی:

ایمان و عمل کی ساری عمارت یقین پر مبنی ہوتی ہے۔ اگر کسی معاملہ میں ذرا سا بھی شک و تردد واقع ہو جائے تو اس پر دل جمعی کے ساتھ ایمان و یقین نہیں لایا جا سکتا اور انسان اضطراب و کشمکش

میں مبتلا رہتا ہے یہی وجہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے انسان سے ایمان کا مطالبہ کیا تو وحی کو محفوظ اور منضبط شکل میں رکھنے کا بھی وعدہ اور اہتمام فرمایا تا کہ ہر شخص یقینی طور پر ایمان لا سکے۔ اسی لئے حضور نے قرآن کو محفوظ کرا کر امت کو دیا۔ صحابہ بھی یقینی طور پر اسی وحی پر ایمان لائے۔ اس کے علاوہ وہ برگزیدہ ہستیاں کسی بھی وحی پر ایمان نہیں لائیں۔ قرآن کے علاوہ ہر چیز ظنی ہے اور ظن پر تو ایمان لایا ہی نہیں جا سکتا۔ اس پر کسی شخص کی بھی طبیعت مطمئن نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ:

ان الظن لا یغنی من الحق شیئا ○ (۵۳:۲۸)
"تحقیق گمان نہیں کفایت کرتا حق سے کچھ"

نیز ارشاد ہوا:

یایھا الذین امنوا اجتنبوا کثیرا من الظن ان بعض الظن اثم۔
(۴۹:۱۲)
(ترجمہ) اے لوگو! جو ایمان لائے ہو۔ بچو بہت گمانوں سے تحقیق بعض گمان گناہ ہیں۔

ان واضح آیات کے باوجود جن میں مومنین کو ظن سے بچنے کی ہدایت ہے کیا خود اللہ تعالیٰ انسان کو اس حالت پر مجبور کرتا کہ اس کے ایمان و یقین کی بنیاد واضح نہ ہو اور اس سے کسی غیر واضح و غیر متعین چیز پر ایمان لانے کا مطالبہ کیا جاتا۔ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ یقیناً وحی قطعی اور یقینی ہی ہو سکتی ہے اور وہ صرف قرآن کریم ہی ہے۔ روایات کے مشہور جامعین بھی اس سے متفق ہیں کیونکہ ہر روایت کا آغاز و قال رسول اللہ سے اور اختتام او کما قال سے کرتے ہیں۔

وحی بمعہ اپنے الفاظ کے منزل من اللہ ہوتی ہے:

وحی مع اپنے الفاظ کے منزل من اللہ ہوتی تھی (۲۶:۱۹۵:۱۶:۱۰۳) یہ ایک موہبت عظمیٰ تھی جو انبیاء کرام کو عطا ہوتی تھی۔ نبی کی سوچ، فکر، تعقل و تدبر کو اس میں کوئی دخل نہیں ہوتا تھا۔ اسی لیے وحی کے ذریعے جو علوم ملتے تھے وہ ہمیشہ کے لیے صحیح ہوتے تھے۔ اس کے برخلاف حضور کے

اقوال وافعال بشری عقل کا نتیجہ تھے۔جس میں سہو ونسیاں کا بھی امکان تھا۔اسی لئے آپ کو حکم تھا کہ آپ صحابہؓ کے ساتھ مشورہ کر کے اپنی رائے کو مستحکم اور پختہ بنائیں۔آپ کو شیطانی نزغ کے وقت اعوذ باللہ کی دعا کرنے کا حکم تھا (۷:۲۰۰)۔آپ شیطانی ہمزات سے بھی پناہ طلب فرماتے تھے (۲۳:۹۷)۔آپ کی ایسی باتیں بھی تھیں جو وحی کے بغیر تھیں اور آپ عقل واجتہاد و مشورہ سے کام لیا کرتے تھے۔ظاہر ہے کہ احادیث رسول وحی نہیں ہوسکتی تھیں ورنہ وحی کے لیے مشورہ کی کیا ضرورت تھی۔اس سے ثابت ہے کہ وحی جو کہ منزل من اللہ ہے اور جس میں نبی کے فکر کا کوئی دخل نہیں ہے وہ صرف قرآن کریم ہے اور وحی خفی کے عقیدے کا پس منظر اور وجہ صرف یہ ہے کہ حضور کو حد بشری سے اعلیٰ وارفع سمجھا جائے اور آپ کے عقلی و ذہنی قویٰ کو سہو وخطا سے منزہ خیال کیا جائے۔

وحی میں تضاد نہیں ہوسکتا:

وحی کی ایک واضح خصوصیت ہے کہ وحی میں تضاد واقع نہیں ہوسکتا۔اگر کوئی شخص اپنی ہی طرف سے اپنی فکری کاوش سے پیش کردہ کوئی کتاب تحریر کرے اور اس کے لئے وحی کا دعویٰ کرے تو اس میں ضرور تضاد واقع ہوگا کیونکہ جتنے عرصہ میں وہ اپنی تعلیم جمع کرے گا اس میں سہو ونسیاں ہونے کی وجہ سے تضاد ضرور واقع ہوگا۔نیز یہ کہ چونکہ ہر شخص اپنے حالات وماحول سے متاثر ہوتا ہے اس لئے اس کی فکر میں حالات کا تاثر ہونا لابدی چیز ہے۔پھر ہر شخص کی فکر میں ارتقاء بھی ضروری ہے اور گذشتہ نظریات وخیالات سے رجوع کرنا کوئی امر بعید نہیں ہے۔اس لئے فکر انسانی میں تضاد کا ہونا ضروری ہے۔یہ صرف وحی الٰہی ہی ہے جس میں تضاد نہیں ہوسکتا۔کیونکہ اس کا سرچشمہ علم خداوندی ہوتا ہے۔جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

بما انزل الیک انزله بعلمه (۴ : ۱۶۶)

(ترجمہ) جو کچھ اتارا طرف تیری اتارا اس کو اپنے علم کے ساتھ۔

بما انزل بعلم الله (۱۱ : ۱۴)

(ترجمہ) اتارا گیا ہے ساتھ علم خدا کے۔

علم خداوندی میں کسی قسم کی غلطی، سہو، نسیان، ارتقاء کا امکان ہی نہیں ہے۔ قرآن کریم چونکہ وحی ہے جس کا سرچشمہ علم خداوندی ہے اس لئے اس میں کوئی تضاد نہیں ہو سکتا۔ تخلیق کائنات کے متعلق مختلف مقامات پر، مختلف عنوانات کے ذیل میں روشنی ڈالی گئی ہے جو کہ مکی اور مدنی آیات پر مشتمل ہیں۔ آپ سارے مقامات پر غور فرمالیں۔ امتداد زمانہ کے باوجود کسی جگہ تضاد واقع نہیں ہوگا۔ اسی طرح تخلیق آدم، نمو و زندگی کا متعدد جگہ تذکرہ کیا گیا ہے لیکن جو بات ایک جگہ کہی اس کی تفصیل دوسری جگہ ہے۔ سیاسی، عمرانی، معاشرتی، اصول و نظریات سے آپ موقع بہ موقع متعارف ہوں گے مگر کسی جگہ آپ ان میں کوئی ابہام و تضاد نہیں پائیں گے۔ چونکہ وحی میں کلی طور پر معروضیت (Objectivity) ہوتی ہے اور وہ علم خداوندی پر مبنی ہوتی ہے اس لئے عقلاً اس میں تضاد ممکن ہی نہیں ہے۔ پھر آیت خداوندی:

ولو كان من عند غير الله لو جدوا فيه اختلافا كثيرا۔ (۸۲:۴)

(ترجمہ) اور اگر یہ اللہ کے سوا اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بکثرت اختلاف پاتے۔

نے تو اس بات پر مہر تصدیق ثبت کر دی کہ وحی میں تضاد واقع نہیں ہو سکتا۔ لیکن ''احادیث رسول'' کا معاملہ بالکل اس کے نقیض ہے۔ ہر فرقے کی مختلف احادیث ہیں اور ہر فرقے کی احادیث دوسرے فرقے کی احادیث سے مختلف ہیں۔ مختلف فرقوں کی مختلف اور ایک دوسرے سے متضاد احادیث ہونا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ وہ وحی نہیں ہیں جبکہ ہر فرقہ کا قرآن ایک ہی ہے۔

وحی کے کسی بھی حصہ کو مسترد نہیں کیا جا سکتا:

پوری اور مکمل وحی پر ایمان لانا ضروری ہوتا ہے چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

افتؤمنون ببعض الكتاب و تكفرون ببعض (۸۵:۲)

(ترجمہ) کیا پس ایمان لاتے ہو ساتھ بعض کتاب کے اور کفر کرتے ہو ساتھ بعض کے۔

وحی کے بعض حصہ پر ایمان لانا اور بعض پر ایمان نہ لانے سے ایمان پورا نہیں ہوتا یہی وجہ ہے کہ اگر قرآن کریم کی کسی ایک آیت کا بھی انکار کر دیا جائے تو وہ کفر کے مترادف ہے اس کے برعکس روایات کی یہ پوزیشن نہیں ہے- ان سب پر ایمان لانا ضروری نہیں ہے- مختلف فرقوں کی روایات اور کتب روایات بھی مختلف ہیں- کوئی فرقہ کچھ روایات کو درست مانتا ہے اور بعض کچھ اور کو جو حضرات خارج از قرآن وحی کے قائل ہیں وہ بھی ہر روایت پر ایمان لانا ضروری خیال نہیں کرتے-

وحی کا تعلق عالم امر سے ہے- اقوال رسول کا تعلق عالم خلق سے ہے:

قرآن کریم نے روح کا لفظ وحی کے معنی میں استعمال کیا ہے چنانچہ ارشاد ہے:

(۱) رفیع الدرجات ذو العرش ج یلقی الروح من امر علی من یشآء من عبادہ لینذر یوم التلاق (۱۵ : ۴۰)

(ترجمہ) بلند درجوں والا ہے صاحب عرش کا' ڈالتا ہے روح کو حکم اپنے سے اوپر جس کے چاہتا ہے بندوں اپنے سے تاکہ ڈرائے دن ملاقات کے سے-

اسی طرح دوسری جگہ روح بمعنی وحی ارشاد ہے:

ینزل الملئکۃ بالروح من امرہ علی من یشاء من عبادہ (۲ : ۱۶)

(ترجمہ) فرشتوں کو اتارتا ہے ساتھ روح کے' اپنے حکم سے' اوپر جس کے چاہتا ہے اپنے بندوں سے-

چنانچہ سورۂ شوریٰ میں اوحینا فعل کا مفعول روح لاکر قطعی طور پر مہر تصدیق ثبت کر دی کہ روح کے معنی وحی کے ہی ہیں-

وکذالک اوحینا الیک روحا من امرنا ط (۵۲ : ۴۲)

(ترجمہ) اور اسی طرح وحی کی ہم نے تیری طرف روح کو اپنے حکم-

ان مقامات میں قرآن کریم نے روح کا لفظ وحی کے معنی میں استعمال فرمایا ہے اور ہر سہ جگہ وضاحت فرما دی کہ روح کا تعلق عالم امر سے ہے عالم خلق سے نہیں-

عالم امر کا تعلق خدا کی مشیت سے ہوتا ہے- وہاں علت و معلول کا کوئی سوال نہیں ہے- عالم امر کا سلسلہ اللہ تعالیٰ کی مرضی مشیت اور ارادہ پر منحصر ہوتا ہے اس کے برعکس عالم خلق کا تعلق علت و معلول سے ہے- اس میں ہر کام اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ قوانین اور ضوابط کے مطابق ہوتا ہے-

وحی ایک موہبت عظمیٰ ہوتی تھی جس میں نبی کی سوچ کا کوئی تعلق نہیں ہوتا تھا اس میں محض (Objectivity) معروضیت ہوتی تھی اور یہ عالم امر سے متعلق ہوتی تھی- اقوال رسول کا تعلق عالم خلق سے ہوتا ہے- جب کوئی مقدمہ حضور کے سامنے پیش ہوتا تھا- اس کے تمام کوائف حضور کے سامنے لائے جاتے تھے تو حضور ان تمام واقعات پر غور و فکر کرنے کے بعد اس کے نتائج اپنی بصیرت سے نکالتے تھے اور اس کو اپنے الفاظ میں بیان فرماتے تھے- وہ الفاظ حضور کے اپنی ذاتی بصیرت پر مبنی ہوتے تھے- یہ پورا عمل (Process) عالم خلق سے تعلق رکھتا ہے اس کا عالم امر سے کوئی تعلق نہیں جب کہ وحی کا تعلق خالصتاً عالم امر سے ہے-

وحی کی یہ دس خصوصیات قرآن کریم میں غور کرنے سے نمایاں ہیں- ان تمام خصوصیات کو اگر بغور دیکھا جائے تو ہر شخص اس نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے کہ صرف قرآن ہی ان خصوصیات کا حامل ہے اور صرف وہی وحی ہے- باقی جہاں تک روایات کا تعلق ہے وہ ان خصوصیات میں سے کسی ایک خصوصیت کی بھی حامل نہیں ہیں اور وحی شمار نہیں کی جاسکتیں-

وحی خداوندی کی مختلف اقسام اور خارج از قرآن وحی تسلیم کرنے کے ثبوت میں چند آیات پیش کی جاتی ہیں جن کی وضاحت اس جگہ غیر مناسب معلوم نہیں ہوتی- اس لئے پیش خدمت ہے:

پہلی آیت:

ان آیات میں سے پہلی آیت سورۃ الشوریٰ کی ہے-

وما کان لبشر ان یکلمہ اللہ الا وحیا او من ورآئ حجاب او یرسل رسولا فیوحی باذنہ مایشآء (۵۱ : ۴۲)

(ترجمہ) اور نہیں طاقت کسی آدمی کو کہ بات کرے اس سے خدا مگر جی میں ڈالنے سے یا پیچھے پردے سے یا بھیجے فرشتہ پیغام لانے والا بس جی میں ڈال دیوے ساتھ

حکم اس کے جو چاہتا ہے' تحقیق وہ بلند مرتبہ حکمت والا ہے-

اس آیت کریمہ سے خارج از قرآن وحی کی سند لائی جاتی ہے اور بیان کیا جاتا ہے کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایات موصول ہونے کی تین صورتیں بیان کی جارہی ہیں- پہلی براہ راست وحی (الہام والقاء) دوسری قسم پردے کے پیچھے سے کلام اور تیسری قسم اللہ کے پیغام رساں (ملک) کے ذریعے وحی- اور یہ نظریہ قائم کیا گیا کہ قرآن کریم میں جو وحی دی گئی ہے وہ آخری اور تیسری قسم کی وحی کے ذریعہ ہے- اس طرح قرآن کو تو صرف ایک قسم کی (یعنی پہلی قسم کی) وحی قرار دیا گیا اور باقی دو صورتیں وحی ملنے کی جو تھیں وہ اس وحی کے علاوہ ہیں اور وحی خارج از قرآن تیسری قسم کی وحی پر مشتمل ہے جو فرشتہ کے ذریعہ ارسال کی جاتی تھی-

لیکن یہ مفہوم بوجوہ بداہتہً غلط معلوم ہوتا ہے- جس کی وجوہات درج ذیل ہیں-

(۱) مفسرین کرام کے خیال کے مطابق یہ تینوں صورتیں انبیاء کرام سے مخصوص ہیں- حالانکہ آیت شریفہ میں صرف نبی یا رسول سے گفتگو کرنے کا تذکرہ نہیں ہو رہا ہے بلکہ تمام نوع انسانی سے خطاب کرنے کا ذکر ہو رہا ہے- اس لئے اس آیت کے صحیح مفہوم میں تمام نوع انسانی کو شامل کرنا ضروری ہے-

(۲) اگر یہ تینوں صورتیں وحی کی ہیں تو لفظ وحی کو محدود مفہوم میں لینا ہوگا- یعنی ایسی وحی جو بلا آواز اور بغیر جبرئیل کے ذریعے ہو- اس کی دوسری قسم میں صرف آواز ماننا ہوا اور تیسری قسم یہ ہوگی کہ جبرئیل آ کر وحی پہنچائیں حالانکہ قرآن کی وضاحت کے مطابق قرآن کریم جبرئیل کے ذریعے ہی آیا ہے فانه نزله علی قلبک (۲:۹۷)- اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وحی جب بھی آئی جبرئیل کے ذریعہ سے آئی ہے- اس لئے یہ کوئی تیسری قسم نہیں بن سکتی جو وحیاً اور من وراء حجاب سے الگ ہو-

(۳) جب یہاں رسول کے معنی بخوبی لگ سکتے ہیں تو فرشتہ معنی لینا مناسب نہیں ہے- کیونکہ جب لفظ اپنے اصلی معنی میں مستعمل ہو سکتا ہے تو وہی معنی لینا زیادہ مناسب ہے اور یہاں رسول کے معنی فرشتہ کرنے کے لیے کوئی خاص قرینہ بھی موجود نہیں ہے- قریبی معنی چھوڑ کے بعید معنی لینا مناسب نہیں ہے- نیز یہ کہ کلام الٰہی کی یہ تیسری قسم یعنی

بذریعہ فرشتہ پیغام ارسال کرنا تو خود ہی پہلی قسم وحیا میں داخل ہے- اصل بات یہ ہے کہ یہاں وحی کی نوعیں نہیں بتائی جارہی ہیں جس کی یہ تین قسمیں ہوں- یہ مکالمہ الٰہی کے تین طریقے بتائے جارہے ہیں- فرشتہ کا پیغام الٰہی پہنچانا بھی وحی ہے اور پہلے طریقے وحیا سے کوئی مختلف نہیں ہے-

یہ تمام نقائص دیکھتے ہوئے یہ تمام تراجم وتفاسیر درست معلوم نہیں ہوتیں- اب اس کا درست مفہوم غور اور توجہ سے ملاحظہ فرمائیں جو بالکل صاف ہے یہاں پوری نوع انسانی تک اللہ کی ہدایت موصول ہونے کا ذکر کیا جارہا ہے- انسانوں کی دو قسمیں ہیں- ایک رسول اور دوسرے رسولوں کے علاوہ تمام نوع انسانی' جیسا کہ اس آیت سے ظاہر ہے **فلنسئلن الذین ارسل الیھم ولنسئلن المرسلین** (۶:۷)- (پھر ہم تو ضرور ان لوگوں سے جن کی طرف پیغمبر بھیجے گئے تھے سوال کریں گے اور خود پیغمبروں سے بھی ضرور پوچھیں گے) سورۂ شوریٰ کی مذکورہ آیت کے پہلے حصہ میں رسولوں کا ذکر ہے کہ ان تک خدا کی ہدایت کس طرح پہنچتی ہے-

رسولوں کو ہدایت ملنے کے دو طریقے بتائے گئے ہیں- ایک وہ وحی جو جبرئیل لاتے تھے جیسا کہ حضور پر وحی آتی تھی یعنی جبرئیل کے ذریعہ' جس کی بابت ارشاد ہے **فانہ نزلہ علی قلبک** (۹۷:۲) اور دوسرا طریقہ فرشتے کے بغیر براہ راست اس طریقہ سے کہ آواز تو سنائی دے لیکن متکلم دکھائی نہ دے جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی ہوئی تھی اور جس کا ذکر سورۂ طٰہٰ میں ہوا ہے-

یہ مذکورہ بالا دو طریقے انبیاء کرام کے ساتھ مخصوص تھے-

اب رہے وہ تمام لوگ جن پر تمام بنی نوع بشر مشتمل ہے اور جو رسول نہیں ہیں تو ان کے ساتھ کلام خداوندی کا طریقہ یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ ان کی طرف اپنا رسول روانہ کرتا تھا اور اس رسول کی معرفت اپنا کلام عام انسانوں تک پہنچاتا تھا- یہ رسول ان کے درمیان واسطہ بنتا تھا- اللہ تعالیٰ تو رسول کے علاوہ کسی بھی بشر سے بات نہیں کرتا تھا اور وحی الٰہی یعنی علم خداوندی بھی انسانوں میں صرف انبیاء کرام کی طرف آتی تھی- رسولوں کے علاوہ عام انسانوں کو خدا کی وحی صرف انبیاء کرام کی معرفت ہی ملتی تھی-

آیت کریمہ کا جو درست مفہوم پیش خدمت کیا گیا ہے اس سے اگلی آیت نے اس مفہوم کو اور مستحکم کر دیا ہے۔ جہاں حضور کے متعلق ارشاد ہے کہ وکذلک اوحینا الیک روحا من امرنا ط (۴۲ : ۵۲) ہم نے اسی طرح جس طرح کہ ہم رسولوں کے ساتھ بذریعہ وحی کلام کرتے تھے تیری طرف بھی عالم امر سے وحی کی۔ یعنی حضور سے اللہ تعالیٰ کا یہ کلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح من وراء حجاب نہیں ہوا بلکہ جبرئیل کی لائی ہوئی وحی کے ذریعہ ہوا۔ اس کے بعد کہا کہ تو اس سے پہلے کتاب اور ایمان کے متعلق کوئی معلومات نہیں رکھتا تھا۔ آیت کے اس حصہ تک تو خدا کے اس کلام کا ذکر ہوا جو اس نے حضور کے ساتھ بذریعہ وحی کیا اس کے بعد ارشاد ہوا وانک لتھدی الی صراط مستقیم (۴۲ : ۵۲) اور اے رسول تو یقیناً لوگوں کی راہنمائی صراط مستقیم کی طرف کرتا ہے اور اس طرح عام عالم انسانی کو جو غیر از نبی ہیں کلام خداوندی پہنچاتا ہے۔

تائید مزید:

سورۂ شوریٰ کی اس معروف آیت کا عام طور پر جو مفسرین نے مفہوم لیا ہے۔ اس کی تردید اور اس کا درست مفہوم جو اس مضمون میں پیش کیا گیا ہے۔ اس کی تائید سورۂ یٰسین کی آیات بھی کر رہی ہیں جن سے یہ مطلب مستفاد ہوتا ہے کہ حضور کو وحی کے علاوہ الہام یا القاء نہیں ہوتا تھا تو سورۂ شوریٰ کی آیت کا مفسرین کا اخذ کردہ مفہوم خود غلط قرار پاتا ہے جس میں انہوں نے وحی کی پہلی قسم کو الہام یا القاء پر مشتمل قرار دیا ہے۔

حضور کو صرف قرآن تعلیم کیا گیا تھا:

وما علمنہ الشعر وما ینبغی لہ ان ھو الا ذکر و قران مبین (۳۶ : ۶۹)

(اور نہیں سکھایا ہم نے اس کو شعر اور نہیں لائق اس کے وہ نہیں وہ مگر ایک نصیحت اور کتاب روشن)۔

اس آیت کریمہ میں نفی واثبات کے حصر کے ساتھ واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ حضور کو جو بھی

تعلیم اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملی تھی وہ صرف اور صرف ذکر یعنی قرآن ہے- اس کے علاوہ ہر قسم کی تعلیم کے متعلق نفی کی گئی ہے کیونکہ یہاں ھو ضمیر کا مرجع تعلیم ہے- کہ جو بھی تعلیم دیا گیا ہے وہ صرف اور صرف ذکر یعنی قرآن ہے- ذکر کی وضاحت خود قرآن نے سورۂ حم سجدہ میں یوں فرمائی کہ ان **الذین کفروا بالذکر لما جآء ھم و انہ لکتب عزیز - لا یاتیہ الباطل من م بین یدیہ و لا من خلفہ ط تنزیل من حکیم حمید** (ترجمہ) تحقیق وہ لوگ کہ کافر ہوئے ساتھ ذکر کے جب آیا ان کے پاس اور تحقیق وہ البتہ ایک کتاب ہے عزت والی- نہیں آتا اس کے پاس جھوٹ آگے اس کے سے اور نہ پیچھے اس کے سے اتاری گئی ہے حکمت والے تعریف کئے گئے کی طرف سے-) اس آیت شریفہ نے ذکر کی وضاحت کر دی کہ ذکر قرآن ہے اور قرآن کے علاوہ کوئی دوسری چیز نہیں ہے- البتہ ایک اشکال یہاں ذکر اور قرآن کے درمیان والی واؤ کا بھی پیدا کیا جاتا ہے کہ یہ واؤ عاطفہ ہے- اس لئے قرآن اور ذکر دو مختلف چیزیں ہیں- لیکن صحیح بات یہ ہے کہ یہ واؤ عاطفہ نہیں ہے بلکہ واؤ بیانیہ ہے جو قرآن کریم میں بکثرت واقع ہوئی ہے چنانچہ ارشاد ہے **ھو الذی ارسل رسولہ بالھدی و دین الحق** - (اللہ وہ ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت یعنی دین کے ساتھ بھیجا-) اگر اس آیت میں واؤ کو واؤ عاطفہ سمجھا جائے جو مغائرت کی متقاضی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہدایت اور چیز ہے اور دین اور شئے ہے اور دین میں ہدایت نہیں ہے جو بالبداہت غلط ہے لہذا یہاں واؤ" واؤ بیانیہ ہی لی جا سکتی ہے- اسی طرح ذکر اور قرآن کے درمیان واؤ بیانیہ تفسیر یہ ہے جس کے معنی ہیں کہ حضور کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تعلیم صرف ذکر قرآن کیا گیا ہے اور حضور کو کوئی چیز الہام یا القاء نہیں کی گئی-

ویسے بھی جو حضرات الہام یا القاء کے قائل ہیں- ان کے نزدیک بھی وحی اور الہام کی مثال ایسی ہے جیسی کہ بجلی اور موم بتی- بجلی کی موجودگی میں موم بتی کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے- اسی طرح جس ہستی کو وحی جیسی روشن منور ہدایت ملتی ہو اسے الہام والقاء کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟

دوسری آیات جن سے وحی کی اقسام اور وحی خارج از قرآن تسلیم کی جاتی ہے سورۂ النجم کی ابتدائی آیات ہیں جن سے یہ نظریہ قائم کیا گیا ہے کہ چونکہ حضور کا مطلق نطق وحی ہے اس لئے

قرآن کے علاوہ حضور کے عام اقوال بھی وحی ہیں-

وما ینطق عن الھویo ان ھو الا وحی یوحی
(نہیں بولتا خواہش اپنی سے نہیں وہ مگر وحی کہ بھیجی جاتی ہے)
لیکن حضور کے ہر نطق کے وحی ہونے کے خلاف خود قرآن اور روایات میں بہت سے دلائل ہیں مثلاً:

(۱) حضور نے منافقین کو جب غزوۂ تبوک میں شرکت نہ کرنے کی اجازت عنایت فرمادی تو آیت کریمہ عفا اللہ عنک ج لم اذنت لھم حتی یتبین لک الذین صدقوا و تعلمْ الکاذبین (۴۳: ۹)- نازل ہوئی (اللہ کی عفو میں رہو- انہیں کیوں اذن دے دیا یہاں تک کہ تم کو معلوم ہو جائیں وہ جو سچ کہتے ہیں اور تم جان لو جھوٹوں کو) اب اگر آپ کا منافقوں کو اجازت دینا وحی سے تھا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس اجازت دلوانے کے بعد حضور سے اس کے متعلق یہ پوچھنے کا کیا مطلب؟ حضور کے قول اجازت کی تصویب کیوں نہ کر دی گئی- اس سے ظاہر ہے آنجناب کا منافقین کو اجازت دینا بر بنائے وحی نہیں تھا بلکہ یہ آپ کا بشری قول تھا-

(۲) دوسری مثال حضرت خویلہ بنت ثعلب کے واقعہ کی ہے کہ جب ان کے شوہر حضرت اوس بن صامتؓ نے انہیں ظہار کر دیا تو کچھ عرصہ کے بعد ان کو رجوع کرنے کی خواہش پیدا ہوئی لیکن چونکہ ظہار کر چکے تھے اس لئے رجوع کرنے میں انہیں سخت تردد و پس و پیش تھا- انہیں ہمت نہیں ہوتی تھی کہ خود حضور سے اس بارے میں استفسار کریں- انہوں نے حضرت خویلہ کو حضور کے پاس بھیجا کہ وہ اس معاملہ میں صحیح صورت حال معلوم کریں- حضور نے جب ان کا واقعہ سنا تو فرمایا کہ ظہار کے بعد وہ اپنے شوہر کے پاس نہیں جاسکتیں اور حضور نے ظہار کو طلاق قرار دیا لیکن حضرت خویلہ بار بار یہی اصرار کرتی تھیں کہ ظہار سے طلاق واقع نہیں ہوتی لیکن حضور اسے طلاق ہی گردانتے رہے لیکن فوراً ہی سورۂ مجادلہ کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں:

قد سمع اللہ قول التی تجادلک فی زوجھا و تشتکی الی اللہ و

الله یسمع تحاور کما ط ان الله سمیع م بصیر - الخ (۴-۱ : ۵۸)

اس قرآنی وحی نے حضور کے قول کی جو عموماً وحی سمجھا جاتا ہے تردید کر دی اور حضور کے قول کی تصویب نہ کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ حضور کا ہر قول وحی نہیں تھا اور وہ حضور کا بشری قول تھا-

(۳) سورۂ تحریم کی پہلی آیات مبارکہ کے متعلق روایات میں بہت تفصیل سے کام لیا گیا ہے جس کا مکمل طور پر تحریر کرنا مشکل ہے اس کا ملخص یہ ہے کہ حضور نے اپنی ازواج مطہرات کی خوشنودی کی خاطر اپنے لئے مغافیر کو حرام قرار دے دیا تھا چنانچہ آیت کریمہ:

یایھا النبی لم تحرم ما احل الله لک الخ (۱ : ۲۶)

نازل ہوئی جس میں حضور کے اس فعل کو نامناسب قرار دیا گیا-

آپ نے اپنی ازواج کی خوشنودی کے لیے وہ چیز کیوں حرام کر لی جو اللہ نے آپ کے لئے حلال قرار دی تھی- اسی طرح پہلے تو اللہ تعالٰی نے وحی خفی کے ذریعہ حضور سے ان کی ازواج کی خوشنودی کے لیے آپ پر شہد حرام کرا دیا پھر خود ہی وحی جلی کے ذریعہ اس فعل کو ناپسند فرما دیا اس سے ظاہر ہے کہ پہلا قول جس سے حضور نے اپنے اوپر مغافیر حرام قرار دیئے تھے وہ حضور کا اپنا بشری قول تھا وہ وحی ہرگز نہیں تھا-

(۴) حضور غزوۂ بنی **مصطلق** کے لئے تشریف لے گئے- حضرت عائشہؓ آپ کے ہمراہ تھیں- جب غزوہ سے فارغ ہوئے تو آپ نے رات کے وقت واپس روانگی کا اعلان کر دیا- اس وقت حضرت عائشہؓ رفع حاجت کے لیے باہر گئی ہوئی تھیں- ان کی عدم موجودگی میں قافلہ روانہ ہو گیا- جب آپ واپس آئیں تو قافلہ جا چکا تھا- آپ وہیں بیٹھ گئیں- حضور نے حضرت **صفوانؓ** کو گری ہوئی چیزیں اٹھانے کے لیے پیچھے چھوڑا ہوا تھا- انہوں نے حضرت عائشہؓ کو اپنے اونٹ پر بٹھا کر دوپہر کے وقت قافلہ میں پہنچا دیا- روایت کہتی ہے کہ اس پر حضرت عائشہؓ پر الزام لگایا گیا اور ایک ماہ تک اس کا چرچا رہا- حضرت نے صحابہؓ کو مسجد میں جمع کیا اور ممبر پر بیٹھ کر ارشاد فرمایا "بخدا میں

اپنے گھر والوں میں بھلائی ہی دیکھتا ہوں اور جو تہمت لگائی ہے اس میں بھی بھلائی ہی دیکھتا ہوں۔''

''حضور نے حضرت علیؓ اور اسامہؓ بن زید کو جب وحی اترنے میں دیر ہوئی۔ بلایا۔ اور اپنی بیوی کو جدا کرنے کے متعلق مشورہ کرنے لگے۔ چونکہ جانتے تھے کہ آپ کو اپنی بیویوں سے محبت ہے اس لئے انہوں نے ویسا ہی مشورہ دیا اور کہا یارسول اللہ میں آپ کی بیویوں میں بھلائی ہی جانتا ہوں۔ لیکن حضرت علیؓ نے عرض کیا۔ یارسول اللہ آپ پر تنگی نہیں ہے۔ ان کے علاوہ عورتیں بہت ہیں اور لونڈی بریرہ سے دریافت کیجئے وہ آپ سے سچ سچ بیان کریں گی۔ رسول اللہ نے بریرہ کو بلایا اور فرمایا' اے بریرہ کیا تو نے عائشہ میں کوئی ایسی بات دیکھی ہے جو تجھے شبہ میں ڈال دے۔''

حدیث کے اس حصہ تک دو یا تین قابل غور باتیں ہیں۔ ''وحی اترنے میں دیر ہوئی کے الفاظ نہایت غور طلب ہیں۔ اسی حدیث میں آگے بیان ہوا ہے کہ ایک مہینہ بھر وحی بند رہی۔ تو اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب حضور کا ہر قول وحی تھا تو وحی اترنے میں دیر ہونے کے کیا معنی؟ پھر اس پورے ماہ میں حضور نے جو کلام فرمایا۔ وہ وحی کیوں نہیں تھا؟ پھر اپنی بیوی کو جدا کرنے کے لیے حضرت علیؓ اور حضرت اسامہؓ سے مشورے کے کیا معنی؟ کیا ان حضرات سے وحی نے مشورہ کیا تھا۔ واضح رہے کہ حضور کا ان حضرات سے مشورہ کرنا اور بریرہ سے دریافت کرنا حضور کا بشری کلام تو ہو سکتا ہے وحی الٰہی ہرگز نہیں ہو سکتی۔

روایت میں لکھا ہے کہ حضرت عائشہ فرماتی ہیں۔

''ایک مہینہ بھر انتظار کرتے رہے۔ لیکن میری شان میں کوئی وحی نازل نہیں ہوئی۔ آپ نے تشہد پڑھا اور پھر فرمایا۔ اے عائشہ تمہارے متعلق مجھے ایسی خبر ملی ہے۔ اگر تو بری ہے تو اللہ تعالیٰ تیری پاکیزگی ظاہر کر دے گا اور اگر تو اس میں بری ہوگی تو اللہ سے مغفرت طلب کر اور توبہ کر۔ اس لیے کہ جب بندہ گناہ کا اقرار کرتا ہے پھر توبہ کر لیتا ہے تو اللہ اس کی توبہ قبول کر لیتا ہے۔''

روایت کا یہ اقتباس ''بخدا میں اپنے گھر والوں میں بھلائی ہی دیکھتا ہوں۔'' گذرا ہے اس میں لفظ بخدا قسم کے لیے آیا ہے عربی متن کے الفاظ میں ''فو اللہ ما علمت علی اھلی

الاخیــرا" فواللہ کے الفاظ میں روایت نے حضور کی طرف قسماً منسوب کیا ہے کہ آپ نے قسم کھا کر کہا کہ میں اپنے گھر والوں میں بھلائی ہی دیکھتا ہوں- برائی نہیں دیکھتا ہوں-قسم کھانے والے کو جب تک سو فیصدی یقین نہ ہو قسم نہیں کھا سکتا-مگر روایت نے حضور کی طرف تشہد کے ذریعہ قسماً منسوب کیا ہے کہ آپ نے حضرت عائشہ سے کہا کہ اگر تو برائی میں مبتلا ہو گئی ہے تو اللہ سے مغفرت طلب کر اور توبہ کر-

تو اب غور طلب بات یہ ہے کہ روایت نے دو متضاد چیزیں حضور کی طرف آپ سے قسم اٹھوا کر منسوب کی ہیں-

(۱) حضرت عائشہؓ کا تہمت سے بری ہونا-

(۲) اور بری نہ ہونا بھی-

فواللہ کی قسم کے ساتھ آپ نے حضرت عائشہ کو بری قرار دیا اور تشہد کی قسم اٹھا کر شک پیدا کر دیا کہ اگر تو مبتلا ہو گئی ہے تو توبہ کر-

اب غور فرمائیں کہ یہ کیا دو متضاد قسمیں وحی الہی ہو سکتی ہیں-کیا حضور کے دونوں متضاد قول وحی متضاد ہو سکتے ہیں-

اختصار کے پیش نظر تین آیات اور ایک حدیث پیش خدمت کی گئی ہیں جن سے یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ حضور کا ہر قول وحی نہیں تھا-

سورۂ نجم کی آیات کا صحیح مفہوم:

اس تمہید کے بعد سورۂ نجم کی ابتدائی آیات کریمات کا مفہوم پیش خدمت کیا جاتا ہے اس میں اصل غلطی یہ ہوئی ہے کہ ھو ضمیر کا مرجع بجائے نجم یعنی قرآن کے ینطق کو قرار دیا گیا ہے اور اسی طرح مطلق نطق رسول کو وحی قرار دے کر ہر قول رسول کو وحی ٹھہرایا گیا ہے جو سابقہ تحریر شدہ صفحات کی رو سے کسی طرح درست معلوم نہیں ہوتا بلکہ صحیح صورت حال کے مطابق ان آیات میں ھو ضمیر کا مرجع النجم یعنی ستارہ ہدایت قرآن ہے- والنجم اذا ھوی (۵۳:۴) (ترجمہ) شہادت ہے قرآن کی جب کہ وہ نازل ہوا کہ تمہارا یہ ساتھی نہ گمراہ ہوا ہے نہ بھٹک گیا ہے- وہ (وحی کے ضمن میں) بولتا ہے تو نہیں ہوتا وہ مگر وہی جو اس کی طرف وحی کیا جاتا ہے پس ان ھوا الا وحی یوحی

میں ھو ضمیر کا مرجع النجم یعنی قرآن کریم ہے۔

صرف قرآن ہی کے وحی ہونے کے قرآنی دلائل:

سورۂ انعام میں ارشاد ہوا: اتبع ما اوحی الیک من ربک ج (۱۰۶ : ۶)۔
(ترجمہ) پیروی کر اس چیز کی کہ وحی کی گئی ہے تیری طرف رب تیرے سے)

دوسری جگہ ارشاد ہوا۔

ان اتبع الا ما یوحی الی (۱۵ : ۱۰)

(نہیں پیروی کرتا ہوں میں مگر اس چیز کی کہ وحی کی گئی ہے میری طرف)۔

پہلی آیت کریمہ میں حضور کو ما اوحی کی اتباع کا حکم دیا گیا ہے اور دوسری آیت میں حضور کی شہادت بیان کی گئی ہے کہ میں سوائے ما یوحی کے کسی چیز کی اتباع نہیں کرتا خدا اور رسول کی ان شہادتوں سے ثابت ہے کہ حضور صرف اور محض ما یوحی کے ہی متبع اور عامل تھے اور علاوہ ما یوحی کے آپ نے کسی چیز کا اتباع نہیں کیا۔ نحوی لحاظ سے چونکہ ما موصولہ کو مبہم سمجھا گیا ہے اس لئے اس میں تعمیم اور وسعت کی گنجائش تھی اسی وجہ سے اس میں وسعت دے کر اقوال رسول کو بھی وحی قرار دیا گیا ہے۔ لہذا ما یوحی کی توضیح (Definition) کے لئے دو شہادات پیش کی جاتی ہیں۔ ایک شہادت تو خود وحی کی ہوگی کہ ما یوحی کیا چیز ہے اور دوسری شہادت موحی الیہ یعنی حضور کی ہوگی کہ ان کی طرف کون سی چیز وحی کی گئی ہے۔ چنانچہ ارشاد حضرت باری تعالی ہے:

و کذالک اوحینا الیک قرآنا عربیا (۷: ۴۲)۔

اور اسی طرح وحی کیا ہم نے طرف تیری قرآن عربی۔

و اوحی الی ھذا القران (۱۹ : ۶)

اور وحی کیا گیا ہے طرف میری یہ قرآن۔

آیت نمبر 1: میں اللہ تعالی کی شہادت ہے کہ اے ہمارے رسول ہم نے تیری طرف اپنا قرآن وحی کیا ہے اور آیت نمبر 2۔ میں جس کی طرف بھیجا گیا ہے یعنی حضور کی شہادت ہے کہ اے

لوگو-میری طرف یہ قران وحی کیا گیا ہے-ان دوشہادتوں کی موجودگی میں واضح ہے کہ حضور نے ہمیشہ صرف قرآن کی ہی اتباع کی ہے اور غیر از قرآن کی اتباع حضور نے کبھی نہیں کی ہے-

دلیل نمبر۲- **امن الرسول بما انزل الیہ من ربہ و المؤمنون ط کل امن باللہ و ملئکتہ و کتبہ و رسلہ- (۲:۲۸۵)-**

(ترجمہ) ایمان لایا پیغمبر ساتھ اس چیز کے کہ اتاری گئی ہے طرف اس کے پروردگار اس کے سے اور مسلمان ہر ایک ایمان لایا ساتھ اس کے اور فرشتوں اس کے سے' اور کتابوں اس کی ہے اور رسولوں اس کے کے)-

آیت بالا سے ظاہر ہے کہ انبیاء کرام پر کتاب کے علاوہ کوئی چیز نازل نہیں ہوئی تھی ورنہ ایمان صحابہ کی تعریف میں **کتبہ** کے ساتھ وہ بھی درج ہوتی نیز یہ کہ کتب نے **ما انزل اللہ** کی خود وضاحت کردی کہ **ما انزل اللہ** صرف کتاب ہے اور ایمان صرف کتاب پر لانا ضروری ہے- مومن کا ایمان تو جب ہی درست ہے جب کہ وہ انہیں چیزوں پر ایمان لائے جن پر حضور اور آپ کے صحابہ کرامؓ ایمان لائے تھے-اس آیت کریمہ سے تو یہی ظاہر ہے کہ خود حضور اور صحابہ کرامؓ ان چار چیزوں پر ایمان لائے تھے-

(۱) اللہ تعالیٰ (۲) ملائکہ (۳) کتب (۴) رسل-غیر از کتاب وحی پر ایمان لانے کا کوئی ذکر اس آیت میں نہیں ہے مزید یہ کہ حضور کا ارشاد گرامی ہے کہ **امنت بمآ انزل اللہ من کتب (۴۲:۱۵)**- بھی قطعی حجت ہے کہ حضور خود بھی صرف کتاب پر ایمان لائے تھے-کتاب کے علاوہ بھی اگر حضور پر کوئی وحی ہوتی تو حضور یقیناً اس پر بھی ایمان لاتے اور اس آیت کریمہ میں بھی اس کا ذکر ضرور کیا جاتا-

حصر نزول:

افمن یعلم انمآ انزل الیک من ربک الحق کمن ھو اعمی ط (۱۳:۱۹)
(ترجمہ) کیا پس جو شخص کہ جانتا ہے یہ کہ جو کچھ اتارا ہے طرف تیری پروردگار تیرے سے سچ ہے مانند اس کے ہے کہ وہ اندھا ہے-

آیت ہذا میں **انما** کلمہ حصر ہے جس سے بالتحقیق ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے حضور

کی طرف حق یعنی قرآن کریم کے علاوہ کوئی اور چیز نازل نہیں کی گئی اور فقط قرآن ہی نازل کیا گیا ہے ایسے کلمہ حصر کے ہوتے ہوئے قرآن کے علاوہ کسی اور کتاب کو وحی کیسے شمار کیا جا سکتا ہے؟ اس آیت میں ما تعمیم کا ہے اور مراد یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو تیرے رب کی طرف سے نازل کی گئی ہے وہ صرف حق ہے یعنی قرآن ہے اور حق یعنی قرآن کے علاوہ کوئی اور چیز نازل نہیں کی گئی ہے۔

دلیل نمبر۴:

المص ج٥ کتب انزل الیک فلا یکن فی صدرک حرج منه لتنذربه و ذکری للمؤمنین ٥ اتبعوا مآ انزل الیکم من ربکم ولا تتبعوا من دونه اولیآء ط قلیلا ما تذکرون (۷ : ۱)

(ترجمہ) یہ کتاب تم پر اس غرض سے نازل کی گئی ہے تاکہ تم اس کے ذریعہ سے ڈراؤ۔ اور ایمان والوں کے لیے نصیحت کا باعث ہو۔ پس تمہارے دل میں اس کی وجہ سے کوئی تنگی پیدا نہ ہو۔ (لوگو) جو تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے اس کی پیروی کرو اور اس کے سوا دوسرے سرپرستوں کی پیروی نہ کرو۔ تم لوگ تو بہت ہی کم نصیحت قبول کرتے ہو۔

پہلی دو آیات کریمات میں بیان فرمایا کہ کتاب نازل کی گئی ہے۔ متصلاً آیت نمبر۳ میں تاکید فرمائی کہ جو کچھ بھی نازل کیا گیا ہے اس کی اتباع کرو۔ دونوں آیات پر غور کرنے سے ظاہر ہے کہ کتاب اور ما انزل ایک ہی چیز ہے کیونکہ دونوں کے لیے انزل کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

دلیل نمبر۵:

فاستمسک بالذی اوحی الیک ج انک علی صراط مستقیم ٥ و انه لذکر لک و لقومک و سوف تسئلون (۴۴-۴۳ : ۴۳)۔

(ترجمہ) تو تمہارے پاس جو وحی بھیجی گئی ہے تم اسے مضبوط پکڑے رہو۔ اس میں شک ہی نہیں کہ تم سیدھی راہ پر ہو۔ اور یہ تمہارے لیے اور تمہاری قوم کے لیے نصیحت ہے اور عنقریب ہی تم لوگوں سے باز پرس کی جائے گی۔

اس آیت کریمہ میں اوحی الیک کی وضاحت خود ہی فرمادی کہ اوحی الیک کا مطلب "ذکر" ہے اور ذکر کی توضیح سورۂ انبیاء میں فرمائی کہ وھذا ذکر مبارک انزلنه–اور یہ (قرآن) ذکر ہے برکت والا ہے اتارا ہے ہم نے اس کو دونوں آیات سے ظاہر ہے کہ اوحی الیک "ذکر" یعنی قرآن ہے–

دلیل نمبر۶:

ان الذین یکتمون مآ انزلنا من البینت و الهدی من بعد مابینه للناس فی الکتب لا اولئک یلعنهم الله و یلعنهم اللعنون (۱۵۹ : ۲)–

(ترجمہ) بے شک جو لوگ ان روشن دلیلوں اور ہدایتوں کو جنہیں ہم نے نازل کیا– اس کے بعد چھپاتے ہیں جبکہ ہم کتاب میں لوگوں کے سامنے صاف صاف بیان کر چکے–تو یہی لوگ ہیں جن پر خدا بھی لعنت کرتا ہے اور لعنت کرنے والے بھی لعنت کرتے ہیں–"

اس آیت سے واضح ہے کہ ما انزل کی وضاحت تبئین کتاب میں دی گئی ہے اور ما انزل کا کوئی حصہ بھی کتاب سے باہر نہیں ہے اور ما انزل کا کتاب سے باہر ہونے کا تصور قرآن کے خلاف ہے–

دلیل نمبر۷:

وانزلنا الیک الکتاب بالحق مصدقا لما بین یدیه من الکتب و مهیمنا علیه فاحکم بینهم بمآ انزل الله ولا تتبع اهوآء هم عما جآءک من الحق (۵:۴۸)–

(ترجمہ) اور ہم نے تم پر حق کتاب نازل فرمائی کہ جو کتاب (اس کے پہلے سے) اس کے وقت میں موجود ہے اس کی تصدیق کرتی ہے اور اس کی نگہبان (بھی) ہے–تو جو کچھ تم پر خدا نے نازل کیا ہے اسی کے مطابق تم بھی حکم دو اور جو حق بات خدا کی طرف سے آپ کو ملی ہے اس سے کترا کے ان لوگوں کے خواہش نفسانی کی

پیروی نہ کرو۔

اس آیت حمیدہ میں الکتب اور ما انزل ایک ہی چیز کے لئے استعمال کئے گئے ہیں جو کہ قرآن کریم ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ما انزل صرف کتاب ہے اور اس کے علاوہ کوئی دوسری چیز ما انزل میں شریک نہیں ہے۔

دلیل نمبر ۸:

واذا تتلی علیھم ایتنا بینت قال الذین لا یرجون لقآء نا ائت بقران غیر ھذآ او بدلہ (۱۰:۱۵)۔

(ترجمہ) اور جب ان لوگوں کے سامنے ہماری روشن آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو جن لوگوں کو ہماری حضوری کا کھٹکا نہیں ہے وہ کہتے ہیں کہ ہمارے سامنے اس کے علاوہ کوئی دوسرا قرآن لاؤ یا اس کو ردوبدل کر ڈالو۔

اس آیت کریمہ سے واضح ہے کہ حضور سے جن لوگوں نے غیر قرآن طلب کیا اور اس کو بدل ڈالنے کی خواہش ظاہر کی وہ قیامت کے منکر تھے نیز یہ معلوم ہوا کہ غیر قرآن طلب کرنا ملاقات خداوندی کے منکرین کا شیوہ تھا۔ دوسرے یہ بات معلوم ہوئی کہ حضور قرآن کریم کی ہی تعلیم دیتے تھے جب ہی تو منکرین قیامت نے غیر قرآن طلب کیا ورنہ ان کا غیر قرآن طلب کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا لیکن حضور نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ **قل ما یکون لی ان ابدلہ من تلقائی نفسی ان اتبع الا ما یوحی الی (۱۰:۱۵)**۔ (ترجمہ) اے رسول تم کہہ دو! مجھے یہ اختیار نہیں کہ میں اسے اپنے جی سے بدل ڈالوں۔ میں تو صرف اسی کا پابند ہوں جو میری طرف وحی کی گئی ہے۔

حضور نے قرآن کریم کے غیر یعنی غیر قرآن کے پیش کرنے کو اور اس کی تعلیم دینے کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی قرار دیا اور غیر قرآن کی تعلیم پیش کرنے پر بڑے دن کے عذاب کا خوف بتلایا۔ یہ کس طرح ممکن ہے حضور نے قرآن کے علاوہ کسی چیز کی تعلیم دی ہو اس آیت میں **ان اتبع الا ما یوحی الی** کلام غیر موجب ہے اور مستثنیٰ منہ مذکور نہیں ہے۔ لہٰذا یہاں **الا حصر** کا فائدہ دیتا

ہے اس لئے حضور کی تعلیم صرف ما یوحی یعنی قرآن کریم ہی ہے۔

مزید یہ کہ اس آیت میں بھی اور کئی مقامات قرآنی کی طرح قرآن اور ما یوحی کو ایک ہی معنی میں استعمال کیا گیا ہے جس سے ثابت ہے کہ ما یوحی صرف قرآن ہے۔

دلیل نمبر ۹:

قل انما اتبع ما یوحی الی من ربی ھذا بصائر من ربکم و ھدی و رحمۃ لقوم یومنون واذا قری القرآن فاستمعوا لہ وانصتوا لعلکم ترحمون (۷:۲۰۳)۔

(ترجمہ) کہہ دو! سوائے اس کے نہیں کہ میں پیروی کرتا ہوں اس چیز کی کہ وحی کی جاتی ہے میری طرف۔ رب میرے سے۔ یہ دلیلیں ہیں پروردگار تمہارے سے اور ہدایت اور رحمت واسطے اس قوم کے ایمان لاتے ہیں اور جب پڑھا جاوے قرآن پس سنو اس کو اور چپکے رہو تا کہ رحم کئے جاؤ۔

ان آیات سے بخوبی روشن ہے کہ ما یوحی صرف بصائر ہدی اور رحمت ہیں جو مختلف مقامات پر صرف قرآن کریم کے لئے استعمال کئے گئے ہیں اور صرف انہیں کی اتباع کا حکم دیا گیا ہے نیز اگلی متصل آیت میں مزید وضاحت فرمائی کہ یہ ما یوحی جو بصائر وہدی ورحمۃ پر مشتمل ہے صرف قرآن کریم ہے جس کے لئے خاموشی سے سننے کی تاکید فرمائی گئی ہے۔

دلیل نمبر ۱۰:

وقال الذین کفروا لن نومن بھذا القرآن ولا بالذی بین یدیہ (۳۴:۳۱)۔

(ترجمہ) اور جو لوگ کافر ہوئے کہتے ہیں کہ ہم نہ تو ان پر ایمان لائیں گے اور نہ اس (کتاب) پر جو اس سے پہلے نازل ہو چکی۔''

اس آیت میں کفار نے قرآن کریم کے ساتھ سابقہ کتب کے انکار کا تو ذکر کیا ہے مگر کسی مثلہ معہ کا ذکر تک نہیں کیا۔ اگر قرآن کریم کے علاوہ اور بھی کوئی وحی حضور کو ملی ہوتی تو کفار سابقہ کتب

کے بجائے قرآن کے ساتھ اس کا ذکر کرتے۔

قرآن کریم کی آیات سے ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ وحی صرف اور صرف قرآن میں ہی محفوظ ہے اس کے باہر وحی کا ایک لفظ بھی نہیں ہے (جن حضرات کو اس بارے میں مزید دلائل درکار ہوں وہ دوسرا مضمون موسوم بہ "وحی صرف قرآن میں ہے" ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔

اس مختصر سے مضمون میں حتی الامکان اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ نہایت محتاط اور مہذب طریقہ سے اپنا نقطہ نگاہ قرآن کریم کی آیات کے ساتھ ثابت کر دیا جائے اور کوئی لفظ یا جملہ قصداً ایسا استعمال نہیں کیا گیا جو کسی صاحب کو ناگوار خاطر گذرے کیونکہ اصل مقصود صرف موضوع کی وضاحت ہے۔ قارئین کرام سے درخواست ہے کہ وہ اس اہم موضوع پر نہایت سنجیدگی اور شرح صدر سے غور فرمائیں اور اس موضوع پر زیادہ سے زیادہ قرآن کریم سے استفادہ فرمائیں۔

وهہنا تم هنا الکلام

علی مصطفنا الوف سلام

وحی صرف قرآن میں ہے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وحی صرف قرآن میں ہے

چونکہ عقل انسانی مسائل حیات کا صحیح حل پیش کرنے سے قاصر ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کاملہ اور حکمت بالغہ کے باعث نوع انسان کی مسلسل رہنمائی فرمائی اور متواتر' پے در پے انبیاء کرام مبعوث فرمائے تا کہ ان کے توسط سے انسان کو ہدایت خداوندی حاصل ہوتی رہے۔ تمام انبیاء کرام کو وحی الٰہی سے نوازا گیا اور جب سلسلہ بعثت انبیاء کرام منقطع کیا گیا تو آخری وحی کو قرآن کریم کے اندر محفوظ کر دیا گیا اور اس کی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لی۔

وحی الٰہی صرف قرآن کریم میں محفوظ ہے۔ خارج از قرآن وحی کا تصور باطل ہے۔ امت مسلمہ کی بد قسمتی کا وہ پہلا دن تھا جس دن یہ نظریہ قائم کیا گیا کہ کچھ وحی قرآن کے اندر ہے اور کچھ وحی قرآن کے باہر۔ یہ عقیدہ اپنے اپنے نظریات کو Justify کرنے کے لئے قائم کیا گیا تھا اور اس نے مسلمانوں میں ایک مستقل عقیدہ کی شکل اختیار کر لی اور ان کی تباہی کا باعث بنا۔ اس سے ایک ایسا چور دروازہ کھل گیا کہ ہر عقیدہ کو وحی الٰہی قرار دے کر حضور کی طرف منسوب کر دیا گیا لیکن قرآن کریم سے اس عقیدہ کی کوئی سند نہیں ملتی۔ قرآن عزیز سے یہی واضح ہوتا ہے کہ وحی الٰہی صرف اور صرف قرآن کریم میں محفوظ ہے۔ چنانچہ اس نظریہ کی تائید میں قرآنی دلائل اور اس کے بعد عقلی دلائل پیش کئے جائیں گے۔ آخر میں ان الزامی جوابات اور اشکالات کو واضح کرنے کی کوشش کی جائے گی جو علمائے کرام کی طرف سے وحی کو صرف قرآن کریم میں محفوظ ماننے پر وارد کئے جاتے ہیں۔ وما توفیقی الا باللہ۔

وحی صرف قرآن میں ہونے کے دس دلائل۔

(۱) مُوحی (اللہ تعالیٰ) کا ارشاد گرامی ہے کہ اوحینا الیک ھذا القرآن اور وحی الیہ (حضورؐ) کا ارشاد ہے اوحی الی ھذا القرآن (۶/۱۰) ھذا کا اسم اشارہ ساتھ لانے سے حصر کر دیا گیا کہ یہی قرآن ہم نے نازل کیا اور یہی قرآن مجھ پر نازل کیا گیا۔ دونوں آیات سے واضح ہوتا ہے کہ قرآن کے علاوہ کسی چیز کو وحی کرنے

کی خبر قرآن میں نہیں ہے-

۲- واوحی الی هذا القرآن لا نذرکم به ومن بلغ (۶/۱۹) مجھ پر یہ قرآن نازل کیا گیا ہے تاکہ میں تمہیں اس کے ذریعہ ڈراؤں اور ہر وہ شخص جس کے پاس یہ پہنچے وہ بھی اس کے ذریعہ ڈرائے-

قل انما انذرکم بالوحی- کہہ دو بجز ایں نیست کہ میں تمہیں وحی کے ذریعہ ڈراتا ہوں پہلی آیت میں انذار بذریعہ قرآن فرمایا اور دوسری آیت میں انذار بذریعہ وحی جس سے ثابت ہے کہ وحی قرآن کریم ہے- وحی اور قرآن کے الفاظ ایک دوسرے کی جگہ متبادل طور پر استعمال کئے گئے ہیں- دونوں الفاظ ایک دوسرے کی جگہ Subjsitute کر دیئے گئے ہیں-

۳- انا انزلنا الیک الکتاب بالحق لتحکم بین الناس بما ارک الله (۴/۲۰) فاحکم بینهم بما انزل الله (۵/۱۰۸)

پہلی آیت کریمہ میں حکم ہے کہ ہم نے تیری طرف کتاب نازل کی تاکہ تو لوگوں کے درمیان حکومت کرے یا فیصلے کرے- بذریعہ اس علم کے جو تجھے قرآن کریم سے حاصل ہوا- دوسری آیت مجیدہ میں حکم ہے کہ بما انزل الله کے مطابق فیصلہ کر دونوں آیات کریمات میں کتاب اور بما انزل الله ایک ہی چیز کے لئے استعمال کیا گیا ہے اور دونوں الفاظ ایک دوسرے کے متبادل استعمال کئے گئے ہیں جس سے ثابت ہے کہ کتاب اور بما انزل الله ایک ہی چیز ہے-

مایوحی الیک اور قرآن ایک دوسرے کے متبادل استعمال کئے گئے ہیں-

۴- فلعلک تارک بعض مایوحی الیک وضائق به صدرک ان یقولوا لولا انزل علیه کنز اوجاء معه ملک' انما انت نذیر- والله علی کل شیی وکیل- ام یقولون افترائه' قل فاتوا بعشر سور مثله مفتریت وادعوا من استطعتم من دون الله ان کنتم صادقین (۱۱/۱۲)

(ترجمہ) جو چیز تمہارے پاس وحی کے ذریعے بھیجی ہے ان میں سے بعض کو شاید تم فقط

اس خیال سے چھوڑ دینے والے ہواور تم تنگدل ہوتے ہو کہ مبادا یہ لوگ کہہ بیٹھیں کہ ان پر خزانہ کیوں نہیں نازل کیا گیا ان کے ساتھ کوئی فرشتہ کیوں نہیں آیا-تم تو صرف ڈرانے والے ہو- اور خدا ہر چیز کا ذمہ دار ہے کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس شخص نے (قرآن) اپنی طرف سے گڑھ لیا ہے تو تم کہہ دو کہ اگر تم سچے ہو تو ایسی دس سورتیں بنا لاؤ اور خدا کے سوائے جس جس کو تم بلا سکو مدد کے لئے بلا لو-

(از ترجمہ شاہ عبدالقادر مرحوم)

وما كان هذا القرآن ان يفترى من دون الله ولكن تصديق الذى بين يديه و تفصل الكتب لا ريب فيه من رب العالمين ام يقولون افتره قل فاتوا بسورة مثله وادعوا من استطعتم من دون الله ان كنتم صادقين ٥

(۱۰-۶۳)

ترجمہ: اور یہ قرآن ایسا نہیں ہے کہ اللہ کے سوا کوئی اور اپنی طرف سے جھوٹ موٹ بنا لے بلکہ یہ تو جو کتابیں پہلے کی اس کے سامنے موجود ہیں اس کی تصدیق اور ان کتابوں کی تفصیل ہے- اس میں کوئی شک نہیں کہ سارے جہان کے پروردگار کی طرف سے ہے کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس کو رسول نے جھوٹ موٹ بنا لیا ہے- اے رسول تم کہو کہ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو ایک ہی سورت اس کے برابر کی بنا لاؤ اور خدا کے علاوہ جسے چاہو بلا لو-

پہلی آیت میں افتری کا الزام مایوحی کے لئے ہے- دوسری آیت میں افتری کا الزام قرآن کریم کے متعلق بیان کیا گیا ہے- پہلی آیت میں ما یوحی الیک کے لئے تحدی کی گئی ہے کہ اس کے مقابلہ کی دس سورتیں بنا لاؤ- دوسری آیت میں قرآن کریم کے لئے Challange کی گئی ہے کہ قرآن کریم جیسی کوئی سورۃ بنا لاؤ- دونوں آیات کو ساتھ پڑھنے سے نتیجہ بالکل واضح ہے کہ مایوحی صرف قرآن کریم ہے- علاوہ ازیں دونوں آیات کے الفاظ تک ایک جیسے ہیں-صرف اتنا فرق ہے کہ جس چیز کو پہلی آیت شریفہ میں مایوحی کہا گیا ہے اس کو دوسری آیت میں قرآن کہا

گیا ہے تاکہ معلوم ہو کہ وحی صرف قرآن عزیز میں ہے- دونوں الفاظ کو ایک دوسرے کے متبادل استعمال کیا گیا ہے-

وحی صرف متلو ہے

۵- ہمارے ہاں عقیدہ کے طور پر وحی کو دو قسموں میں منقسم کیا ہوا ہے- ایک وحی متلو جو قران کریم میں محفوظ ہے اور دوسری وحی غیر متلو جو قرآن کے باہر ہے- ان کے لئے وحی جلی اور وحی خفی کے الفاظ بھی علی الترتیب استعمال کئے جاتے ہیں- مگر قرآن کریم کا ارشاد ہے- وحی ساری کی ساری صرف متلو ہے- لہذا قرآن کے اندر محفوظ-

کذالک ارسلناک فی امة قد خلت من قبلها امم لتتلوا علیهم الذی اوحینا الیک وهم یکفرون بالرحمن- (۳۳-۱۳)

اے رسول اسی طرح ہم نے تم کو اس امت میں بھیجا ہے جس سے پہلے اور بہت سی امتیں گذر چکی ہیں تاکہ تم ان کے سامنے اس کی تلاوت کرو جو ہم نے تمہیں وحی کیا ہے-

اس آیت کریمہ سے واضح ہے کہ مطلق مایوحی متلو ہے جس کی تلاوت حضور فرمایا کرتے تھے- اور وحی ساری متلو ہے جو قرآن میں محفوظ ہے- غیر متلو وحی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا-

امت صرف قرآن کی وارث ہے وحی خارج از قرآن کی وارث نہیں

۶- **والذی اوحینا الیک من الکتب هوا الحق مصدقا لما بین یدیه ان الله لعباده خبیر بصیر- ثم اورثنا الکتب الذین اصطفینا من عبادنا (۳۵-۲۵)**

(ترجمہ) اور ہم نے جو کتاب تمہارے پاس وحی کے ذریعے بھیجی وہ بالکل ٹھیک ہے اور جو (کتابیں اس سے پہلے کی) اس کے سامنے ہیں یہ ان کی تصدیق بھی کرتی ہے- بیشک خدا اپنے بندوں سے خواب واقف ہے اور دیکھ رہا ہے- پھر ہم نے

اپنے بندوں میں سے خاص ان کو کتاب کو وارث بنایا جنہیں ہم نے منتخب کیا۔

اس آیت میں مـن بیانیہ ہے اور کسی صورت میں تبعیضیہ نہیں بن سکتا کیونکہ اگر تبعیضیہ قرار دیا جائے تو اس کے معنے ہوں گے کہ قران کا بعض حصہ حق ہے اور بعض باطل لیکن چونکہ یہ بات نہیں ہے اس لئے یہاں مـن بیانیہ ہی لیا جا سکتا ہے اور آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ جو کچھ وحی کیا گیا ہے وہ کتاب ہے۔

نیز یہ کہ ثم اورثنا الکتب سے مزید وضاحت کی گئی ہے کہ وحی صرف کتاب ہے جس کا وارث امت مسلمہ کو قرار دیا گیا ہے۔ امت مسلمہ صرف کتاب کی وارث ہے اور وحی قرآن کریم کے علاوہ بھی ہوتی تو امت مسلمہ اس کی بھی وارث قرار پاتی - یہ آیت کریمہ ایسی برہان قاطعہ ہے کہ اس کے علاوہ کسی اور دلیل کی ضرورت نہیں رہتی۔ امت مسلمہ صرف قرآن کی وارث ہے اور اس کے اتباع کی مکلف۔

مایوحی اور قرآن ایک ہی چیز ہے

۷- واتل ما اوحی الیک من کتاب ربک لا مبدل لکلمته

(ترجمہ) اور پڑھ جو کچھ وحی کی گئی ہے طرف تیری کتاب پروردگار تیرے سے نہیں کوئی بدلنے والا باتوں اس کی کو۔ (شاہ عبدالقادر)

انما امرت ان اعبد رب هذه البلدة الذی حرمها وله کل شی وامرت ان اکون من المسلمین وان اتلوا القران (۲۷-۹۲)

ترجمہ: سوائے اس کے نہیں کہ حکم کیا گیا ہوں میں کہ عبادت کروں پروردگار اس شہر کے کو جس نے حرمت دی اس کو اور واسطے اسی کے ہے ہر چیز- اور حکم کیا گیا ہوں میں یہ کہ ہوں میں مسلمانوں سے اور یہ کہ پڑھوں میں قرآن۔

پہلی آیت میں مـا اوحـی کی تلاوت کا حکم ہے اور دوسری آیت میں قرآن کریم کی تلاوت کا حکم ہے جس سے ظاہر ہے کہ مـا اوحـی اور قرآن کریم ایک چیز ہے اور دونوں الفاظ ایک دوسرے کے متبادل استعمال کئے گئے ہیں اور مـا اوحـی صرف

قرآن ہے نیز یہ کہ پہلی آیت میں من بیانیہ ہے-تبعیضیہ کسی طرح نہیں ہوسکتا-

کتاب اور ما انزل ایک ہی چیز ہے

۸- **هذا كتاب انزلنه مبرك فاتبعوه وتقوا لعلكم ترحمون ٥**

ترجمہ: اور یہ کتاب ہے اتاری ہے ہم نے اس کو برکت ڈالی پس پیروی کرو اس کی اور پرہیزگاری کرو تاکہ رحم کئے جاؤ-

اتبعوا ما انزل اليكم من ربكم- ولا تتبعوا من دونه اولياء-

ترجمہ: پیروی کرو اس چیز کی کہ اتاری گئی ہے تمہاری طرف پروردگار تمہارے سے اور مت پیروی کرو سوائے اس کے دوستوں کی-

پہلی آیت میں کتاب کے اتباع کا حکم ہے اور دوسری آیت میں **ما انزل اليكم** کے اتباع کا حکم ہے صرف الفاظ کو ایک دوسرے کی جگہ رکھا گیا ہے جس سے ثابت ہے کہ **ما انزل** صرف کتاب ہے-

نزل على محمد قرآن ہے-

۹- **والذين امنوا وعملوا الصلحت وامنوا بما نزل على محمد وهو الحق من ربهم كفر عنهم سياتهم واصلح بالهم (۲-۴۷)**

ترجمہ: اور جو لوگ کہ ایمان لائے اور کام اچھے کئے اور ایمان لائے اس چیز کے ساتھ کہ اتاری گئی ہے محمد کے اوپر اور وہ حق ہے پروردگار ان کے سے-دور کیں ان سے برائیں ان کی اور سنوارا حال ان کا-

یہاں **نزل على محمد** کا ذکر کیا گیا ہے-دوسری آیت میں قرآن کریم ہی کو **وانه لتنزيل رب العالمين** فرمایا ہے--جس سے ظاہر ہے کہ **نزل على محمد** تنزیل یعنی قرآن کریم ہے-

معارضہ مما نزلنا کا کیا گیا ہے صرف قرآن کا نہیں-

۱۰- **وان كنتم في ريب مما نزلنا على عبدنا فاتوا بسورة من مثله-**

اس آیت میں معارضہ مما نزلنا کا کیا گیا ہے صرف قرآن کا نہیں- یہاں یہ بات بڑی غور طلب ہے کہ اگر قرآن کے علاوہ کوئی اور چیز بھی منزل من اللہ ہوتی تو اس کے مقابلہ کی تحدی بھی پیش کی جاتی اور ارشاد ہوتا کہ فاتوا بسورہ او بحدیث من مثلہ لیکن یہاں مما نزلنا (منزل من اللہ) کو صرف سورتوں پر مشتمل قرار دیا گیا ہے نیز یہ کہ اس آیت کریمہ میں منزل من اللہ کا (Criterion) محک ومیزان نکھار کے سامنے پیش کر دیا گیا ہے کہ منزل من اللہ صرف وہ ہے جس کا مثل نہ بن سکتا ہو- اب اس معیار کے مطابق صرف قرآن کریم ہی وہ کتاب ہے جس کا مثل آج تک نہیں بن سکا- ورنہ احادیث مبارکہ کا مثل تو اس قدر کثیر تعداد میں ہے کہ اس کی صحت وسقم جانچنے کے لئے مستقل ایک علم کی ضرورت درکار ہوتی ہے اور اس کے باوجود آج تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ صحیح احادیث مبارکہ کونسی ہیں اور غلط کونسی-

اختصار کے پیش نظر یہ دس دلائل قاطعہ اور براہین ساطعہ قرآن کریم سے پیش کئے گئے ہیں- تلک عشرۃ کاملہ ورنہ قرآن کریم کی دیگر آیات سے بھی اس موقف کے حق میں استدلال کیا جا سکتا ہے- اگر پہلے سے ذہن میں وحی غیر متلو کا عقیدہ ذہن میں نہ بٹھایا جائے اور خالی الذہن ہو کر قرآن کریم کا مطالعہ کیا جائے تو کسی آیت سے بھی وحی غیر متلو کا خیال تک نہیں آ سکتا-

وحی صرف قرآن میں ہونے کی عقلی دلیل-

عقلاً بھی یہ بات درست معلوم نہیں ہوتی کہ وحی قرآن کریم کے باہر بھی تھی کیونکہ اگر قرآن کریم کے باہر بھی وحی تھی تو حضور کا فرض منصبی تھا کہ وہ نہ صرف اس کی واضح طور پر نشاندہی فرماتے بلکہ اس کی حفاظت کی تلقین بھی فرماتے کیونکہ حضور کا فرض اول ہی تبلیغ وحی تھا- قرآن کریم کو محفوظ کیا گیا- اس کی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لی- اگر وحی قرآن سے باہر تھی تو اس کی حفاظت کی ذمہ داری بھی اللہ تعالیٰ پر ہوتی اور انا نحن نزلنا الذکر و انا لہ لحافظون میں ذکر کے ساتھ اس کا بھی اندراج ہوتا لیکن صورت یہ ہوئی کہ حضور کے اڑھائی سو سال بعد حدیث کی تدوین کی گئی اور مختلف آئمہ کرام نے اس کو جمع کیا- اگر حدیث وحی ہے اور وہ ان آئمہ

حدیث کی کوششوں سے جمع کی گئی ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہے کہ نصف وحی تو خدا نے محفوظ رکھی اور باقی نصف وحی ان حضرات کی کوششوں سے محفوظ رہ سکی اور اس طرح یہ حضرات شریک کار رسالت قرار پائے- یہ کسی طرح ممکن نہ تھا کہ وحی جیسی اہم چیز کو حضور دوسروں کی کوششوں پر چھوڑ جاتے پھر احادیث جمع کرنے کے جو کوائف خود کتب حدیث میں مذکور ہیں ان سے ظاہر ہے کہ امام بخاری رحمتہ اللہ علیہ نے تقریباً چھ لاکھ احادیث میں سے صرف چھ ہزار احادیث اپنی صحیح میں جمع فرمائی ہیں- اس کے معنے یہ ہیں کہ وحی کے جمع و استرداد کا حق امام صاحب موصوف نے استعمال فرمایا- معلوم نہیں امام صاحبؒ کے پاس وہ کونسا ذریعہ تھا جس کے سبب انہوں نے اتنی بڑی تعداد احادیث کی مسترد فرمادی- آج کے مذعومہ منکرین حدیث تو چند ہزار احادیث کے منکر ہیں- امام صاحب موصوف رحمتہ اللہ علیہ نے اتنی بڑی تعداد احادیث کا انکار فرمایا اور منکر حدیث کے الزام سے محفوظ رہے یہ بات وحی کی توہین و استخفاف ہے کہ اس کے قبول و استرداد کا حق کسی بھی فرد کو دیا جائے خواہ وہی کتنی ہی بڑی شخصیت کیوں نہ ہو-

وحی خارج از قرآن کا اقرار بھی اور انکار بھی-

یہ عجیب بات ہے کہ جملہ اہل اسلام کے مختلف فرقے سب کے سب موجود ذخیرہ احادیث کا اقرار بھی کرتے ہیں اور انکار بھی کرتے ہیں یہ اس لئے کہ مسلمانوں میں جتنے فرقے بھی ہیں ان میں اہل تشیع و اہل تسنن کی تو احادیث کی کتب ہی مختلف ہیں- شیعہ حضرات کی کتب اربعہ ہیں اور اہل سنت کی صحاح ستہ- اس طرح ایک طرف چھ صحاح صحیح اور چار کتب غلط ہیں اور دوسری طرف چار صحیح اور چھ غلط ہیں- اور عملاً یہ پوزیشن ہے کہ سنی شیعوں کی کتب کا انکار کرتے ہیں اور شیعہ سنیوں کی کتب کی تغلیط کرتے ہیں- اس طرح دونوں طرف اقرار بھی ہے اور انکار بھی- اسی طرح اہل حدیث حضرات فاتحہ خلف الامام' رفع یدین' رفع سبابہ' امین بالجہر کی احادیث کو درست قرار دیتے ہیں- مگر اہل تقلید حضرات ان احادیث کا انکار کرتے ہیں-

حنفی حضرات میں بھی بریلوی حضرات ایصال ثواب' سماع موتیٰ' استمداد غیر اللہ کو support کرنے والی احادیث کو درست خیال کرتے ہیں اور دیو بندی حضرات ان کو غلط شمار کرتے ہیں- غرض پورے مسلمانوں میں یہی صورت حال ہے کہ اقرار بھی ہے اور انکار بھی- وحی

الٰہی اس سطح سے بلند ہوتی ہے۔اس پر ایمان لانا لازمی ہوتا ہے۔اس پر ایمان لائے بغیر کوئی شخص مومن یا مسلمان نہیں ہوسکتا وحی الٰہی ان اعتراضات سے بلند و بالا ہوتی ہے اور اس میں ظن و شک کا شائبہ تک نہیں پایا جاسکتا کیونکہ اگر ذرا بھی تشکیک وظن کا پہلو موجود ہو تو اس پر ایمان مستحکم و مضبوط ہو ہی نہیں سکتا۔ وما لکم کیف تحکمون۔

حضور کا ہر قول وحی نہیں تھا۔

علماء کرام کی طرف سے جو دلائل وحی خارج از قرآن کے سلسلہ میں پیش کئے جاتے ہیں ان میں سرفہرست یہ اعتراض ہے کہ چونکہ نطق رسول وحی ہے اس لئے حضور کا ہر قول وحی ہے۔لہٰذا حضورؐ کی احادیث وحی ہیں۔اس نظریہ کی تائید میں آیہ کریمہ وما ینطق عن الھوی الخ ہر موقع پر پیش کی جاتی ہے چنانچہ علامہ محمد ایوب صاحب نے اپنی کتاب ''فتنہ انکار حدیث'' میں تحریر فرمایا ''بے شمار دلیلیں موجود ہیں قرآن کے علاوہ دوسری وحی پر'' ما ینطق عن الھدی ان ھو الا وحی یوحی۔ وہ اپنی خواہش سے نہیں بولتا۔اس کا نطق صرف وحی ہے۔اب اگر کوئی کہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ صرف قرآن اپنی خواہش سے نہیں بولتا تو یہ غلط ہے۔اس لئے کہ قرآن کو آیت میں محذوف ماننا پڑے گا۔اور حذف خلاف اصل ہے۔دوسرے ھو کی ضمیر کا مرجع اوپر مذکور نہیں ہے۔مطلب یہ ہے کہ نہ وہ سیدھے راستے سے رکا اور نہ ٹیڑھا چلا۔عمل کی صفائی ماضل صاحبکم وما غوی سے کردی اور قول کی صفائی ما ینطق عن الھوی سے کردی یعنی اس کا قول و فعل من جانب اللہ ہے۔اس کے علاوہ معنی آیت کے یہ ہیں کہ مطلقاً نطق ہوائی کی نفی ہے لہٰذا اس کا ہر قول غیر ہوائی اور وحی ہے۔''

عموماً یہی دلیل سرفہرست ہوتی ہے لیکن یہ اعتراض آیت مبارکہ کا صحیح مفہوم سامنے نہ ہونے کی وجہ سے ہے۔حضور کے ہر نطق کے وحی ہونے کے خلاف خود قرآن اور روایات میں دلائل موجود ہیں۔قرآن کریم میں ہے کہ ایک لڑائی میں حضور نے منافقوں کو شرکت نہ کرنے کی اجازت عنایت فرمادی تھی۔تو اسی پر یہ آیت لم اذنت لھم حتی تبین لک الذین صدقوا وتعلم الکاذبین نازل ہوئی کہ آپ نے انہیں اجازت کیوں دے دی۔یعنی اللہ تعالیٰ نے

حضور کے قول کو approve نہیں فرمایا۔ اب اگر آپ کا اجازت دینا وحی الٰہی سے تھا تو پھر اللہ تعالیٰ نے خود اجازت دلوانے کے بعد حضور کے اس قول کی تصویب کیوں نہیں فرمایا۔ اس سے ظاہر ہے کہ آپ کا اجازت دینا وحی نہیں تھا بلکہ یہ آپ کا اپنا بشری قول تھا۔

اسی طرح سورۂ مجادلہ کی پہلی آیت کریمہ کے ذیل میں تمام مفسرین نے تحریر فرمایا ہے کہ حضرت خویلہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو ان کے شوہر حضرت اوس بن صامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ظہار کر دیا۔ کچھ عرصہ بعد جب انہیں خواہش ہوئی تو ظہار کے متعلق صحیح پوزیشن حاصل کرنے کا تردد ہوا۔ اس پر حضرت خویلہ بنت ثعلب حضور کے پاس آئیں اور اصرار کیا کہ ظہار سے طلاق واقع نہیں ہوئی مگر حضور بار بار یہی فرماتے رہے کہ ظہار کرنے کی وجہ سے طلاق ہو گئی۔ چنانچہ حضرت خویلہ حضور سے اس بات پر جھگڑتی رہیں مگر حضور کہ جن کی ہر بات علماء کے نزدیک وحی تھی بار بار یہی فرماتے رہے کہ نہیں تمہیں طلاق ہوئی۔ مگر فوراً وحی میں یہ دو آیات نازل ہوئیں اور اس قرآنی وحی کے ذریعہ حضور نے اپنی غیر قرآنی وحی یا وحی خفی کو مسترد کر دیا۔ **سمع اللہ قول التی تجادلک فی زوجھا و تشتکی الی اللہ**۔ کیا یہ اللہ تعالیٰ کو زیب دیتا ہے کہ اس کی ایک وحی دوسری وحی کی تردید کر دے۔

می نہ سزد خدائے را

سورۂ تحریم کی پہلی آیت مبارکہ کے متعلق روایات میں بہت تفصیل سے کام لیا گیا ہے جس کا مکمل تحریر کرنا مشکل ہے اس کا ملخص یہ ہے کہ حضور نے اپنی ازواج مطہرات کی خوشنودی کی خاطر اپنے لئے مغافیر حرام قرار دے لئے تھے چنانچہ آیت کریمہ **یا ایھا النبی لم تحرم ما احل اللہ لک الخ** نازل ہوئی جس میں حضور کے اس فعل کو مناسب قرار نہیں دیا گیا کہ آپ نے اپنی ازواج کی خوشنودی کے لئے وہ چیز کیوں حرام قرار دے لی جو اللہ نے آپ کے لئے حلال کی تھی۔ اس طرح پہلے تو اللہ تعالیٰ نے وحی خفی کے ذریعہ حضور سے ان کی ازواج کی خوشنودی کی خاطر آپ پر شہد حرام کرا دیا پھر خود ہی وحی جلی کے ذریعہ اسی قول کو ناپسند فرما دیا۔

نیز پہلے تو واقعہ اصحاب کہف کے متعلق سوال کرنے والوں کے جواب میں حضور سے خود ہی

بذریعہ وحی خفی کہلایا کہ میں اس کا جواب کل دوں گا اور اس کے بعد ہی آیت کریمہ **ولا تقولن لشئ انی فاعل ذالک غدا**- نازل فرما کر وحی جلی سے وحی خفی کی تردید کرا دی-

اختصار کے پیش نظر میں نے یہ چار آیات کریمات مع شان نزول وتراجم مرقوم کی ہیں-- جس سے ثابت کرنا ہے کہ حضور کا ہر قول وحی نہیں ہوتا تھا- اگر آنجناب کا ہر قول وحی تھا تو حضور کے ان اقوال میں تخالف وتضاد واقع نہ ہوتا- صحیح صورت حال یہی ہے کہ وہ حضور کے بشری اقوال ہوتے تھے- آپ بشر صاحب وحی تھے- (۱۰۰-۱۸-۶'۱۸-۴۱) نیز یہ کہ آپ بشر و رسول تھے ۹۳-۱۷ یعنی آپ بشر بھی تھے اور رسول بھی تھے- اس لئے آپ کے بشری اقوال وحی نہیں تھے مثلاً آپ فرماتے کہ آج موسم بہت گرم ہے میں آج بازار نہیں جاؤں گا- یا آپ فرماتے کہ میں آج دوپہر کا وقت مسجد میں گزاروں گا وغیرہ- یہ اقوال وحی الٰہی نہیں تھے- یہ حضور کے بشری اقوال تھے اور ان کو وحی قرار دینے کے معنی یہ ہیں کہ وحی کی اہمیت' اس کی عظمت اور اس کے شرف کا صحیح اندازہ نہیں کیا گیا-

سورۂ نجم کی پہلی آیات کا صحیح مفہوم-

اس تمہید کے بعد سورۂ النجم کی آیات کا درست مفہوم پیش خدمت کیا جاتا ہے ان آیات میں ھو کی ضمیر کا مرجع محذوف نہیں ہے بلکہ مظہر ہے- ھو ضمیر کا مرجع النجم یعنی ستارۂ ہدایت قرآن کریم ہے- **والنجم اذا ھوی** (۳-۵۳) ترجمہ: شہادت ہے قرآن کریم کی جبکہ وہ نازل ہوا کہ تمہارا یہ ساتھی نہ گمراہ ہوا ہے نہ بہک گیا ہے وہ (وحی کے ضمن میں) بولتا ہے تو نہیں ہوتا وہ مگر وہی جو اس کی طرف وحی کیا جاتا ہے- پس **ان ھو الا وحی یوحی** میں **ھو** ضمیر کا مرجع النجم یعنی قرآن عزیز ہے-

وحی صرف قرآن میں ہونے پر دوسرا اعتراض-

اسی سلسلہ میں دوسرا اعتراض حضرات علماء کرام کی طرف سے اطاعت رسول کے سلسلہ میں کیا جاتا ہے جس کا ملخص یہ ہے کہ اگر وحی خارج از قرآن تسلیم نہ کی جائے اور احادیث مبارکہ جو کہ وحی خفی میں' ان کی اطاعت نہ کی جائے تو اطاعت رسول کسی طور بھی نہیں کی جا سکتی اور یہ ظاہر ہے

کہ ہ

خلاف پیمبر کسے راہ گزید
کہ ہرگز بمنزل نہ خواہد رسید

ان کے موقف کے مطابق قرآن کریم کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے اور حدیث کی اطاعت سے حضور کی اطاعت ہوتی ہے لیکن یہ بات باعث تعجب ہے کہ جب قرآن کریم وحی ہے اور حدیث شریف بھی وحی ہے اور دونوں وحی شمار کی گئی ہیں تو ایک وحی کی اطاعت خدا کی اطاعت ہے تو دوسری وحی کی اطاعت حضور کی اطاعت کیسے ہوسکتی ہے۔ وحی تو نبی کو خارج سے ملتی ہے۔ وحی یکسر وہبی ہوتی ہے۔ وحی میں رسول کے جذبات کو مطلقاً کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اگر حدیث شریف وحی ہے تو اس کی اطاعت سے حضور کی اطاعت کیسے ہو جائے گی۔ عقلاً یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اگر وحی کی تقسیم وحی خفی و وحی جلی میں کی بھی جائے جو کہ بالکل غیر قرآنی تقسیم ہے، تب بھی وحی خفی سے حضور کی اطاعت نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت رہتی ہے۔ اس لئے یہ نظریہ کہ چونکہ حضور کی اطاعت حدیث کے ذریعہ ہوتی ہے اس لئے اس کا ماننا ضروری ہے۔ بداہتاً غلط ہے۔

اطاعت رسول کا صحیح طریقہ۔

اصل یہ ہے کہ اتباع وحی ہی اطاعت رسول ہے چنانچہ آیت کریمہ **ان اولی الناس بابراھیم للذین اتبعوہ وھذا النبی والذین امنوا واللہ ولی المومنین ٥** (ترجمہ) بلاشبہ تمام لوگوں میں سے ابراہیمؑ کے سب سے زیادہ قریب وہ لوگ ہیں جو اس کی اتباع کرتے ہیں اور یہ نبی اور ان کے ساتھی مومن بھی (ابراہیم کے بہت قریب ہیں)۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مومنوں کا مددگار ہے۔

سے واضح ہے کہ حضور کو حضرت ابراہیم کا قریب ترین شخص اس لئے بتایا گیا ہے کہ آپ ملت ابراہیم کے پیروکار تھے نیز صحابہ کرام کو بھی حضرت ابراہیم کا اقرب کہا گیا ہے کیونکہ صحابہ حضور کے متبع تھے اور حضور حضرت ابراہیم کے متبع تھے۔ اس طرح وہ صحابہ بھی ابراہیم علیہ السلام کے متبع تھے۔ لیکن ظاہر ہے کہ حضور کے پاس حضرت ابراہیم کی طرف سے موصول شدہ احادیث و روایات کا کوئی ذخیرہ موجود نہیں تھا کہ آپ احادیث ابراہیم کا اتباع کر کے حضرتؑ ابراہیم کے اقرب بنے

ہوں- اس کی اصل صورت آیات نمبر ۱۰۶/۱۰۹٬۶/۱۰ سے واضح ہوتی ہے کہ چونکہ حضرت ابراہیم بھی وحی کے مطیع تھے اور حضور بھی وحی کے متبع تھے- اسی لئے حضور کا وحی کا اتباع بعینہ حضرت ابراہیم کا اتباع تھا- اسی طرح صحابہ کا اتباع قرآن حضرت ابراہیم کا اتباع تھا- نیز اسی توجیہہ سے یہ بات قابل تسلیم ہے کہ چونکہ حضور خود قرآن کریم کے متبع تھے- اس لئے قرآن کا اتباع کرنے سے ہی حضور کا صحیح اتباع ہوتا ہے-

واضح رہے کہ **مایوحی** اور **ما انزل** کا اتباع ہی انبیاء کا اتباع ہے اور جملہ انبیاء کی طرف **ما یوحی** اور **ما انزل** صرف کتاب ہی ہے جیسا کہ آیت کریمہ **فبعث الله النبین مبشرین و منذرین و انزل معهم الکتب** کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کو مبعوث فرمایا اور ان سب کے ساتھ اپنی کتاب نازل فرمائی کیونکہ جملہ انبیاء کرام کی وحی اور کتب کی تعلیم ایک ہی تھی اور ان میں کوئی اختلاف نہیں تھا- اس لئے جملہ انبیاء کرام ایک ہی تعلیم کے متبع تھے- پس ثابت ہوا کہ قرآن کریم کا اتباع ہی حضرت ابراہیم سمیت جملہ انبیاء کا اتباع ہے- اسی کی اتباع ملت ابراہیم یعنی ضابطہ ابراہیم کی اتباع ہے- اسی (قرآن) کی اتباع اسوہ ابراہیمی ۶۰/۴ کی اتباع ہے اور اسی کا اتباع اسوہ محمدی کا اتباع ہے ۳۳/۲۱٬ جس کے لئے حدیث یا وحی خفی کی ضرورت نہیں ہے- اللہ ورسول کی اطاعت سے دو الگ الگ مطاعوں کی اطاعت تصور کرنا درست نہیں ہے- یعنی اللہ کا حکم الگ اور رسول کا حکم الگ- حالانکہ دو حاکم اور دو حکم ماننا قرآن کریم کی محکم آیات کے خلاف ہے- **ان الحکم الا الله** ۶/۵۷٬ **ولا یشرک فی حکمه احدا** ۱۸/۲۶ ان آیات کے مطابق **اطیعو الله و اطیعوا الرسول** کا یہ ترجمہ "اللہ کی اطاعت کرو اور اس کے رسول کی اطاعت کرو" مطلقاً غلط ہے بلکہ اس میں واؤ کے معنی بذریعہ ہیں جیسے کہ

برآءة من الله و رسوله الی الذین عاهدتم من المشرکین ○
فسیحوا فی الارض اربعة اشهر و اعلموا انکم غیر معجزی الله و ان
الله مخزی الکفرین ○

ترجمہ: بیزاری ہے اللہ کی بذریعے اپنے رسول کے ان لوگوں سے جن کے ساتھ تم

نے مشرکوں سے عہد کیا تھا- (اور اعلان و فیصلہ ہے اللہ کا اپنے رسول کے ذریعہ کہ
اے مشرکوں) تم زمین پر چار مہینے حرمت والے چل پھر لو- اور جان لو یہ کہ تم اللہ کو
عاجز کرنے والے نہیں ہو- اور بے شک اللہ کافروں کو رسوا کرنے والا ہے-

ان آیات میں مشرکوں کو اللہ اور رسول کی طرف سے الگ الگ مہلتیں نہیں دی گئیں بلکہ چار ماہ کی ایک مہلت ہے جو اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے رسول کے ذریعہ دی تھی-

اسی طرح واذان من اللـه و رسولـه الخ میں "وٗ" بذریعہ کے معنی میں آئی ہے- (ترجمہ) اعلان ہے اللہ کا اپنے رسول کے ذریعہ حج اکبر کے دن کہ بیشک اللہ تعالیٰ اپنے رسول کے ذریعے مشرکوں سے بیزاری کا اعلان کرتا ہے-"

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے مشرکوں سے بیزاری کا اعلان اپنے رسول کے ذریعہ کرایا ہے جیسا کہ ظاہر ہے یہ اللہ اور رسول کے دو اعلان نہیں تھے بلکہ ایک ہی اعلان تھا- جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کے ذریعے کرایا تھا کہ اللہ مشرکوں سے بیزار ہے-

نیز ما وعدنا الله و رسوله الا غرورا- ۳۳/۱۲ (ترجمہ) نہیں وعدہ کیا تھا ہم سے اللہ نے بذریعے اپنے رسول کے مگر فریب دینے کو) میں بھی واؤ بمعنی بذریعے آیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول کے ذریعہ ہی وعدہ فرماتا ہے خود آکر نہ کوئی وعدہ لیتا ہے اور نہ کوئی وعدہ دیتا ہے-

اللہ اور رسول سے مراد مرکز ملت ہے-

اصل یہ ہے کہ اللہ اور رسول کی اطاعت دو مطاعوں کی اطاعت نہیں ہے اس لئے کہ جیسا کہ تمین مندرجہ بالا آیات سے ظاہر ہے- یہ تصور قرآن کریم کی تعلیم کے منافی ہے کہ اطاعت اللہ کے سوا اور کسی کی بھی ہے حتیٰ کہ خود رسول کے متعلق بھی بتا دیا گیا ہے کہ اسے بھی حق حاصل نہیں کہ لوگوں سے اپنی اطاعت کرائے- لہٰذا اللہ اور رسول سے مراد وہ مرکز دین (central authority) ہے جہاں قرآنی احکام نافذ ہوں اور جہاں اللہ کی اطاعت رسول کے ذریعے کی جا سکتی ہے- یہ حقیقت کہ اللہ اور رسول سے مراد مرکز ملت ہے- قرآن کریم میں اس قدر واضح کی گئی ہے جس سے انکار کی گنجائش نہیں رہتی-

(۱) یا ایها الذین امنوا اطیعوا اللہ و رسولہ ولا تولوا عنہ وانتم تسمعون ○ (۸/۲۰)

ترجمہ: اے مومنو، تم اللہ اور رسول کی اطاعت کرو اور اس سے روگردانی مت کرو درآنحالیکہ تم سن رہے ہو۔

یہاں اللہ اور رسول دو کا ذکر ہے اور **عنہ** کی ضمیر واحد ہے۔ اسی طرح سورۂ انفال میں دوسری جگہ ہے۔

(۲) یا ایها الذین امنوا استجیبوا للہ وللرسول اذا دعاکم لما یحییکم ○ (۸/۲۴)

ترجمہ: اے جماعت مومنین، تم اللہ اور رسول کی دعوت کا جواب دو۔ جب وہ تمہیں اس بات کی طرف بلائے جو تمہیں (موت سے نکال کر) زندگی عطا کر دے۔

یہاں بھی اللہ اور رسول کا ذکر ہے اور صیغہ **(دعاکم)** واحد ہے۔ اسی طرح سورۂ نور میں ہے۔

(۳) واذا دعوا الی اللہ و رسولہ لیحکم بینہم اذا فریق منہم معرضون وان یکن لہ الحق یاتوا الیہ مذعنین (۲۴/۴۸)

ترجمہ: اور جب ان لوگوں کو اللہ اور رسول کی طرف بلایا جاتا ہے تاکہ وہ ان کے متنازعہ فیہ امور میں فیصلہ کرے تو ان میں کا ایک فریق اس سے گریز کرتا ہے اور اگر ان کا کوئی حق کسی پر واجب ہو (جس سے وہ سمجھ لیں کہ فیصلہ ان کے حق میں جائے گا) وہ اس کی طرف سر جھکائے ہوئے چلے آتے ہیں۔

یہاں بھی اللہ اور رسول کی طرف بلائے جانے کا ذکر ہے لیکن بعد میں **لیحکم** میں صیغہ واحد ہے اور **الیہ** میں ضمیر واحد کی ہے۔

(۴) یسئلونک عن الانفال۔ قل الانفال للہ و للرسول (۸/۱)

ترجمہ: تجھ سے مال غنیمت کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ ان سے کہہ دو کہ مال

غنیمت اللہ اور رسول کا ہے۔

اس آیت سے ذرا آگے چل کر ہے۔

(۵) و اعلموا انما غنمتم من شیء فان للہ خمسہ و للرسول۔ ۸/۴۱

(ترجمہ) اور جان رکھو کہ جو کچھ تمہیں مال غنیمت سے ملے اس کا پانچواں حصہ "اللہ اور رسول" کا ہے۔

(۶) کتب اللہ لا غلبن و رسلی ۵۸/۲۱

(ترجمہ) ضرور ہے کہ میں اور میرے رسل غالب رہیں گے۔

ان تمام مقامات نیز ۳۳/۵ میں "اللہ اور رسول" سے مراد امام امیر یا مرکز ملت ہے۔ یہ مفہوم نیا نہیں ہے۔ بلکہ شروع سے ہی ایسا سمجھا جاتا رہا ہے اور اب بھی ایسا سمجھا جاتا ہے۔ اس پر ہمارے دور کی دو تفسیریں، ترجمان القرآن مولانا ابوالکلام آزاد (مرحومؒ) کی اور تفہیم القرآن، مودودی صاحب (مرحومؒ) کی شاہد ہیں۔

ثابت کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اللہ اور رسول کے الفاظ ایک قرآنی اصطلاح کے طور پر آئے ہیں، اور اس سے مراد اس نظام کی مرکزی اتھارٹی ہے جو نظام حضور نے خود قائم فرمایا ہے اور اس نظام کی اطاعت اللہ اور رسول کی اطاعت ہے۔ رسول کی اطاعت کوئی الگ اطاعت نہیں ہے جس کے لیے حدیث شریف یا وحی خفی کا موجود ہونا ضروری قرار دیا جائے۔

لفظ حکمت کا صحیح مفہوم:

جب اور کوئی سہارا ہمارے علماء عظام کو اپنے موقف کی تائید میں نہیں ملا تو وہ اپنی تائید میں حکمت کے لفظ سے سہارا لینے کی کوشش کرتے ہیں کہ حکمت سے مراد حدیث اور وحی خفی ہے۔ لیکن قرآنی آیات سے اس بات کی کوئی سند نہیں ملتی۔ حکمت یقیناً منزل من اللہ ہے مگر یہ بھی قرآن کریم کے اندر ہی محفوظ ہے۔ ہر قانون کی غایت۔ اس کی لم اس کا (Rationale) اس کی حکمت اور اس کی (Why of it) ہے۔ مثلاً ان تنصر اللہ ینصر کم و یثبت اقدا کم۔

(اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدموں کو جما دے گا) میں اللہ کی مدد کرنے کی حکمت یہ بیان فرمائی ہے کہ اگر تم نے اللہ کی مدد کی تو اللہ تمہاری مدد کرے گا- اللہ کی مدد کرنے کی حکمت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری مدد فرمائے گا اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ ہمارے قدموں کو جما دے گا)

ان الصلوۃ تنھی عن الفحشاء و المنکر- میں صلوۃ کی حکمت یہ بیان فرمائی گئی ہے کہ صلوۃ فحش اور منکر سے باز رکھتی ہے- روزوں کی حکمت لتکبر اللہ علی ما ھداکم (تاکہ تم قانون خداوندی کو غالب کر دو- اس عوض میں کہ اللہ نے تمہاری ہدایت فرمائی) بیان ہوئی ہے کہ روزوں کی حکمت یہ ہے کہ قانون خداوندی کو غالب کیا جائے- آیت کریمہ اما یاتینکم منی ھدی فمن تبع ھدی فلا خوف علیھم ولا ھم یحزنون ٥ میں ہدایت خداوندی نازل فرمانے کی حکمت یہ بیان فرمائی ہے کہ اگر وحی الہی کا اتباع کیا جائے تو معاشرہ میں کسی قسم کا خوف وحزن باقی نہیں رہے گا- اتباع وحی کی حکمت یہ ہے کہ معاشرہ سے خوف وحزن جاتا رہے- کتاب وحکمت دونوں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بذریعہ وحی ملے ہیں اور قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں:

انزل اللہ علیک الکتاب و الحکمۃ- (۴/۱۱۳)

''خدا نے تیری طرف کتاب وحکمت کو نازل کیا''-

وما انزل علیکم من الکتب و الحکمۃ یعظکم بہ- ۲/۲۳۱)

''اور جو کچھ اتارا ہے اوپر تمہارے کتاب سے اور حکمت سے نصیحت کرتا ہے تم کو ساتھ اس کے''-

کتاب وحکمت کے لیے صرف ایک ضمیر بہ کی استعمال کر کے واضح کر دیا کہ کتاب وحکمت ایک ہی چیز ہے- سورۂ احزاب میں ۳۴/۳۳- واضح فرمایا کہ حکمت بھی تلاوت ہوتی ہے- اس لئے حکمت وحی غیر متلو ہو ہی نہیں سکتی اور نہ ہی قرآن سے باہر ہو سکتی ہے-

جزئیات کے تعین کا طریقہ:

اب آخری اعتراض جس کا جواب دینا نہایت ضروری ہے یہ ہے کہ جزئیات کا تعین خصوصاً نماز کے ارکان کا تعین کس طرح کیا جائے۔ یہ بات واضح ہے کہ قرآن کریم نے احکام وقوانین بیان فرمائے ہیں اور حضور نے ان کی جزئیات اپنی فراست فراواں اور فطانت بے پایاں سے خود مقرر فرمائی ہیں مثلاً قرآن نے مسافر پر روزہ قصر قرار دیا ہے لیکن مسافر کو Define نہیں کیا حضور نے ۴۸ میل کی مسافت طے کرنے والے کو مسافر قرار دیا ہے۔ قرآن نے چور کی سزا قطع ید مقرر فرمائی ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر کوئی صرف ایک سوئی چوری کرے تو وہ چور نہیں ہے نہ ہی اس کا قطع ید ہوگا۔ حضور نے مختلف اشیاء کے نرخ کے مطابق اس کا تعین فرمایا ہے۔ زکوٰۃ کا حکم قرآن نے دیا ہے مگر اس کی کوئی تفصیل بیان نہیں کی حضور نے اس کا مکمل نصاب اپنے عہد کے مطابق مقرر فرمایا۔ حج کا حکم قرآن نے دیا۔ حضور نے اس کی جزئیات، سعی بین الصفا والمروہ طواف وغیرہ مقرر فرمائیں۔ اسی طرح قرآن نے صلوٰۃ کا حکم دیا۔ اس کے مختلف ارکان **واسجدو اقترب، وارکعوا مع الراکین، قوموا اللہ قانتین۔ والذین یبیتون لربهم سجداو قیاما** کی طرف اشارہ فرمایا۔ حضور نے اصولی قانون اور اس کے ارکان کی طرف اشارات کو پیش نظر رکھ کے اپنی فراست وذہانت، فہم وذکاء سے نماز کی جزئیات مقرر فرمائیں۔ یہی نماز حضور کے دور سے اب تک امت میں بالاستقلال چلی آرہی ہے۔ جس پر ساری امت عمل پیرا اور کاربند ہے۔

مختصر یہ کہ ہدایت خداوندی وحی کے ذریعہ ہی ملتی ہے، یہی وہ ہدایت ہے جس کے تابع زندگی بسر کرکے، دنیا میں وہ معاشرہ قائم ہوتا ہے جس میں نوع انسانی سکون واطمینان سے زندگی بسر کر سکے۔ وحی وہ قانون ہے جس کے مطابق انسانوں کو زندگی بسر کرنی چاہیے۔ یہ ضابطہ یا قانون، عقل انسانی کا پیدا کردہ نہیں۔ بلکہ انسانی عقل سے ماورئی ہے۔ وحی عقل انسانی کے ساتھ بعینہ وہ درجہ رکھتی ہے جو درجہ سورج کا آنکھ کے ساتھ ہے۔ اگر انسانی آنکھ موجود ہو لیکن سورج کی روشنی نہیں ہے تو آنکھ کسی چیز کو نہیں دیکھ سکتی۔ اسی طرح فکر انسانی وحی کی رہنمائی کی محتاج ہے اور وحی صرف اور صرف قرآن کریم میں محفوظ ہے۔ خارج از قرآن وحی کا تصور باطل ہے۔ قرآن کریم نوع انسانی

کی ہدایت کے لیے واضح، روشن قندیل ہے جس سے متمسک رہ کے انسانی مصائب ومسائل کا حل تلاش کیا جا سکتا ہے۔قرآن کریم، جنم جنم کا ساتھی ہےاور ہر مشکل کا حل۔قرآن کریم ہی وہ مشکل کشا ہے جس کے ذریعہ تمام آلام ومصائب کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔یہ خود نور، ضیاء، واضح، مبین ہے اور دوسروں کو منور کرنے والا ہے۔نوع انسان کی بدقسمتی تھی جس دن غیر وحی کو وحی کا درجہ دے کر قرآن کریم کے برابر قرار دیا گیا اور اس طرح سے ہر نظریہ کو Justify کرنے کا چور دروازہ کھولا گیا۔

وهـــــنــــا تـــم مـــنـــا الـــكــــلام

عــلـــى مــصــطــفـــنـــا الــوف ســـلام